نام کتاب : اماوَس میں خواب
ناول نگار : حسین الحق
مطبع : جواہر آفسیٹ پرنٹرس، دہلی
سرورق : اظہار احمد ندیم
ناشر : عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی

Amawas Main Khwab
by **Husain-ul-Haque**
Edition: 2017 Rs: 350/-

ملنے کے پتے
- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اُردو بازار، جامع مسجد، دہلی۔6
- کتب خانہ انجمن ترقی، جامع مسجد، دہلی 011-23276526
- راعی بک ڈپو، 734، اولڈ کٹرہ، الہ آباد۔ 09889742811
- ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ
- بک امپوریم، اُردو بازار، سبزی باغ، پٹنہ۔4
- کتاب دار، ممبئی۔ 022-23411854
- ہدیٰ بک ڈسٹری بیوٹرس، حیدر آباد
- مرزا ورلڈ بک، اورنگ آباد۔
- عثمانیہ بک ڈپو، کولکاتہ
- قاسمی کتب خانہ، جموں توی، کشمیر
- ''اشاش''، سرسیّد کالونی، نیو کریم گنج، گیا۔9934066720

arshia publications
A-170, Ground Floor-3, Surya Apartment, Dilshad Colony, Delhi - 110095 (INDIA)
Mob: +91 9971775969, +919899706640 Email: arshiapublicationspvt@gmail.com

Composed by : **FARHA & IRAM, Jama Masjid, Delhi**

مادرِ وطن
ہندوستان
کے نام

مٹّی کی محبت میں ہم آشفتہ سروں نے
وہ قرض اُتارے ہیں کہ واجب بھی نہیں تھے

نہ ہارا ہے عشق اور نہ دنیا تھکی ہے
دیا جل رہا ہے، ہوا چل رہی ہے

1

اسمٰعیل کو نیند نہیں آ رہی تھی، اکتا کر وہ بستر سے اٹھ گیا۔

گھڑی دیکھی، رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔

ہر مہینے میں کوئی رات ایسی آتی تھی جب نیند اُچٹ جاتی، یہ معمول کے خلاف ہوتا تھا مگر ہوتا تھا۔ اور جب ایسا ہوتا تو اور دنوں سے زیادہ بے خیالی طاری ہو جاتی، ایک زمانہ تھا جب اسمٰعیل خوب سوتا تھا اور خوب خواب دیکھتا تھا۔ درجنوں خواب ایسے تھے جن کو اگر وہ لکھ پاتا تو پورے کا پورا فسانہ بن سکتا تھا۔ کچھ خواب ڈراؤنے کچھ بہت خوب صورت، کچھ رومانی کچھ جنسی، کبھی خوابوں میں ہنسا کبھی رویا، کبھی ڈرا کبھی غصہ کیا، سارے خواب گویا سمندر کی مثال تھے جو کبھی پرسکون رہتا ہے کبھی جوار جھیلتا ہے کبھی بھاٹا سے گزرتا ہے، کبھی کسی خطّے میں بہت شانت، کسی شریف بوڑھے کی طرح مدھم مزاج، آہستہ رو، پرسکون مگر اندر اندر بہت خطرناک ہلچل، خواب سمندر ہے یا سمندر خواب پتہ نہیں مگر یہ ساری اُتھل پُتھل خوابوں کے درمیان ہوتی ہے، جاگتا ہوا آدمی تو ایک مداری ہے، چہرے پر جھوٹا ماسک لگائے، ایسا نظر آنے کی کوشش میں مصروف جیسا وہ دراصل نہیں ہے، قصور کس کا ہے؟ خواب کا یا بیداری کا؟ فیصلہ شاید اتنا آسان نہیں ہے، اور یہ فیصلہ خواب دیکھنے والا نہیں کرتا، یہ ڈگڈگی تو بے خواب آدمی کے ہاتھ میں ہے۔

خواب میں ایسا کیوں نہیں ہو پاتا؟ وہ کون ہے جو خواب میں مصروف دکھائی دیتا ہے؟ کیا وہاں بھی وہی ہے جو خواب دیکھ رہا ہے؟ سنا ہے خواب میں خواب دیکھنے والا نہیں ہوتا، اس کے باپ دادے ہوتے ہیں، اُس کے پُرکھے ہوتے ہیں۔ ایک بڑا خوب صورت تصوّر یہ ہے کہ ہم اگر کسی دوسرے کو خواب میں دیکھتے ہیں، تو دراصل وہی ہمارے خواب میں چلا آتا ہے۔

اسمٰعیل کے من میں ایک گمان نے سر اُٹھایا: تو کیا میں نے اپنی آدھی ادھوری چاہتوں اور شکستہ تعلقات سے متعلق جتنے خواب دیکھے، اُن میں وہی سارے لوگ سچ مچ میرے خواب میں

چلے آئے تھے؟ جو مجھے مناتے تھے، میرے ماتھے پہ ہاتھ رکھتے تھے، میرے پریشان بالوں کو سنوارتے تھے، وہ میں نہیں تھا وہی تھے؟ اگر وہ تھے تو پھر جب میرا اُن کا سامنا ہوا تو وہ ویسے کیوں نظر نہیں آئے؟ جیسے خواب میں نظر آتے تھے، اچھا اگر وہ نہیں تھے، میں ہی تھا تو خواب میں میری جون کیوں بدل گئی؟ کیا خواب میں آدمی کی کینچلی اتر جاتی ہے؟ کیا خواب میں ایک دھڑ پر دوسرا چہرا لگ جاتا ہے؟ ایسا تو بیداری میں ہوتا ہے' آدمی مختلف لوگوں کے سامنے مختلف چہرہ لے کر جاتا ہے، مگر یہ تو آدمی کا مکر ہے، وہ سوانگ بھرتا ہے، اور یہ آدمی کی اپنی کمائی ہے، اختیاری عمل، خواب میں تو کچھ بھی اختیاری نہیں ہوتا، وہ کون ہے جس کا خواب پر اختیار چلتا ہے؟

اماں کہتی تھیں، برا خواب دیکھو تو لاحول ولاقوۃ پڑھ لیا کرو اچھا خواب دیکھو تو الحمدللہ، سبحان اللہ کہا کرو۔ میں نے پوچھا تھا، کیوں اماں؟ ہر مرتبہ الحمدللہ کیوں نہ کہا جائے؟ تو کہنے لگیں: ''برا خواب شیطان کی بدمعاشی ہوتا ہے بیٹا، اچھا خواب اللہ کا فضل ہوتا ہے۔'' اُس وقت تو ان کی بات مان لی تھی مگر بعد میں ہنسی آئی کہ اماں نے تو ایک اور جھنجھٹ میں ڈال دیا، جاگتے میں تو آدمی یا شیطان کی بدمعاشی والی بات سمجھ میں آتی تھی مگر خواب میں تو سارے کا سارا غیر اختیاری سلسلہ ہے، تو وہاں بھی خدا کی حکومت میں کوئی اور سا جھا کرنے آجاتا ہے؛ یعنی خواب میں خدا اور شیطان ...آدمی کہیں نہیں؟ یہ تو بہت اُداس کر دینے والی بات ہے۔ اماں کی بات بعد میں جی کو لگی نہیں، بار بار بس یہی گمان ہوتا کہ وہ جو کچھ اُداس چہرے، جھکی جھکی پلکیں، کوئی لب میری جانب جھکتا ہوا، پھر ایک جھٹکے سے دور جاتا ہوا، ہمت بڑھاتی دوست آوازیں، جھنکار پیدا کرتے ہوئے قہقہے، مونا لیزا کی طرح کسی کا حزن آمیز تبسم ... یہ سارا کچھ خدا اور شیطان کی توجہ سے الگ کا کچھ معاملہ تھا، جو زندگی بھر سمجھ میں تو نہ آسکا مگر اُسی آس میں نیند بھی آجاتی تھی اور اُسی کے سہارے دن کا پہاڑ بھی کٹ جاتا تھا۔

ہر دن اسمٰعیل اپنے آپ کو، اپنے ہمزاد کو اپنا خواب سناتا، کبھی خوش ہوتا، کبھی رو لیتا۔ پھر اچھے دِنوں کی آس پہ نکل پڑتا، چلو آج کا پہاڑ بھی کاٹ لیا جائے۔ اُس کے پاس کوئی تیشہ نہیں تھا، وہ کہیں کا فرہاد نہیں تھا، مگر اُس کے پاس خواب تھا، کچھ خواب نیند کے تھے کچھ بیداری کے۔ وہ اور اُس کا ہمزاد دونوں مدتوں ایک دھوکے میں رہے کہ دونوں ایک دوسرے کا خواب سا جھا کرتے ہیں، مگر بہت دنوں بعد یہ سمجھ میں آیا کہ کوئی کسی دوسرے کا خواب کیا کسی کی بیداری بھی سا جھا نہیں

کر پاتا۔ دراصل ہر حال میں آدمی حالتِ خواب ہی سے گزرتا ہے، جہاں خواب کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

اسمٰعیل کے لیے تعبیر دھند میں کھویا ہوا نظارہ تھی اور جہاں تعبیر کا مسکن تھا وہ جگہ صرف کہر آلود ہی نہیں تھی، نقطۂ انجماد پر پہنچا ہوا ایک ایسا مقام جہاں اسکیمو کی جون میں جائے بغیر پہنچنا ناممکن تھا۔ پس اسمٰعیل نے بس ایک ہنر جانا تھا کہ کسی طرح دن کا پہاڑ کاٹ کر خود کو رات کے حوالے کر دیا جائے۔

رات آہستہ سے اُسے تھپکی دیتی، یوں کہ سارا آپا سراپا رِم جھم بارش میں شرابور سا ہو جاتا، مشامِ جاں معطر ہو جاتے، شاید نشے یا سرور کی کیفیت، اُن دنوں ایسا لگتا جیسے وہ سرّیت بھری کسی موہوم صورتِ حال سے دوچار ہے۔ ہواؤں میں کچھ مدھم سی سمفنی گونجتی۔ کہیں کسی عدم آباد میں **''نہیں''** کی بہت طویل گونج، بہت دیر تک، شاید صدیوں اور قرنوں تک جاری رہتی...پھر وہ نہیں بیچ سے پھٹ جاتا... بگ بینگ... ''نہیں...نہ ہیں بن جاتا...پھر یہ سمفنی واضح آہنگ بنتی...نہ ہیں ...نہ ہیں...نہ ہیں...پھر اس آہنگ کی تکرار ''نہ ہیں'' کو ہیں نا.... ہیں نا... ہیں نا....میں بدل دیتی۔ پھر وہ آہستہ سے کہتیں.... ہیں.... ہیں!

ایک دودھیا رنگ کا جھرنا بہتا، دل کے اندر اُترتا کوئی بے لفظ سُر، پیار کرتا ہوا نظر نہیں آنے والا، کوئی ہاتھ...کوئی آغوش جو کبھی میسّر نہیں ہوئی، گلاب کی پنکھڑی جیسے ہونٹوں سے پھوٹتا ہوا کوئی نغمہ جو کبھی سنائی نہیں دیا...اُن کا ہونا جو کبھی محسوس نہیں ہوا...وہ کہتیں... ہیں...ہم ہیں...اور اُن کی آواز مجھ تک کبھی نہیں پہنچی۔

اِسی دید و نادید کے درمیان تمکنت مر گئی۔

اس نے کہا تھا: جسم کا اُوٹ ہٹاؤ۔

ہم تو نہ ہٹا سکے، اُس نے وہ اوٹ ہٹا دیا...اور اب مرے پاس نہ روح نہ جسم، نہ حاضر نہ غائب، میں؟ میں بھی ہوں یا نہیں پتہ نہیں۔ اسمٰعیل نے سوچا، میں کیا ہوں؟ شاید بھکاری، خواب کا بھی اور بیداری کا بھی، پھر ایک اَٹ پٹا پن سا پورے عرصے پر پھیل جاتا، میں سمجھ نہیں پاتا میں کیا کروں؟ پہلے وہ اگر خواب میں آتیں بھی تو بہت دور سے، بس ایک جھلک سی دکھائی دیتی جیسے کوئی ہوا گزر جائے، یا فرشتہ کہ پل میں محسوس اور نامحسوس دونوں کا استعارہ بنے یا کوئی چھلاوہ، وہ

میری طرف دیکھتیں بھی نہیں، لگتا کہ جان بوجھ کر میرے سامنے سے ہوا کے جھونکے کی طرح گزری ہیں کہ میں جان لوں کہ اُنہیں مجھے نہیں دیکھنا!

یہ سلسلہ برسہا برس چلا، یاد نہیں کتنے برس۔ من پر اُداسی کی پرت گہری سے گہری ہوتی گئی، بس ایک وہم خوش ہونے کا سبب تھا، یہ سب کچھ مجھ کو دکھانے کے لیے ہی تو ہے، دیکھو میں تمھاری پرواہ نہیں کرتی، پھر خیال کی دوسری لہر پہلی لہر کو کاٹتی، یہ تمھاری خوش خیالی ہے، تمھارے آپے سراپے کو، اندر باہر کو اس کا پورا یقین ہے کہ وہ تمھاری پرواہ نہیں کرتیں، یہی تم خواب میں بھی دیکھتے ہو مگر عالمِ بیداری میں تم خود سے مکر کرتے ہو، ان کی بے تعلقی کو زبردستی تعلق کا رنگ دیتے ہو۔

اسمٰعیل اپنے آپ سے نبرد آزما ہو جاتا، ایک دھواں دھار جنگ ہوتی، ایک اتھاہ چٹیل، جلتا سلگتا تپتا بھنتا بے آب و گیاہ... اور اپنے چاروں طرف وہی وہ... طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئینہ، پہلے دوبدو کی جنگ، پھر یلغار، ایک دھواں دار جنگ، کشتوں کے پشتے لگتے ہوئے، سر دھڑ سے الگ ہوتے ہوئے، درجنوں اسمٰعیلوں نے درجنوں اسمٰعیلوں کو مارا، اطمینان ہوا کہ قصہ ختم ہوا، مر گیا، سب مر گئے، مگر یہ کیا؟ کسی طرف سے سسکی سنائی دی، دیکھا ایک اسمٰعیل سر نیہوڑائے رو رہا تھا، پھر کراہنے کی آواز سنائی دی، دوسرا اسمٰعیل زخمی پڑا تڑپ رہا تھا، ہزاروں ہزار میل کی دوری سے ایک نحیف سی، بہت مدھم مگر چھٹپٹاتی آواز کا گمان ہوا، کان لگایا... العطش العطش کی آواز آ رہی تھی۔

پھر ایک زوردار قہقہہ... ہاہاہا... میں زندہ ہوں!

یہ اُس زمانے کی بات ہے جب ٹوبا ٹیک سنگھ مرا تھا۔

کچھ انسانوں کو یہ حق دے دیا گیا کہ وہ اپنے سے سو گنا زیادہ انسانوں، دو سو گنا زیادہ معصوم بے زبان جانوروں کا اور چار سو گنا زیادہ ہواؤں کا، پانیوں کا اور خوشبوؤں کا فیصلہ کریں۔

بہت زور کی اُتھل پتھل ہوئی، ماحولیات بگاڑ دیئے گا، اوزون پرت کے ساتھ افراط تفریط کیجیے گا تو کہیں سردی زیادہ ہوگی، کہیں گرمی، ندیوں کا راستہ روکیے گا تو قحط پڑے گا یا سیلاب آئے گا، جنگل کاٹیے گا، مٹی کٹے گی، زمین دھنسے گی، بنجر ہوگی، جب یہ سب کچھ ہوگا تو زلزلہ بھی آئے گا اور طوفان بھی۔

ٹوبا ٹیک سنگھ مرا تو یہ سب کچھ ہوا اور یہ بھی ہوا کہ دونوں طرف ایک جتھے والا دندناتا پھرا اور ایک جتھے والے منھ چھپاتے پھرے کہ اُن پر ٹوبا ٹیک سنگھ کی موت کا الزام لگایا گیا تھا۔

اور دوسرے جتھے والے دندناتے پھر رہے تھے کہ زمین پر قبضہ کرنے اور اپنا رعب و اثر جمانے کا بہترین موقع ہاتھ آیا تھا۔ ایسا دنیا کے ہر خطّے میں ہوا اور ہوتا ہے، یہ انسان کے مکر، بزدلی اور کوتاہ بینی کی کہانی ہے جو وقفے وقفے سے ہر زمانے میں اور ہر علاقے میں دہرائی جاتی رہی ہے۔ یہاں بھی وہی ہوا، اور اب کمزور جتھے کی صرف ایک ضرورت تھی کہ مضبوط جتھے والے اُس کی طرف توجہ دیں۔

یہی وہ زمانہ تھا جب اسمٰعیل کو یہ شک گزرا کہ وہ انسان ہیں یا چھلاوہ؟ ایک گمان سا یہ بھی گزرا کہ شاید وہ یہی چاہتی ہیں کہ میں اپنے طور پر جینے کا ڈھب سیکھ لوں۔

یا وہ چاہتی ہیں کہ جیون اسی طرح بسر جائے کہ میں دیکھوں اور وہ نہ دیکھیں؟

جب کوئی اس بات کا منتظر ہو کہ دوسرا دیکھے اور وہ نہ دیکھے تو اس میں تعلق کا کوئی رمز چھپا ہے یا بے تعلّقی کا؟

جو مرا وہ کون تھا؟ متعلق یا غیر متعلق؟

وہ جو العطش العطش پکار رہا تھا وہ کون تھا؟ مرنے والا؟ یا بچنے والا؟

کیا کوئی مر کر بھی زندہ رہتا ہے؟

خیال کی ایک لہر دوسری لہر کو کاٹتی رہی۔

اور اس پر برسہا برس بیت گئے۔

اور پھر مدتوں بعد ایک شب کچھ انہونی سی بات ہو گئی، اسمٰعیل نے اُسی ''بے تعلّق تعلّق'' کی اُمید لیے خود کو شب کے حوالے کیا تو اس رات نے پورے وجود میں زلزلے کی کیفیت پیدا کر دی۔

وقت کی خبر نہیں، وہ بے خبری کے رہوار پر سوار، ''نا شدہ آباد'' کی برجیوں اور کنگروں سے پہنائے لامتناہی کے اننت وِشال ہین ساگر سمان اکیلے سیاہ عرصے کو یوں دیکھتا تھا کہ اس کا دیکھنا ایک مفروضہ تھا اور نظر آنا واہمہ... مگر نہیں، وہ وہم نہیں تھا، وہم کی طرح تھا... وہ آ رہی تھیں... وہ آئیں، بالکل اچانک... پل کے ہزارویں حصے میں... وہ آئیں... آئیں اور چلی گئیں۔

یہ بات اہم نہیں ہے... یہ تو ہر بار ہوتا تھا۔

اہم بات یہ ہے کہ اُن کے گزر جانے کے بعد اسمٰعیل کو یہ احساس ہوا کہ انھوں نے کن انکھیوں سے اُسے دیکھا تھا۔ وہ ایک... اچانک پَو پھٹنے کی کیفیت تھی۔

ایک مدھم سائسر (شاید...)

یہ وہی زمانہ تھا جب بیشتر سیاسی چہرے راتوں رات مسلم لیگی سے کانگریسی ہو گئے، مولانا کا منھ دیکھ کر پنڈت اور مہاتما چپ رہے مگر سردار کا گروپ اب بھی بدظن تھا۔ گھروں میں رہ جانے والوں کی ہر ممکن کوشش تھی کہ مہاتما اور پنڈت اُن کی طرف متوجہ ہو جائیں۔ مہاتما تو ۴۸ء میں قتل ہی کر دیے گئے، مگر پنڈت بھی جوش جیسے دوستوں اور نیاز جیسے دانشوروں کی وجہ سے بار بار رانگ باکس میں پڑ جاتے تھے۔ وہ متوجہ ہونا چاہتے تھے، مگر رہ جانے والوں کی توقعات کے مطابق متوجہ نہیں ہو پا رہے تھے۔

ویسے وہ لوگ بھی اب اسمٰعیل کو کن انکھیوں سے دیکھنے لگے تھے، جو اسمٰعیل پر کبھی توجہ دینے کی ضرورت نہیں محسوس کرتے تھے۔ وہ بچہ جو سلیٹ اور کاپی لے کر مدرسے جاتا تھا، وہ بہت پیچھے چھوٹ گیا تھا، اب وہ بچہ اپنے بڑوں کو جھک جھک کر بہ آوازِ بلند آداب کیا کرتا تھا۔ اُن بڑوں میں، کچھ نظر انداز کر کے گزر جاتے، کچھ ہلکے سے مسکرا کر دیکھتے ہوئے آگے بڑھ جاتے... بس چند لوگوں کی آواز سنائی دیتی... ''جیتے رہو، خوش رہو'' وہ بچہ اندر اندر بہت بے چین ہوتا رہتا تھا۔

چیزیں، بہت حیران کن طور پر، اس کے اندر اور باہر، چاروں طرف بدلاؤ کی ڈھلان پر اُترتی نظر آتیں، بارشوں کا پانی، ڈھلان کی طرف جاتا، ہوائیں اوپر سے نیچے آتیں، پھول درخت سے ٹوٹ کر زمین پر گرتا، کسی نے بتایا تھا، سائنس کی کوئی تھیوری ہے جو بتاتی ہے کہ زمین سب کو کھینچتی ہے، تو اس کے جی میں ایک بات آئی تھی کہ وہ جن میں اُس کا جی اٹکا رہتا ہے، وہ بھی زمین ہیں کیا؟ پھر اُس نے یہ بھی سوچا کہ اتنے سارے لوگ جو اپنا اپنا وطن چھوڑ کر دوسری جگہ چلے گئے، انہیں کیا زمین نے نہیں کھینچا؟ کیا کسی چیز میں زمین سے بھی زیادہ کشش ہے؟

وہ زمانہ سوالات کا تھا، سوال سر اُٹھاتا تھا اور جواب نہیں ملتا تھا۔

''ہے ماتا! میرے من کو شانتی دے!''

یہ رُکمنی کی آواز تھی، جو اُس نے ایک دن مدرسہ جاتے ہوئے، ایک مندر سے آتی سنی، اور سوچا، 'یہ کیوں بے چین ہے؟'

رُکنی کی بے چینی اُس کے اندر طرح طرح کے سوال کھڑا کرتی۔

رُکنی کا بال وِواہ ہوا تھا، اور وہ شادی کے چار پانچ برسوں کے بعد ہی بیوہ ہو گئی تھی، اسمٰعیل

اُس وقت مدرسہ میں نویں دسویں درجے کا طالب علم تھا۔ عمر چودہ پندرہ برس رہی ہوگی، مگر مونچھیں نکلنے لگی تھیں۔ اور جوڑ جوڑ میں کھنچاوٹ بھی محسوس ہونے لگی تھی۔ رُکمنی بھی لگ بھگ سولہ سترہ برس کی رہی ہوگی، یعنی ۴۷ء کے بعد جنم لینے والی پیڑھی اب سر اُٹھا کر کائنات کو اگر سمجھنے کے قابل نہیں تو دیکھنے کے لائق تو ضرور ہو گئی تھی۔ یعنی سوچا جا سکتا ہے کہ یہ زمانہ ۶۴-۶۳ء کا رہا ہوگا۔ اُسی زمانے کے آگے پیچھے چین سے جنگ بھی ہوئی تھی اور کلکتہ جمشید پور وغیرہ میں فساد بھی ہوا تھا۔ چین سے جنگ کی دھندلی دھندلی یادیں اُس کے ذہن میں کہیں نہ کہیں محفوظ تھیں۔ ابا، بڑے ابا اور محلے کے کئی لوگ محلے کے ایک بہت بڑے گھر کے بالکل اندر والے کمرے میں، بہت دھیمی آواز سے ریڈیو پاکستان سنتے تھے اور آکاش وانی کو ''جھوٹ وانی'' کہتے تھے، پتہ نہیں چین سے شکست کا اثر تھا یا ملک کے کئی شہروں میں ہونے والے فسادات کا نتیجہ، صبحیں بھی شاموں کی طرح دُھند اور دھوئیں میں کھوتی ہوئی محسوس ہوتیں اور ہمیں ہمارے بزرگ رستوں میں چلتے ایسے محسوس ہوتے جیسے سائے یا ہیولے حرکت کر رہے ہوں... بعد میں ایک اصطلاح یاد آئی تھی... لاشوں کا خرام!

اُنہی دنوں ایک رات... پتہ نہیں بلیک آؤٹ ہوا تھا یا نہیں، پتہ نہیں سائرن بجا تھا یا نہیں مگر اُس نے ایک انتہائی سیاہ رات کا سامنا کیا، چاند کی دسویں یا گیارہویں رات رہی ہوگی، لیکن اُس نے کمرے کی کوٹھری کھول کر دیکھا تو ایسی چپ لگی جیسے اُس نے کوہِ قاف کے پار دیکھ لیا ہو، ایسی حیرت ہوئی جیسے منصور خدا کے مقابل آ گئے ہوں، ایسی دہشت طاری ہوئی جیسے کوئی مسافر راہ بھول کر گھنے بھیانک جنگل کے بیچوں بیچ آن کھڑا ہوا ہو، یا اُس کے سامنے اچانک اپنے درجنوں دانت نکوسے کوئی ڈائنا سور آگے بڑھتا چلا آ رہا ہو...

چاندنی رات کا ایسا بھیانک چہرہ؟

گرمی کی راتوں میں ایسی چپ؟

وہ پتہ نہیں سویا تھا یا جاگ رہا تھا، دیکھ رہا تھا یا محسوس کر رہا تھا، بستر پر لیٹا تھا یا کسی جلتے تپتے بے پناہ صحرا میں سائے یا پانی کی تلاش میں بھٹک رہا تھا۔ وہ زندہ تھا یا مر چکا تھا، خود وہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا، سانسیں رُکتی محسوس ہو رہی تھیں اور وہ گھٹن سے بچنے کے لیے خوب زور زور سے سانس لے رہا تھا اور سامنے تانڈو نرت کی تمثیل یا برہما کی تری مورتی تخلیق کے مراحل میں مگن، یا عیسیٰ

صلیب پر ایلی ایلی لما شبقتنی پکارتے ہوئے یا شنکر سمندر منتھن میں مصروف، زہر نکالتے ہوئے یا پیتے ہوئے، یا کوئی باغ تھا ہرا بھرا جس میں کوئل کوکتی تھی، یا ندی کا کنارہ تھا، جہاں کونجوں کی ڈار سفید پروں والے فرشتوں کا احساس کراتی تھی یا ہرے بھرے درختوں میں گھرا کوئی احاطہ تھا جہاں رنگ برنگے پرندوں کی قطاریں اُڑتی تھیں اور لوبڑدس چونچ سے چونچ لڑاتے تھے، یا کوئی بے خطر خطہ تھا، جہاں کبوتروں کی ٹولی اُترتی تھی، یا پھر ایک ایسی سرنگ تھی جس سے باہر نکلنے کا راستہ نہیں تھا، کوئی کنواں جس میں پانی جھل جھل کرتا مگر کنویں کے اوپر پیاسا چھٹپٹاتا تھا اور ڈول کہیں نہیں تھا۔ وہ نظر آئی تھیں، انھوں نے کن انکھیوں سے مجھے دیکھا تھا۔ ایسا اُسے محسوس ہوا تھا، مگر پھر جی میں اِک وہم نے سر اُٹھایا، یہ وہم بھی ہوسکتا ہے، پھر جیسے اندر ہی اندر کسی نے بات کاٹی... نہیں تو اُس پل کا بھوگی ہے... اُنھوں نے تجھے دیکھا ہے... اُسے یاد آیا... ہاں اُنھوں نے کن انکھیوں سے دیکھا تھا... بگ بینگ... ہیں نا... ہیں نا!

الیکشن سے پہلے سب کہتے... ہیں نا... ہم ہیں نا... پھر الیکشن گزر جاتا... پھر وہی نہیں... نہیں... نہیں کی گردان... پھر ۶۷ء میں اُردو کے مسئلے پر رانچی رائٹ، ایک بہت عزیز بہن فسادات میں اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ ماری گئی، بہت دنوں تک اُس کے بارے میں طرح طرح کی افواہ گشت کرتی رہی، کچھ لوگ کہتے ماری گئی، کچھ کہتے فسادی اُس کو اُٹھا کر لے گئے، آج بھی سوچتا ہوں تو کپکپی طاری ہوجاتی ہے، اُس کی ماں دُعا کرتی ''یا اللہ! وہ ماردی گئی ہو، اور اگر ابھی تک مری نہ ہو تو مولا اب اُس کو موت دے دے!'' اور اُس کے باپ اور بھائی اس کے سسرال والوں سے یہ مقدمہ لڑتے تھے کہ پہلے شوہر مارا گیا پھر بچے مارے گئے اور تب بہن ماری گئی۔ اس لیے شرع کے مطابق باپ کا حصہ بچوں کو پہنچا اور بچوں کا حصہ اُس کی ماں کو پہنچا اور مرنے والی کو اُس کے شوہر کا حصہ بھی پہنچا، لہٰذا شرع کے مطابق مرحومہ کے حصے کے مالک اُس کے باپ اور بھائی ہوئے کیوں کہ جب بہن مری تو صرف اُس کے باپ اور بھائی ہی زندہ تھے، سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ مری ہو یا اُس کو اغوا کیا گیا ہو، اُس کے بھائی اور باپ اتنے ظالم کیسے ہوگئے؟ اور سمجھ میں یہ بھی نہیں آتا کہ اُنہوں نے مجھے خواب میں دیکھا یا بنا دیکھے گزر گئیں۔ غلام سرور سے عبدالجلیل تک بڑی دھواں دھار تقریریں ہوتی تھیں کہ ہم ہندوستان میں بائی چانس نہیں، بائی چوائس ہیں۔ بہن کے بھائی اور باپ ثابت کرتے تھے کہ مرنے والی بائی چانس نہیں بائی چوائس مری۔ سب اپنا ہونا

ثابت کرنے پر تُل گئے تھے۔ میں ہمزاد کی بات ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ اسمٰعیل نے سوچا، اُسے یقین تھا اُنھوں نے دیکھا ضرور ہے! مگر اُن کا یہ دیکھنا بائی چانس تھا یا بائی چوائس؟

اسمٰعیل کسی فیصلے تک پہنچنے کی پوزیشن میں نہیں تھا اور رُکمنی اب بھی مندر جاتی، ماتھا ٹیکتی اور روتی، اور وہ خواب میں اُن کا انتظار کرتا اور بیداری میں اُن کے قریب جانے کی ہمت نہیں کر پاتا اور کالج سے گھر کے راستے میں رُکمنی نظر آتی اور کالج میں تمکنت دھمکی دیتی کہ میں جان دے دوں گی۔ پھر ایک دن ذرا مختلف سا معاملہ ہوگیا، وہ مندر کے پاس سے گزر رہا تھا تو رُکمنی مندر کے دروازے پر کھڑی نظر آئی، وہ انجان بنا آگے بڑھتا چلا گیا، مگر یہ احساس ضرور ہوا کہ وہ مندر کے دروازے پر کھڑی ہے اور مجھے دیکھ رہی ہے۔ اُسے خواب میں بھی محسوس ہوا تھا کہ وہ اُسے کن انکھیوں سے دیکھ رہی ہیں۔ رانچی رائٹ کے بعد عام سماجی زندگی میں کچھ سگبگاہٹ ہونے لگی تھی، سارے لوہیا وادی منظرنامے کا نئے سرے سے جائزہ لے رہے تھے۔ جرمنی کا معاملہ تو یہ رہا کہ سوشلزم فاشزم تک جا پہنچی مگر یہاں سوشلسٹوں نے جمہوریت کا دامن کبھی نہیں چھوڑا اور جس زمانے کی بات ہے، اُس زمانے میں کانگریس کے مقابلے پر اپنا نام بدل کر جن سنگھ کے نام سے میدان میں اُترنے والی جماعت کے لیے قابل قبول تھی۔ اب پتہ نہیں، یہ سوشلزم کا کون سا ماڈل تھا، حالاں کہ ابتدائی دِنوں میں خود جن سنگھ والے مخمصے کا شکار تھے، نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن۔ اسمٰعیل سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ رُکمنی مندر کے دروازے پر کیوں کھڑی تھی؟ مسلمان بھی سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ کانگریسی اور غیر کانگریسی دونوں میں سے ترجیح کے قابل کون تھا، کانگریس جیسی بھی تھی ۴۷ء کے بعد مسلمان اُسی کے سہارے ہندوستان میں ٹکے رہے، رُکمنی اُس کی بیداری کا منظرنامہ تھی مگر وہ تو اُس کے ناسٹلجیا کا حصہ تھیں، جب ہوش سنبھالا تو اُنہی کے بارے میں سوچا، خواب اور بیداری دونوں پر تو اُنہی کا قبضہ تھا، مگر اَب اعصاب اپنے قابو میں نہیں رہ پا رہے تھے، مسلمان بہت بے تھاہ ہو رہے تھے، سرسنڈ، کلکتہ، مراد آباد، جمشید پور، جہاں تہاں بار بار فساد ہو رہا تھا، تبلیغی جماعت والے بہت متحرک ہوگئے تھے، ہندوؤں کے یہاں خوب بھجن کیرتین ہو رہا تھا، اُسی زمانے میں کسی نے بتایا تھا کہ امریکہ سعودی عرب کے ذریعہ کمیونسٹوں کو توڑنے کے لیے خوب مذہبی لٹریچر بٹوا رہا ہے، ادھر روس سے بھی طرح طرح کی اُلٹ پلٹ خبریں آرہی تھیں، مولویوں سے سوشلسٹوں تک سب ہی کہتے تھے کہ اب روس بھی فاشسٹ ہوگیا ہے۔ اسٹالن سے خروشچیف تک سب کا کچا چٹھا کھل رہا

تھا، کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا، کیا ہو رہا ہے، وہ خفا ہے تو پھر خفا ہی لگے، منی منی سا بھلا کیوں لگے ہے مجھے۔ کالج میں تمکنت، خواب میں وہ، راستے میں رُکمنی، اسمٰعیل کو کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا جیسے اُس کا سر پھٹ جائے گا، رُکمنی کے حوالے سے وہ جب بھی سوچتا تو اشتعال، خوف اور کسی نہ کسی قسم کے فاصلے کا احساس، تینوں اُس پر حملہ کر بیٹھتے، اُسے بتایا گیا تھا کہ مسجد میں ہندو نہیں جا سکتا، کیوں کہ وہ ناپاک ہوتا ہے اور وہ ناپاک اس لیے ہے کہ کلمہ گو نہیں ہے اور چوں کہ کلمہ گو نہیں ہے اس لیے جہنم میں جائے گی، جنت میں تو صرف مسلمان جائیں گے۔ ہندو نجس ہیں، پیشاب کر کے پانی بھی نہیں لیتے، اس خیال کے ساتھ ہی رُکمنی یاد آتی، کچھ عجب سا لگتا، سچی بات یہ ہے کہ اچھا نہیں لگتا، پھر رانچی رائٹ میں ماری گئی بہن یاد آجاتی جس کے بارے میں آج تک فیصلہ نہیں ہو سکا کہ وہ ماری گئی یا اغوا کر لی گئی۔ اگر اغوا ہوا ہوگا تو؟

اس سوال پر پھر رُکمنی یاد آتی، وہ خود بخود خیال کی اُس لہر کے ساتھ اشتعال کی ڈھلان پر بہہ نکلتا، تب ایسے میں اُس کا اُداس چہرہ اور مورتی کے آگے اُس کا گریہ بھی یاد آجاتا، اور اسمٰعیل کا سارا اشتعال انفعال میں بدل جاتا، جذبات سرد پڑ جاتے اور اُس کے لیے وہ پھر شہر کی ایک بیٹی بن جاتی، جس کا بال وِواہ ہوا تھا، اور جو شادی کے چار پانچ سال بعد بیوہ ہوئی تھی۔

راتوں کی تنہائیوں میں، جب پورے جسم پر کھنچاوٹ طاری ہوتی اور ناڑیوں میں سیّال بہتا تو رُکنی کا اندازہ ہوتا۔ ایسے لمحات میں وہ کبھی یاد نہیں آتی تھیں۔

اسمٰعیل کے کانوں تک ارسطو، افلاطون کا نام پہنچ چکا تھا۔ افلاطونی محبت کا نام بھی سن لیا تھا، کسی سینئر نے اس کی تفصیل بھی بتائی تھی، یہ سوچ کر اچھا لگا تھا کہ وہ اُن سے پاک محبت کرتا ہے، مگر رُکمنی کے بارے میں سوچتا تو اُس کی گاڑی اٹک جاتی، وہ سمجھ ہی نہیں پاتا کہ یہ بی بی اُسے بار بار کیوں یاد آجاتی ہے۔ محلّہ بھی ایک نہیں تھا، وہ پڑوس کے محلے میں رہتی تھی، اُس زمانے میں شریف ہندو عورتیں بھی رکشے کے آگے پردے جیسا ڈال لیتی تھیں، کھلے بندوں گھومنے کا رواج نہیں تھا۔ رکمنی بھی گھر میں دھیر دھیرنے والی ایک اَبلا تھی، جو مندر جاتے ہوئے یا پرب تیوہار کے موقع پر مدھم انداز میں چلتی نظر آتی، اُس کی نظریں زیادہ تر جھکی رہتیں اور اُس کا چہرہ مسلمان عورتوں کی طرح چھپا تو نہیں رہتا مگر اُس کا آنچل ماتھے سے آگے گرا ضرور رہتا۔ اتنی احتیاط سے جینے والی ایک بیوہ ہندو عورت کے بارے میں وہ کیا سوچ سکتا تھا۔ بس ہوا کی لہر کی طرح ایک خیال آتا اور

کسی سمت نکل جاتا، وقت بھی کہاں ملتا تھا، وہ بی۔اے۔ میں آچکا تھا۔ محنت بہت کرنی پڑتی تھی، اس کی انگریزی اور اکنومکس دونوں کمزور تھے، ٹیوشن کی ضرورت تھی، انگلش کے سنہا سر اور اکنومکس کے رام جی بابو نے اُسے شام کے وقت گھر آنے کو کہا، وہ روز چھ بجے نکلتا اور گھر آتے آتے ساڑھے آٹھ نو بج جاتے۔ ایسی ہی ایک رات، ایک گلی سے گزرتے ہوئے اچانک احساس ہوا کہ وہ آگے نہیں بڑھ سکتا، گلی پتلی تھی، لگا کہ راستہ بند ہے، سامنے کوئی کھڑا تھا، ڈوبتے چاند کی رات، کچھ دھندلا سا پیکر... کون ہے؟ اُس نے ڈر کر سوچا، بھوت؟ پری؟ پچھل پیری؟ بچپن میں سنی کہانیاں یاد آگئیں۔ نانی اماں بتاتی تھیں کہ اندھیری راتوں میں پچھل پیریاں گلیوں میں منڈلاتی ہیں، اُن کو ایسے نہیں پہچانا جا سکتا، غور سے دیکھوگے تو اُن کی ایڑی مڑی نظر آئے گی۔ اسمٰعیل نے سامنے والے پر نگاہ کی، واقعی کوئی عورت ہی تھی، جلدی سے ڈر کر پیر کی طرف دیکھا، اندھیرے میں کچھ نظر نہ آیا، بس آواز سنائی دی۔

اس سمئے کہاں سے آرہے ہو؟

اس نے چونک کر آواز کی طرف دیکھا... رُکمنی تھی!

''ٹیوشن پڑھ کے'' اُس نے ہانپتے ہوئے جواب دیا۔

''کیا دوڑ کے آرہے ہو؟''

''نہیں تو۔''

''پھر ہانپ کیوں رہے ہو؟''

''میں کیوں ہانپوں گا؟'' وہ ذرا تن کر کھڑا ہو گیا۔

''روز دیکھتے ہو، بات کیوں نہیں کرتے؟''

''تم ہندو ہو!''

''تو؟''

''تم نرک میں جاؤ گی۔''

''نرک میں تو، میں ہوں ہی، اب اس سے بڑا نرک کیا ہوگا؟''

یکایک ایک جوالا مکھی کا دہانہ کھل گیا۔ اسمٰعیل کے چاروں جانب ایک دھو دھو کرتی آگ، آگ کے شعلے آسمان سے باتیں کر رہے تھے، اُس کے اردگرد چتا کی ساری سامگری بکھری تھی، وہ

ہزاروں من جلتی لکڑیوں کے بیچوں بیچ، وہ ابراہیم نہیں تھا، اُس کی آگ بجھانے کوئی نہیں آیا۔

''نرک سے باہر کیوں نہیں آ جاتیں؟'' اسمٰعیل کا ہاتھ رکمنی کے کاندھے پر تھا۔

''جنگل کی بھیانک رات میں یوراج ایک ہی مرتبہ آتے ہیں۔'' وہ ایک قدم اسمٰعیل کی طرف آگے بڑھ گئی۔ وہ نرکل کے درخت کی طرح کانپ رہی تھی۔

''یوراج کا انتظار مت کرو۔'' اس نے رکمنی کو ہلکے سے اپنی طرف کھینچا۔

''میرے لیے تو آدمی کا بھی اکال ہے۔'' اُس کی پھنسی پھنسی آواز سنائی دی۔ دونوں کی سانسیں ایک دوسرے میں گتھی ہوئی تھیں۔

''نہیں یہ نرادھار بات ہے، میں ہوں۔''

اچانک گلی کے ابتدائی یا آخری سرے پر کچھ آدمیوں کے بات کرتے ہوئے گلی میں داخل ہونے کا اندازہ ہوا، اور دونوں بجلی کی سی تیزی کے ساتھ مخالف سمتوں میں چل پڑے۔

رانچی کے فرقہ وارانہ فسادات میں مرنے والی یا اغوا کی جانے والی بہن یاد آ گئی۔ اور وہ بھی یاد آئیں، جو اُسے کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے تیزی سے کسی سمت آگے بڑھ گئی تھیں، غائب ہو گئی تھیں۔

[تمکنت... تمکنت! کشمکش کے ایسے ہر لمحے میں، کیا تم عقب میں رہا کرتی ہو؟]

پھر مدتیں بیت گئیں، نہ وہ خواب میں آئیں، نہ رکمنی رستہ چلتے کہیں نظر آئی۔ اسمٰعیل ہفتوں بولایا اور بوکھلایا سا رہا، اُس بوکھلاہٹ میں کہیں نہ کہیں سرشاری بھی شامل تھی، پہلی مرتبہ عورت کا لمس حاصل ہوا تھا، اُس کے اندر کہیں پچھتاوے کی کوئی لہر سر نہیں اُٹھا پائی تھی، زندگی کا پہلا لمس، کسی کو اُس کی ضرورت ہے، اسمٰعیل اپنے آپ کو اہم اور بامعنی سمجھنے لگا تھا، سرخوشی کے اس عالم میں کئی دن بیت گئے، تو اُسے یاد آیا کہ راستوں میں رُکمنی کہیں نظر نہیں آئی۔ پتہ نہیں وہ اَگیات واس میں چلی گئی یا پشچاتاپ کی اَگنی میں جلتی تھی، راج نرائن نے اِندرا گاندھی کو ہرا دیا تھا، ہاہا کار مچی ہوئی تھی... اُن کی شادی ہو گئی تھی، بی. اے. کا امتحان قریب آنے لگا تھا۔ کلاس میں بیس لڑکے اور آٹھ لڑکیاں، مشرقی پاکستان میں بنگالی زیادہ تھے اور بہاری کم، لڑکیاں اپنے آپ کو تیس مار خاں کیوں سمجھتی ہیں؟ بہاری سارے کے سارے گئے تو یو. پی. اور بہار سے، اسمٰعیل کو یاد آیا، لاکھوں لاکھ کی آبادی والے بھیونڈی سے سو مسلمان بھی بنگلہ دیش نہیں گئے تھے۔ بہاری مشرقی پاکستان

میں ہر جگہ یوں رہے، جیسے زمین تو اُنہی کے دم سے ٹھہری ہوئی ہے۔ اُس زمانے میں لڑکیاں خود ہی لڑکوں سے ایک قسم کا فاصلہ بنائے رکھتی تھیں، سارے بہاریوں نے مقامی بنگالیوں سے اپنے آپ کو کنارے رکھا، اسپین میں بھی عرب مقامی آبادی سے میل جول پیدا نہیں کر پائے۔ وہ بچپن سے سنتا آیا تھا، عورت ناقص العقل ہے، جہنم میں سب سے پہلے عورت جائے گی، ہر فساد کی جڑ میں زر، زمین اور زن میں سے کوئی ایک ضرور شامل رہتا ہے۔ عورت کو دیکھنا غلط ہے، غیر محرم کے ساتھ تنہائی میں بیٹھنا حرام ہے، دوستوں کا متفقہ احساس تھا کہ چرایا ہوا امرود خریدے ہوئے امرود سے زیادہ مزیدار ہوتا ہے۔ اساتذہ اخلاقیات اور اسلامیات کا درس لگاتار دیتے رہے اور اسمٰعیل اور تمکنت بی بی کے درمیانی فاصلے کم ہوتے گئے۔ کہا جاتا ہے کہ اگر ہندوستان بیچ میں نہیں پڑتا تو اودھ کے بعد مشرقی پاکستان اردو تہذیب کا دوسرا بے مثال مرکز بن جاتا۔ استعمار کی ریشہ دوانیاں بہر حال رنگ لائیں، تمکنت کا بھائی مہاجنی نظام کا پروردہ تھا، جس زمانے میں اندرا گاندھی نے مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش بنایا، اُسی زمانے میں تمکنت کے بھائی نے اس کی مرضی کا غضب کیا۔ تمکنت کے والد کا انتقال ہو چکا تھا، بھائی فوج میں آفیسر تھا، بنگلہ دیش اور تمکنت دونوں کا فیصلہ ایک انداز میں ہوا۔ بنگلہ دیش میں جو بھی مجیب الرحمٰن کی مخالفت میں بولا وہ مارا گیا۔ تمکنت اسمٰعیل سے بھی کہتی تھی۔ ہمت کرو جسم کا اوٹ ہٹاؤ، اُس نے فلم 'نیل کمل' دیکھ لی تھی اور اُس کے مرکزی کردار میں خود ڈھلنا چاہ رہی تھی۔ اسمٰعیل اس کو بڑی مشکل سے ہاسٹل لایا، اُس کی گہری دوست انیما سارنگی کے حوالے کیا اور تاکید کی، اس کو تنہا نہ چھوڑنا، یہ ابھی ایک ٹرانس میں ہے۔ کچھ بھی کر سکتی ہے۔ جب وہ لوٹ رہا تھا تو اس نے پلٹ کر دیکھا، وہ اپنے کمرے کی کھڑکی سے اُسے دیکھ رہی تھی، اس کی آنکھوں میں سمندروں کی خطرناک گہرائیاں اور وجود کے اندر کے بھنور اور گھاٹیاں جھل جھل جھلکتی تھیں۔ پھر خبر ملی اس کے بھائی نے زبردستی اُس کا بیاہ کر دیا۔ پھر کئی سالوں بعد خبر ملی، وہ تمکنت... مر گئی۔ مشرقی پاکستان بھی مر گیا تھا، اِندرا گاندھی ماتا دُرگا بن گئی تھیں، اس کا بھائی فوج میں ترقی پا کر کرنل ہو گیا تھا۔ پاکستان والے مرحوم مشرقی پاکستان کو اَب بھی نہیں بھلا پاتے، میں تمکنت کو بھلانے کی کوشش کرتا ہوں مگر زخم رِستا رہتا ہے۔ تمکنت کی موت کے کئی برسوں بعد اُس کے بھائی سے ملاقات ہوئی، تو اس کا انداز جھینپا جھینپا تھا، اس نے تمکنت کے حوالے سے کوئی بات نہیں کی۔ کانگریس والے بنگلہ دیش کے تذکرے سے جھینپتے اور سنگھ گھرانے والے اس

تذکرے سے کتراتے، ماتا دُرگا کو گالی کیسے بک پائیں گے؟

اُنہی دنوں وہ ایک رات پھر اسمٰعیل کے پاس آئی تھیں۔

مگر اُس رات سے پہلے، جب بنگلہ دیش بنا تھا، اسمٰعیل پر بہت بوریت طاری تھی، مرحوم مشرقی پاکستان سے لگاتار ہلاکتوں کی خبریں آرہی تھیں، بھیونڈی اور بمبئی وغیرہ سے جو لوگ اُدھر گئے تھے، مرنا ان کو بھی پڑا، مشرقی پاکستان کے آخری دنوں میں ہر ہندوستانی مسلمان بہاری ہو گیا تھا۔ اُن مرنے والوں کے جو رشتہ دار کالج میں پڑھتے تھے، وہ افسوس کا شکار ہوتے اور کالج کے اساتذہ اور صدرِ شعبہ اُن سے تعزیت کرتے اور اُن کی دل جوئی کرتے، اسمٰعیل کے دل پر آرے چلتے۔ اس کے دادیہال، نانیہال میں سے کوئی بھی نہ بہاری نہ مہاجر۔ کسی عزیز کی موت اسمٰعیل کی ایسی تمنا بن گئی جس کے پوری ہونے کا دور دور تک کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ تمکنت بیاہی جا چکی تھی، صدر شعبہ تو بڑی چیز تھے اساتذہ میں سے بھی کوئی اُس کی دل جوئی کاہے کو کرتا۔ جنرل نیازی کے ہتھیار ڈالنے کی خبر آئی، یہ وہی زمانہ تھا جب تمکنت نے اپنے جاہ و منصب پسند بھائی کے آگے سپر ڈال دی: ''جہاں چاہیے شادی کر دیجیے!''

وہ دن اُس کے لیے بڑے مشکل دن تھے، ٹیوشن ختم ہو گئے تھے، گھر والے اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ مزید پیسے دے سکیں۔ مہینے کا خرچ چلانا مشکل ہو رہا تھا۔ تمکنت کی شادی میں وہ کیسے جاتا، تمکنت کا گھر دوسرے شہر میں تھا۔ دوست گئے، وہ نہ گیا۔ ٹکٹ کا پیسہ کہاں سے لاتا، ہندوستانی مسلمان اپنے ماں جایوں کی موت کی خبر لگاتار سن رہے تھے اور بنگلہ دیش جا بھی نہیں سکتے تھے۔ پنڈت نہرو کی بیٹی مسلمانوں کے سلسلے میں لاتعلق (In diferrent) ہو گئی تھی۔ دن یوں گزرتے تھے جیسے کسی کوڑھی کی پیٹھ کا زخم، کڑاکے کی ٹھنڈ بھری دوپہر، یخ بستہ چہرے، ایسے سُتے ہوئے جیسے فالج مار گیا ہو۔ کوئی ملنے والا کسی سے کسی کا حال نہیں پوچھتا، پتہ نہیں کیا غم پڑا ہو، زخم کے ٹانکے نہ کھل جائیں، سورج کسی پتھر کا ٹکڑا لگتا، ہوا چلتی تو حبس ہوتا، رُک جاتی تو لگتا طوفان آرہا ہے۔ درو دیار کسی سیل بے آب میں بہتے محسوس ہوتے، صاف نظر آتا کہ چہرے صاف نظر نہیں آرہے ہیں، دوکانوں میں اشیا بھری پڑی تھیں اور دوکانیں خالی تھیں، اور ڈھنڈھار گھروں سے خون بہتا تھا۔ شہروں شہروں ایسی پٹس پڑی تھی کہ کان پڑی آوازیں سنائی نہیں دیتیں اور مسلم محلوں میں سناٹا براجتا تھا۔ اسی بیچ مارچ گزر گیا اور پہلی اپریل کو کچھ دوستوں نے اپریل فول بھی منایا۔

ایسی ہی گندہ اور بیہودہ صبحوں اور شاموں کے درمیان ایک رات!

اسمٰعیل نے سوچا، وہ یہ دعویٰ تو نہیں کر سکتا کہ وہ سو رہا تھا کیوں کہ عام طور پر سونے کے تین مراحل ہوتے ہیں: اونگھ، ہلکی نیند، گہری نیند۔ مگر کسی نے بھی اس کیفیت کو کوئی نام نہیں دیا، جس میں آدمی اونگھ کے پہلے کے مراحل سے گزرتا ہے۔ یہ دراصل خبر اور بے خبری کے جھٹپٹے کے ٹرانس میں آنے سے پہلے کا مگر دراصل اُس کا ابتدائی مرحلہ یا پل ہے۔ اس میں آدمی سمجھتا ہے کہ وہ جاگ رہا ہے مگر دراصل وہ نیند کی ڈھلان پر جانے کا ارادہ کرنے والا شخص ہوتا ہے اور لوگ سمجھتے ہیں کہ آنکھیں بند ہیں، یہ سو رہا ہے، حالاں کہ بیداری سے یارانہ ٹوٹے، وہ اس کوشش میں محو اور مصروف رہتا ہے۔

کبھی بیداری سے یارانہ بنائے رکھنے کی کوشش کامیاب ہو جاتی ہے۔ کبھی خبر اور بے خبری کا جھٹپٹا اپنے ٹرانس میں لے لیتا ہے۔

تو اُس رات ایسا ہی ایک پَل اس کے مقابل آن کھڑا ہوا۔

اُس رات اُسے کچھ وہم سا بھی ہو رہا تھا، اُسے لگ رہا تھا کچھ ہونے والا ہے۔ بہار سے طرح طرح کی خبریں آرہی تھیں، چھاترسنگھ میں کوئی لالو پرشاد یادو نام کا نیتا کافی اودھم مچا رہا تھا، ایک مجاہد آزادی جے پرکاش سے بھی کچھ لوگ مل رہے تھے۔ چاروں طرف موجودہ حکومت سے بے اطمینانی کا اظہار کیا جا رہا تھا۔ بہار سے مہاراشٹر تک غیر کانگریسی حلقہ جے پرکاش کا نام لے لے کر لوگوں کو اپنی طرف بلا رہا تھا، مجیب الرحمٰن کے خلاف بھی ایک حلقہ تیار ہونے لگا تھا، ماتا دُرگا کو جب تک عام مہیلا نہیں بنایا جاتا، گاڑی آگے کیسے بڑھتی، ایران سے بھی بے چینی کی خبریں آرہی تھیں، پاکستان اپنے لہولہان جسم کی مرہم پٹی میں مصروف تھا، بھٹو کا بچنا مشکل ہو رہا تھا اور پاکستان کے جرنلوں کو ایک مرتبہ پھر اللہ بہت یاد آنے لگا تھا۔

رات آئی تو اسمٰعیل بستر پر چلا گیا، مگر اندر سے وہ بہت بے چین تھا، وہ سونا نہیں چاہتا تھا، مگر لگ رہا تھا کہ نیند غالب آجائے گی، وہم ہو رہا تھا، کچھ ہونے والا ہے۔

ایسی ہی اَٹ پٹی صبحوں اور شاموں کے درمیان ایک رات!

یہ رات اُس درد کا شجر ہے۔

کون سا درد؟ اور کون سی رات؟ اسمٰعیل نے سوچا، لور مڈل کلاس کا عام آدمی تو جے پرکاش نرائن

تحریک کا مارا ہوا ہے، شہروں شہر ہنگامہ احتجاج بدامنی، دوستوں نے بتایا کہ وہ جس رکشے پر چڑھے وہ جلوس کے اژدہام کے تحت جام کا شکار ہوا، جس ٹرین میں چڑھے اُسے بیچ راستے میں احتجاجیوں نے روک دیا، جس شہر کے اسٹیشن پر اُترے وہاں بھی شہر میں سناٹا براجتا تھا۔ دوکانیں بند تھیں، لڑکے امتحان گاہ تک پہنچنا چاہتے تھے مگر کچھ لوگ تھے جو سرکار اور سرکاری مشینری کا چکہ جام کرنا چاہتے تھے، بائیں بازو والوں نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ یہ فاشسٹ مزاج لوگوں کا اجتماع ہے، زیادہ لڑکے ایک گھنٹے اور ڈیڑھ گھنٹے کی تاخیر سے امتحان گاہ پہنچے اور وقتِ معینہ کے ایک ڈیڑھ گھنٹہ بعد تک امتحان دیتے رہے اور کھل کے جوابات کی چوری کرتی رہے، مہامایا نے جب طالب علموں کو جگر کا ٹکڑا کہا، وہ زمانہ ۶۸ء یا ۶۹ء کا تھا۔ اب ۷۴ء آ گیا۔ سارے غیر کانگریسی اور لوہیاوادی کانگریس کی مخالفت میں سارے سماجی امن و قانون کو درہم برہم کرنے کے درپے تھے۔ سماجی مزاج سے کھلواڑ کا جو سلسلہ شروع ہوا، وہ منڈل سے کمنڈل تک پہنچا۔

ایک لمبی طویل رات کا سلسلہ۔ اسمٰعیل نے سوچا۔ ملا کیا؟ بدلے ہوئے چہرے؟ آنے والے دنوں میں سنگھ گھرانے کا غلبہ... جے پرکاش غیر کانگریسی تھے یا...؟

اسمٰعیل زبردستی اپنے آپ کو اس کے آگے سوچنے سے روک دیتا۔ ایسی ہر رات میں اُمیدیں بندھتیں اور ٹوٹتی ہیں، خواب دکھائی دیتے ہیں، پھر ذہن سے محو ہو جاتے ہیں۔ مگر اس ہزار اُتھل پتھل کے باوجود اُس کا اندرون خوابوں کے ایک طویل سلسلے سے کیسے جڑا رہا، اُسے نہیں معلوم تھا اُسے بار بار بس یہ احساس ہوتا کہ وہ بھکاری ہے، خواب کا بھی اور بیداری کا بھی۔ سارے کا سارا ہندوستان جاگتے سوتے اُس کے آپے سراپے میں چوکڑیاں بھرتا، کچوکے لگاتا، غرّاتا، نوچتا، بھنبھوڑتا، پھر کبھی پاس آتا، اس کے آنسو پونچھتا، اس کی مرہم پٹّی کرتا، اسے پیار کرتا اور رگ و ریشے میں اپنے تمام ذائقوں کے ساتھ اُترتا چلا جاتا اور دماغ میں ایک ہاہا کار سی مچی رہتی اور ڈھیر ساری اَٹ پٹی صبحوں اور شاموں کے بیچ کوئی نہ کوئی رات ایسی ہو جاتی جب چاہنے اور نہ چاہنے کے باوجود کچھ نہ کچھ ہو جاتا اور کچھ نہیں ہوتا۔

اُس رات بھی اسمٰعیل آس نراس کے دوراہے پر اُن کے مقابل آ گیا، وہ اُس کے پاس رُکیں، کچھ بات کی، پھر آہستہ رو دُھند اور کہر کا حصہ بن گئیں۔

یہ وہ تھیں جن کی توجہ کو اسمٰعیل ترس گیا تھا، وہ سب سے ملتی تھیں، باتیں کرتی تھیں، مسکراتی

تھیں، ہنستی تھیں، قہقہے لگاتی تھیں، اور جب وہ اُن کے مقابل آتا تو اُن کا ستا ہوا چہرہ اور سخت ہو جاتا۔

اور پھر تمکنت تھی جس نے مرنے سے پہلے خط لکھا: "مجھے کینسر ہو گیا ہے، میری کیموتھراپی ہوئی ہے، میرے سب بال اُڑ گئے ہیں، میرا چہرہ جھانولا ہو گیا ہے، مجھے بھولنا چاہتے ہو تو ایک مرتبہ آ کر دیکھ لو، مجھے نہیں لگتا میں اس کے بعد پھر تمہیں خط لکھ سکوں گی، میرے شوہر کسی طرح کے ٹور پر گئے ہیں۔" کہتے ہیں پہلا پیار اور آخری پیار سانس ٹوٹنے تک ساتھ نبھاتا ہے۔ کانگریس ہندوستانی مسلمانوں کا پہلا پیار ہے، کانگریس بھی جانتی ہے کہ ہندوستانی مسلمان لاکھ بدکیں مگر جائیں گے کہاں۔ اُنہیں بھی شاید یقین تھا کہ اسمٰعیل نامی شخص اُن سے چھوٹ کر زندہ نہیں رہ سکے گا۔ اور سچ بھی یہی تھا، وہ تو ساری زندگی اُن کے ناز سہتا رہا، وہ اُن کا کیا لگتا تھا، غیر کانگریسیوں نے تو مسلمانوں کو کانگریس کی داشتہ تک کہہ دیا۔

اور تمکنت؟ جو مر گئی! اور پاکستان، جو صرف مرا نہیں، اس کی لاش کو بیچ سے دو ٹکڑے کر دیا گیا — کون کس کی تمثیل ہے؟

"اور رُکمنی؟" اسمٰعیل نے سوچا، میں رُکمنی کو اَگیات واس سے باہر لانا چاہتا ہوں، مگر آج بھی ہندوستان میں رُکمنی، میرے جیسوں کے ساتھ ایک حد سے زیادہ آگے نہیں جا سکتی، ورنہ پنچایت سزا کے طور پر تیرہ لڑکوں کے ساتھ اُس کا ریپ کرائے گی۔

رُکمنی، رُکمنی! تم اَگیات واس ہی میں رہو۔

مگر یہ مسئلہ کیا صرف رُکمنی کا ہے؟

کسی ناہید جبیں کا مسئلہ نہیں ہے؟

مسئلہ تو بس یہی ہے کہ نظریہ زیادہ اہم ہے یا جان؟ جان زیادہ اہم یا دل؟

تمکنت جو مر گئی اس کے لیے جان زیادہ اہم تھی یا دل؟

وہ جب یاد آتی ہے تو لگتا ہے کہ اس کے لیے کچھ بھی اہم نہیں تھا، نہ نظریہ، نہ جان، نہ دل — وہ یا خود میں، اسمٰعیل نے سوچا، دونوں تو ایک الیوژن کی پیداوار ہیں، الیوژن میں جیتے ہیں، الیوژن کے لیے مرتے ہیں اور الیوژن میں مر جاتے ہیں۔ کیسے طمطراق سے وہ صفحۂ ہستی پہ نمودار ہوئی۔ متناسب قد، جسم، رنگ، خال و خط اور پھر اُس کا طنطنے سے بھرا لہجہ، کھنکھناتی ہنسی، ذہین، نڈر، ٹوٹ

کے چاہنے والی، کھِل کے ملنے والی، خوب لڑنے والی—اور وہ مرگئی۔

کیوں؟

وہ چائے نہیں پیتی تھی، سگریٹ نہیں پیتی تھی، شراب نہیں پیتی تھی، پان زردہ نہیں کھاتی تھی، اس کی انمول صفت اس کا ترنم تھا اور اُس کو گلے کا کینسر ہوگیا اور وہ مرگئی...کیوں؟

کسی باغ میں، کسی جھیل کنارے، کسی تنہا مقام پر، جب وہ اسمٰعیل کے پاس گنگناتی...رہیں نہ رہیں ہم/مہکا کریں گے/بن کے کلی/بن کے صبا/باغ وفا میں، تو وہ کانپ اُٹھتا، اُس کے منھ پر ہاتھ رکھ دیتا...بی بی! چپ رہو، خوف اندر اندر زلزلے کی کیفیت پیدا کرتا ہے۔

تو وہ ٹھہا کا لگا کر ہنستی...''تم بزدل ہو!''

پھر اسمٰعیل کا ہاتھ اپنی آنکھوں پہ رکھ لیتی اور اُس کے آنسو اسمٰعیل کے ہاتھوں میں جذب ہوتے رہتے اور پھر وہ مرگئی اور رُکمنی اَگیات واس میں چلی گئی۔ پورا وجود دُھوئیں اور خلا کے ایک ایسے نکتے پر پہنچ گیا جہاں ہر حرکت اور احساس دم توڑنے لگتا ہے۔ کہنے کو صوبوں میں غیر کانگریسی حکومت بنی مگر ۷۷ء میں ایمرجنسی لگ گئی...نرجن بن سناٹا، آدم نہ آدم زاد، سب جیل میں، پورے ملک پر ہُو کا عالم طاری تھا اور ماتا دُرگا کا ترشول چمک رہا تھا۔

اسمٰعیل اب تھکنے لگا تھا، اندر کچھ نہیں تھا، ایک انت سناٹا اور باہر ایک بے آواز کی گھمسان جنگ، اور اس جنگ میں اسمٰعیل صرف اپنے ہی پر وار کر رہا تھا...تجارت، شادی، بچّے، گھر، دوست، احباب، محفلیں، ماں باپ جو کچھ چاہتے تھے اُس نے سب کیا مگر...اسمٰعیل نے سوچا...اس کا کیا کریں...یہ دل ہے کہ اس کی ویرانی نہیں جاتی!

اور پھر اس ویرانی میں ایک نیا اَٹ پٹا پن، نئی بوکھلاہٹ...وہ جو اُس سے بات نہیں کرتی تھیں، اُس کی طرف دیکھتی بھی نہیں تھیں، اُس کے بات کرنے یا مخاطب ہونے کی ہر کوشش کو اپنے سخت رویے سے ناکام کر دیتی تھیں، ایسی کسی جگہ پر بیٹھتی نہیں تھیں، جہاں اُس کا اور اُن کا سامنا ہو سکے...وہ پہلے خواب میں نظر آنے لگیں، پھر اُسے کن انکھیوں سے دیکھنے لگیں، پھر ایک مرتبہ ایک بھرپور نظر ڈالی، پھر ایک رات مسکرائیں، پھر ایک رات آئی جب وہ اسمٰعیل کے پاس آ کر بیٹھیں، پھر معاملہ اس سے آگے بڑھا، ایک رات وہ یوں بیٹھیں کہ اُن کا جسم اسمٰعیل کے جسم سے بالکل سٹ گیا...پھر ایک رات دھواں دھار بارشوں کے درمیان اُنہوں نے اُس کے گلے میں بانہیں

ڈال دیں...اور جھک کے ذرا سا پیار بھی کیا۔

اسمٰعیل بوکھلایا بوکھلایا چل رہا تھا، سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ خواب اور بیداری کا یہ کیسا تضاد ہے... راج نرائن نے اِندرا گاندھی کو ہرا دیا تھا۔ کیا میں راج نرائن ہوں؟ میں نے تو اِندرا گاندھی یا خواب والی بی بی کیا، کسی کو کبھی ہرانے کے بارے میں سوچا ہی نہیں۔ محبت میں تو اِسی اقرار سے بات شروع ہوتی ہے کہ عاشق کو ہارنا ہے— مگر میرے اندر جو سوچ کی کئی لہریں ایک دوسرے کو کاٹتی گزرتی رہتی ہیں، ان کا کیا کروں؟

اسمٰعیل کچھ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا، مگر دیکھنے سے مفر بھی کہاں تھا؟ پورے ملک میں ہاہا کار مچ گئی۔ کانگریس کی حکومت اُلٹ گئی، غیر کانگریس واد اپنے پر پانکھ نکال رہا تھا۔ رُکمنی، تمکنت، وہ اور میں، کتھا کے چاروں چھور کھنڈت ہی کھنڈت...کھنڈت سوچ، کھنڈت وِچار، کھنڈت نتیجہ۔ جن سنگھ اور سنگھ پریوار میں آتم منتھن چل رہا تھا اور کوئی راستہ نہیں نکل پا رہا تھا۔ کانگریس، غیر کانگریس، جن سنگھ اور عام آدمی...کہیں کوئی راستہ نہیں نکل رہا تھا مگر چھٹپٹاہٹیں جاری تھیں...میری تین طرفوں میں دو طرفیں استعارہ بن گئی تھیں اور تیسری طرف...وہ...ایک علامت...اور چوتھی طرف میں...اور میرا ہونا بھی کیا؟ اسمٰعیل نے سوچا، میں شاید ایک ایسا عنصر ہوں جو رہتا ہے اور نظر نہیں آتا۔ جو جھیلتا ہے مگر اپنے درد کو دوسروں تک نہیں پہنچا سکتا، دکھا نہیں سکتا محسوس کرتا ہے مگر اپنے احساس کی ترسیل نہیں کر سکتا۔ اُسے لگا، اس کے باوجود وہ ہے اور اُسی کے ہونے کے سبب یہ سارے پاتر طرح طرح کے روپ بہروپ بدل کر اسٹیج پر آتے رہتے ہیں، وہ ہی تھا جو اُن کے اندر بستا تھا، اور وہ کچھ یوں دکھاتی تھیں جیسے وہ اُن کے اندر نہیں بستا، شاید اِسی لیے جب تک وہ مجھ کو میسر نہیں ہو سکتی تھیں، وہ مجھ سے دور رہیں، اور جب اُن کی شادی ہوگئی، سماج کی نگاہ میں میسر ہونے کی سرحد سے دور ہوگئیں تو سراپا توجہ بن گئیں...اب وہ ہزاروں ہزار میل دور ہیں، زیادہ تر صوبوں میں مسلمان کانگریس سے دور ہوگئے ہیں۔ سنا تھا وہ کنیڈا میں ہیں، پھر سنا انگلستان ہیں، پھر سنا امریکہ چلی گئیں۔ جب تک ہندوستان میں رہیں میں اُن کو خط لکھتا تھا اور زیادہ تر مسلمان پارلیمنٹ کے الیکشن میں کانگریس کو ووٹ دیتے تھے، مگر اقلیتوں پر کانگریسیوں نے پھر بھی توجہ نہیں دی۔ وہ میرے خطوط کا جواب نہیں دیتی تھیں۔ برسہا برس پر کبھی ملاقات ہوتی تو بتاتی ضرور تھیں کہ تمھارا وہ خط ملا تھا۔ کبھی میں نے یہ نہیں پوچھا کہ آپ نے جواب کیوں نہیں دیا، کبھی اُنہوں نے

معذرت نہیں کی کہ اُنھوں نے جواب نہیں دیا۔ پھر وہ ملک سے باہر چلی گئیں اور کانگریس گھرانے میں ایک بی بی باہر سے ملک میں آ گئیں۔ ایک گہری دھند چاروں طرف چھا گئی۔ یہ دُھند بے تعلّقی کی تھی یا بے خبری کی، اسمٰعیل یہ نہیں سمجھ سکا تھا مگر اسمٰعیل کے لیے بالکل سامنے کی بات یہ تھی کہ اب وہ خواب میں آیا کرتی تھیں اور قسطوں میں اُس کی جانب بڑھتی جاتی تھیں۔

ایسے ہی کسی خواب ناک لمحے میں اسمٰعیل نے سوچا کہ یہ میرا وطن ہندوستان، یہ بھی میرا ایک خواب ہے جو دن کے اُجالے میں ایک جلتے تپتے صحرا میں سفر کا استعارہ ہے اور رات کی دھند میں کسی نخلستان کی تلاش۔ یہ بھی مجھ پر طرح طرح سے کھلا، اِس کے اطراف نوچنے اور بھنبھوڑنے والے درندے ہیں، جو اس کا آپا سراپا نوچتے ہیں، میں خواب دیکھتا ہوں کہ اپنی جان سے پیارے اِس پورے ہندوستان کو جو کشمیر سے کنیا کماری تک پھیلا ہوا ہے، اپنے ہاتھوں سے سنبھال رہا ہوں، پیار کر رہا ہوں، اُس کے زخموں پر مرہم رکھ رہا ہوں، پھر سرحدیں وسیع ہو جاتی ہیں، میرا ہندوستان اپنی پچھلی جون میں لوٹنے لگتا ہے، پورا بنگلہ دیش، پاکستان، بھوٹان، تبّت اور افغانستان ...میں ہر چہار اطراف میں پھیل جاتا ہوں، میں ہر جگہ ہوں، ایک سے چہرے، ایک سی بولی، ایک سی ہنسی اور ایک سے آنسو، اور میں کہیں نہیں ہوں۔ میرے جیسے لوگ اُس عنصر کا استعارہ ہیں جو رہتا ہے اور نظر نہیں آتا۔ یہ عنصر شاید ازلی حقیقت ہے، خوشبو، درد، ہوا، روح سب ہیں مگر جو ہے وہ نظر نہیں آتا، ہر جگہ بدل دکھائی دیتا ہے، روح کا بدل انسان، خوشبو کا بدل فرحت، درد کا بدل چہرے کا تاثر— کیا یہاں ہر شئے کسی دوسری شئے کا بدل ہے اور کچھ نہیں— اُن کا بدل تمکنت بنی، خود وہ اپنے خواب کا بدل ہیں یا خواب اُن کا بدل ہے؟

اور رُکمنی کا بدل؟ اُس کا بدل نظر نہیں آ رہا تھا اور پورا ملک بدلاؤ کی ڈگر پر تیزی سے آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ ایمرجنسی نے بوائلنگ فرنیس کا ڈھکن بہت مضبوطی سے بند کرنے کی کوشش کی، مگر خالصتان تحریک، آپریشن بلو اسٹار اور پھر ۸۴ء میں اِندرا گاندھی کا قتل!

بوائلنگ فرنیس کا ڈھکن ہٹا تو ہاہا کار مچ گئی اور اُسی کے آس پاس وہ رات...''

مگر نہیں...اُس سے پہلے ایک آخری واقعہ!

رُکمنی اگیات واس سے باہر آ گئی—

یہ صرف فرض کرنے والی بات ہے مگر فرض کیے بغیر چارہ نہیں ہے کہ رُکمنی اور اسمٰعیل دونوں

جب گلی کے کسی ایک آخری سرے پر آدمیوں کی چاپ سن کر نہایت تیزی سے مخالف سمتوں کی طرف بھاگے تو بد قسمتی سے رُکمنی کو کچھ لوگوں نے اُس اندھیری گلی میں چھاپ لیا اور اُس کے ساتھ زنا بالجبر کیا اور رات کے اندھیرے میں بھاگ نکلے۔ رُکمنی جب اپنے گھر (سسرال) پہنچی تو برا حال تھا۔ رُکمنی کا بال وِواہ ہوا تھا، اُس کا شوہر اُس کے بچپن ہی میں ختم ہو گیا تھا۔ ایک بیوہ اپنی سسرال میں بالغ ہوئی مگر اُس کی جوانی اُس پر عذاب بن کر نازل ہوئی۔ وہ مسلسل بھجن کیرتن میں مصروف رہتی اور اپنے اندر کے طوفان سے لڑتی رہتی۔ اُس رات تین لڑکوں نے اس کے ساتھ زنا کیا، پہلی مرتبہ تو اُس نے مقابلے کی کوشش کی، دوسری مرتبہ اس کو کچھ اچھا لگا اور تیسری مرتبہ اُس نے لطف لیا۔ گھر پہنچی تو وہ عجب کیفیت کا شکار تھی، ایک طرف وصل کا نشہ اور دوسری طرف اندھیری گلی میں پہلی مرتبہ باکرہ کی شبِ عروسی۔ اُس کے چہرے اور بالوں کا جو حال تھا وہ تو تھا ہی، وِدھوا کی سفید ساری پر جگہ جگہ خون کے دھبے بھی نمایاں ہو گئے تھے۔ ساس پہلے تو اُس کے چہرے کا اُجاڑ پن، بالوں کا بکھراؤ اور جگہ جگہ سے اُدھڑے اور مسکے کپڑے دیکھ کر چوکنا ہوئی، اور پھر جو سفید ساری پر خون کے دھبّے دکھائی دیے تو ایک عمر رسیدہ عورت کی حس جاگ اُٹھی، وہ سمجھ گئی کہ کیا ہوا، رُکمنی کو اس نے دو ہتّھڑ مارے اور پھر مارتی ہی چلی گئی۔ رُکمنی ایسی بے سدھ ہوئی کہ سچ چھپائے نہ چھپا مگر ساس کو صرف زنا یاد رہا، بالجبر بھول گئی۔ اس نے اپنا بھی سر پیٹا اور اُس کی بھی جان لینے پر تُل گئیں۔ جنم جلی، چڑیل، بیسوا، کسبی، کُلٹّا، رنڈی، جو منھ میں آتا گیا بکتی گئی اور مارتی گئی۔ نہ اُس کی زبان رُک رہی تھی، نہ اُس کے ہاتھ رُک رہے تھے—

اُس رات ساس سسر نے فیصلہ سنایا کہ رُکمنی اب سسرال میں نہیں رہ سکتی، اُسے میکے جانے ہوگا۔

میکے میں کون بچا تھا؟ ماں باپ ختم ہو چکے، بہنیں بیاہی جا چکیں، بھائیوں میں بٹوارا ہو گیا۔ اب اُس کا کیا بچا تھا؟ کبھی اِس بھائی کے در پر، کبھی اُس بھائی کی ڈیوڑھی پر، وہ بالکل ٹوٹ جانے کی کگار پر تھی تو شہر میں سادھوؤں کی ایک ٹولی آ نکلی جس میں سادھو بھی تھے اور سادھویاں بھی۔ بھجن کیرتن میں تو شروع سے رُکمنی کا جی لگتا تھا، بھائیوں سے کہا مجھے اَب بھگوان کے چرنوں میں جانے دو، بھائیوں اور اُن سے زیادہ اُن کی بیویوں کے لیے بلّی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا!

اس منڈلی میں وہ سال ڈیڑھ سال رہی ہوگی کہ سنگھ گھرانے کی ایک خاتون رُکن کی نگاہ اُس

پر پڑ گئی۔ اور رکمنی ''سادھوی رُکمنی'' کے روپ میں اَگیات واس سے باہر آئی۔

سادھوی رُکمنی کے بارے میں لوگ بھی تذکرے کرتے تھے اور اخبارات میں بھی خبریں آتی تھیں کہ شیر کی طرح گرجتی ہے اور بلبل کی طرح من موہ لیتی ہے۔ خاص طور پر جب وہ مسلمانوں کے خلاف بولتی ہے تو لگتا ہے کہ اُس پر آکاش وانی اُتر رہی ہے، ایسی سُر لتا کے ساتھ مسلمانوں کا مذاق اُڑاتی، اُن کے دُش کرموں کا بکھان کرتی اور اُن کے نیچ پن کو اُجاگر کرتی کہ مجمع شردھا، بھاؤکتا اور سنتشتی (عقیدت، جذباتیت اور سیری) سے لت پت ہو جاتا۔ مگر اسمٰعیل کو پتہ نہیں تھا کہ یہ سادھوی رُکمنی ہے کون؟

پہلی مرتبہ جب وہ بمبئی آئی اور اخبارات میں اُس کی تصویر چھپی تب اُس نے جانا کہ یہ وہی رُکمنی ہے جسے یوراج کیا آدمی بھی نہیں مل پا رہا تھا۔

رُکمنی اَگیات واس سے تو واپس آ گئی مگر اُس کی ملاقات اُس کے جان پہچان والوں سے کیا اُس کے اپنے آپ سے بھی مشکل ہو گئی، اور جب وہ خود سے نہیں مل پا رہی ہے تو مجھے کیا پہچان پائے گی، اسمٰعیل نے سوچا تمکنت کے بارے میں جو مر کر اُسی مقام پر آن کھڑی ہوئی اور پھر سوچا سنگھ گھرانے کی مشہور سادھوی رُکمنی کے بارے میں اُسے لگا کہ دونوں اُس کے سینے پر مسلسل ضرب مار رہی ہیں۔ اسمٰعیل نے یہ بھی سوچا کہ یہ دونوں اُس کے کرچی کرچی خواب کی تشبیہہ ہیں۔

اسمٰعیل کو احساس ہوا کہ اُس کے پاس اب صرف وہ باقی بچی ہیں اور باقی بچا ہے اُس کا پورا ہندوستان اور اُس میں بسنے والوں کے رنگ برنگے سپنے، بچوں کے کنچوں کی طرح من موہک، کوہِ قاف کی پریوں کی داستانوی خوب صورتی کی طرح دلکش اور اجنتا ایلورا کے تہذیبی منظر نامے کی طرح کھلے ڈلے!

رُکمنی کا واقعہ ضمنی واقعہ ہے، مگر قوموں کی زندگی میں ایسے واقعے اچانک ہی آیا کرتے ہیں۔ حالاں کہ اِس اچانک پن کے باوجود اِس میں ''انھونی'' کا عنصر اتنا شدید نہیں ہے جتنا اسمٰعیل کی زندگی کے اُس عرصے پر پھیلی اُس عجیب و غریب رات کی کوکھ میں موجود ہے، جس کے بعد ویسی رات پھر کبھی نہیں آئی۔

اور حالانکہ ویسی رات پھر کبھی نہیں آئی مگر وہ رات اسمٰعیل کی زندگی کے پورے عرصے، رقبے اور پھیلاؤ سے باہر بھی نہ جا سکی۔

اُس رات اسمٰعیل ایک انجانے حزن کا شکار تھا اور کچھ ایسے کے بارے میں متوحش تھا جس کی اُسے خبر نہ تھی۔ درج ذیل حادثہ اسمٰعیل نے کسی سے بیان نہیں کیا تھا۔ راوی کو اُس کی ڈائری میں یہ تحریر ملی، اُس نے لکھا تھا:

''میں ایک عجیب حزن کا شکار ہوں کہ میں نے وہ کیا یا مجھ سے وہ ہوا جس کی سُن گن مجھے میرے خیال کے کسی انتہائی سرے پر بھی نہیں ملی۔ حالانکہ میں ڈر رہا تھا، میں اُس دن سے ڈرا ہوا تھا، جب انھوں نے میرے گلے میں بانہیں ڈال دی تھیں۔ میں حیرت و حسرت کا مارا اپنے کٹے پھٹے آدھے ادھورے وجود کے اطراف بار بار کھوجی اور ملامتی نگاہ ڈالتا اور اپنے آپ سے پوچھتا کہ میں نے ایسا کیوں کیا، میں نے ایسا کیسے کیا، میں نے تو کبھی اُن کو اپنی تسکین کے لیے ایک معروض، آبجکٹ نہیں سمجھا، میں اُن کے سلسلے میں ہمیشہ ڈسپلنڈ اور مؤدب رہا۔ پھر یہ میرے اندر کون سا کمزور اور لجلجا آدمی تھا جو اپنے اندر کی انارکی سے لڑ نہیں سکا۔ آخر اُس دن کیا ہوا تھا؟ یاد آتا ہے کہ ابر چھائے تھے، مگر بارش نہیں ہوئی تھی، دھوپ نکلی تھی مگر بدن میں چبھتی نہ تھی، ہوا چلتی تھی مگر پتّے نہ ہلتے تھے، بچے گلیوں میں کھیلتے نظر نہیں آتے تھے البتہ لوگ باگ سڑکوں پہ لاشوں کی طرح چلتے ضرور دکھائی دیتے، پتہ نہیں لاشیں کیسے چلتی ہوں گی، کوئی کسی سے کچھ کہہ نہیں رہا تھا مگر لگتا تھا کہ ہر آدمی اپنے سامنے والے سے کچھ نہ کچھ سن رہا ہے، فضا میں روز کی طرح مٹی کی سوندھی مہک، کسی گھر کے بغیچے میں کھلتے پھولوں کی خوشبو، گھروں کے تووں پر پھولتی چپاتیوں کی مہک... یہ سب کچھ تھا یا نہیں کہنا مشکل ہے لیکن خون کی بساند جیسا کچھ احساس کہیں آس پاس ضرور منڈلا رہا تھا۔ مردوں کے چہرے غمگین نہیں تھے لیکن بے جذبہ نظر آتے تھے، عورتوں نے کوئی سیاپا نہیں کیا تھا مگر یوں نظر آ رہی تھیں کہ جیسے کہیں سے سناؤنی آوے تو رودالی فوراً کھڑی ہو جائے۔ سورج نصف النہار پر کب پہنچا، خبر نہیں مگر غروب کی ڈھلان پر آگے بڑھتا صاف نظر آ رہا تھا۔ میرا اپنا من بیاکل تھا، کوئی غم نہیں تھا، مجھے پریشان کرنے کے لیے کوئی میرے سر پر سوار نہیں تھا، ماں باپ، بیوی بچے — سب اپنی دنیا میں مگن تھے، کئی بہت پیارے دوست، ایک پیاری

بھانجی، ایک بہت خیال رکھنے والی بہن سب مر گئے تھے۔ نہ دوستوں کی گالیاں، نہ بھانجی کے تقاضے، نہ بہن کی ڈانٹ۔ راوی زندگی میں چین لکھتا تھا اور من بیاکل تھا... چین اور بے چینی کے بھنور میں گھرے ایک اور دن کا پہاڑ کاٹ لیا تھا — رات کی آمد آمد تھی ...اور پھر رات آن کھڑی ہوئی، رات تو سونے کے لیے آتی ہے، مگر مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ شاید یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا، عام طور پر سونے کے تین مراحل ہوتے ہیں، میں کس سیڑھی پر پاؤں رکھے، نیند کے روپ سروپ کو تکتا تھا، مجھے پتہ نہیں تھا، بس ایک بے کلی سی تھی اور کچھ وہم سا تھا، پھر کب اونگھ آئی، کب نیند آئی، کب میں گہری نیند کے دُکھ/سُکھ ساگر میں تحلیل ہو گیا مجھے پتہ نہیں ...میں جس پل کا بیان درج کر رہا ہوں اُس پل میں برف کے یا روئی کے گالے جیسا کچھ تیرتا سا محسوس ہوا، خوف ناک آوازیں آ رہی تھیں جیسے پہاڑ گر رہے ہوں، ہواؤں کی ہہاس اور سمندر کی چنگھاڑ سنائی دے رہی تھی۔ پھر منظر بدل گیا، کچھ پروں کی سرسراہٹ جیسا گمان ہوا، جیسے حوریں فضاؤں میں رقصاں ہوں، ایک سمفنی ...ایک مدھم سی گونج...کوئی میٹھا میٹھا سُر ....''

وہ آ رہی ہیں ...ایک وہم سا ہوا ...کہیں نظر نہیں آ رہی تھیں مگر ایسا لگ رہا تھا کہ وہ آ رہی ہیں۔ برف یا روئی کے گالے سے تیار کی ہوئی فضا میں سنہرے گل بوٹے ٹکے ہوئے تھے اور جگنوؤں کو حکم دیا گیا تھا کہ تم سارے میں جگمگاتے پھرو اور چاند نے منادی کی تھی کہ ابدالآباد تک میں اس فضا پر چاندنی بکھیروں گا اور غیب الغیب سے ایک فرمان جاری ہوا تھا کہ سورج اپنی تپش کو اس جلسے سے دور رکھے۔ الٰہی یہ جلسہ کہاں ہو رہا ہے، جہاں حورانِ بہشتی کا مجمع دف پر گاتا تھا... چوں پردہ برافتد... چوں پردہ برافتد...اور پردہ ابھی اُٹھا نہیں تھا، حریری پردوں کی سرسراہٹ نرم بھی تھی اور ریشم جیسی کومل بھی، پردے ساکن نہیں تھے، مگر اُٹھ بھی نہیں جا رہے تھے، اہتمام یہ تھا کہ کچھ چھپا بھی رہے، کچھ جھلملاتا بھی رہے، ایسے ستّر پردوں کے پرے وہ ساعدِ سیمیں ایک مستانہ سی بوجھل اور سرشار کیفیت میں مکیّف ہوئیں کہ ماتھے پہ اُن کے شکنیں مثل صفِ تشنگاں تھیں اور بھویں طلب کی آگ میں جل کر زلفِ زلیخا کی

مانند سیاہ اور آنکھوں کی پتلی میں سیاہی تھیں سفیدی تھی، شفق تھی، ابرِ باراں تھا، مگر یہ ابر کچھ رُکا رُکا سا تھا اور ناک کی کیل پھول پر شبنم اور لب ...گلاب کی دو پنکھڑیاں ایک دوسرے سے وصل کے نشے میں سرشار، رخسار ڈوبتے ہوئے دو سرخ سورج جو روشنی کی ہلکی ہلکی پھوار پھینکتے ہیں، مگر اپنی گرمی سے پریشان نہیں کرتے، گردن انگوری شراب کا، ایسا جام جس کی ساری شراب کفِ ساقی کو بھگوتی محسوس ہو، سینہ خلد کے دو گنبدوں کا بیضوی عرصہ جس پر مینار کی انتہا کا نوکیلا پن بھی نمایاں ہو، کہنی سے ہتھیلی تک جلد ایسی شفاف کہ رگوں میں دوڑتا خون آئینے کی طرح عکس آسا اور شیشے کی طرح آر پار...''

مجھ پہ ایک بے خودی سی طاری تھی، اِس سارے منظر نامے میں اک وہ تھیں، اِک میں تھا، اُن کا خرام ایسا سست رو تھا کہ تحرک محسوس نہیں ہو رہا تھا، مگر وہ وقت کی طرح گزرتی جا رہی تھیں، بسرتی جا رہی تھیں اور میری سمت چلتی چلی آ رہی تھیں، سانس رُکتی تھی چھلکتے ہوئے پیمانوں کی، میرا جی چاہا کہ میں پکار کر کہوں، رقصِ مئے تیز کرو ساز کی لَے تیز کرو، ابھی اتنا ہی سوچا تھا کہ فضا میں ساز اور آواز دونوں کی لہر نے سر اُٹھایا...میرے ساجن ہیں، اُس پار/ میں من پار/ اب کی بار/ اب کی بار...میں ایک تیز کیف اور رقص کے حصار میں آیا اور نعرہ لگایا... بیا جاناں تماشہ کُن ...وہ اب شاید کہیں قریب تھیں، آواز مجھ تک پہنچی... ہمہ آہوانِ صحرا/ سر خود نہادہ بر کف...اس آواز نے مجھے ایک بھیانک طوفانی رقص کا اسیر کیا...میں اب بجلی کے کوندے کی طرح محوِ رقص تھا، اور وہ آواز کے جھپکے کی طرح طلوع ہوتی تھیں اور غروب ہوتی تھیں... غروب ہوتی تھیں اور طلوع ہوتی تھیں، اور تانڈو نرتیہ کی تال پر ہر لحظہ وہ مجھ پر برپا ہوتی جاتی تھیں، مجھ سے قریب ہوتی جاتی تھیں ...میں نے بے خود ہو کر آوازہ بلند کیا ...تعالیٰ اللہ چہ دولت دارم اِمشب ...اب وہ مجھ پر برپا نہیں ہو رہی تھیں، مجھ میں نفوذ کر رہی تھیں ...خوشبو کے ایک لپکے کی طرح وہ مجھ پر وارد ہوئیں ...فضاؤں میں ایک طویل گونج ...ایک مسلسل آواز ... سِدرہ کی انتہائی بلندیوں تک پہنچتی ہوئی... حجابِ چہرہ جاں می شود غبارِ تنم ...تنم ...تن تن تنتنا نا ہا یا ہو...''

اور پھر یوں ہوا کہ ہم دونوں رقص کرتے ہوئے ایک دوسرے کے قریب آتے گئے اور ہمارے لباس آپ ہی آپ ہمارے جسموں سے جدا ہوتے گئے اور پھر ایک لمحہ وہ آیا جب آدم وحوا ایک دوسرے کے سامنے تھے۔

ہم دونوں مادر زاد برہنہ تھے، دونوں ایک دوسرے کی طرف بڑھ رہے تھے، دونوں ایک دوسرے کو بس ایک ٹک تکے جا رہے تھے اور ایک دوسرے کے قریب آتے جا رہے تھے ...اور قریب...اور قریب ...اور قریب ... پھر ایک قیامت خیز ٹکراؤ، جھٹکا، دھماکا، بگ بینگ، عجیب وغریب اور کائنات کا انوکھا بگ بینگ جس میں عناصر ایک دوسرے میں باہم پیوست ہو گئے، موبمو، لب بلب، قلب بقلب، پاپا، اور تب یہ بھی ہوا کہ جنت سے انجیر اور زیتون کے پتّے اور گلاب کی پنکھڑیاں اور کنول کے پھول اور بیلے چنبیلی کے ہار سب ہمارے قدموں تلے بکھر گئے، پھیل گئے اور غیبی ہاتھوں نے ہم دونوں کو سہج سہج آدم کے عرصہ عدن میں محو استراحت کر دیا، ہم دونوں ایک دوسرے میں پیوست نرم مخمل زمین پر لیٹے تھے اور فضاؤں میں عطر وگلاب کی خوشبو تیر رہی تھی اور بخور چاروں طرف خوشبوؤں کا چھڑکاؤ کرتے تھے اور نغمے تیرتے تھے...رنگ ہے...ری ماں...رنگ ہے...''

اور پھر یوں ہوا کہ کائنات کی ہر حرکت رُک گئی...بس ہم دونوں محوِ حرکت تھے اور شرابِ وصل سے آشنا ہو رہے تھے، ہم دونوں محوِ حیرت تھے اور ہماری آنکھیں بند تھیں اور ہمارے دِلوں نے دھڑکنا چھوڑ دیا تھا، بس ہمارے جسم محوِ تکلّم تھے اور ہم دونوں کے ہونٹ اور دانت ایک دوسرے کی گردنوں میں پیوست تھے، ہم مجامعت کر رہے تھے اور ایک دوسرے کا خون پی رہے تھے، اور فضا میں نغمہ تیر رہا تھا...حجابِ چہرہ جاں می شود غبارِ تنم...اور یاد آ رہا تھا کہ مرنے والی...تمکنت نے کہا تھا...جسم کا اُوٹ ہٹاؤ!

کالی مکڑی ملاپ کے فوراً بعد، کالے مکڑے کو اپنے جسم سے الگ کرتی ہے اُس کا سر اپنے دانتوں سے کاٹ کر کٹر کٹر کھا جاتی ہے۔ اُس کے بعد سارے جسم کو مزا لے لے کر کھاتی ہے، مگر یہاں ہم دونوں ایک دوسرے کا خون پی رہے تھے...اور جب

میں وصل کے اِتمام پر نزول کے مرحلے میں تھا تو ایک مرتبہ پھر کچھ خوف ناک آوازیں سنائی دیں، ایسا لگا جیسے پہاڑ گر رہے ہوں، ہواؤں بلکہ طوفانوں کی ہاہاس اور سمندر کی چنگھاڑ بھی صاف سنائی دے رہی تھی۔''

ڈائری کا اندراج یہاں اپنے اختتام کو پہنچا—

اس ضمن میں تین خاص باتوں کا ذکر ضروری ہے۔

- اس دن کے بعد اُن کا خواب میں آنا بند ہو گیا۔
- بعد میں خبر ملی کہ اُسی دن اُن کا انتقال ہوا تھا۔
- اُسی زمانے کے آس پاس بھیونڈی اور ممبئی میں فرقہ وارانہ فسادات کا سلسلہ شروع ہوا۔

• • •

2

''**بات** کیاتھی؟' اسمٰعیل کے من میں شک کا سانپ سرسرایا۔

''بات کیا ہوگی؟ بات کیا ہوتی ہے؟ کہیں بھی کوئی نئی بات کب ہوئی؟ وہی پرانی باتیں، پرانی گھاتیں، پرانا انداز...''

''تیرہ چودہ سال سے جس افواہ کو روکنے کی کوشش کی جارہی تھی، وہ رُک نہ سکی۔

لیکن سوال یہ بھی ہے کہ آخر قاتل اور ظالم کا دشمن ہماری چڑھ کیوں بن گیا ہے؟

''جاگ! مجھے پال پوس کر بڑا کرنے والی زمین جاگ... دیکھ تیری کوکھ پر حملہ کرنے والوں کے صرف رنگ بدلے ہیں، ڈھنگ وہی ہیں۔''

''اوئے اسمٰعیلا... اوئے رجائیا... سالو! صدیاں گزر گئیں، مگر ڈائیلاگ نہیں ختم ہوا؟''

مبشر رجائی اور اسمٰعیل مرچنٹ... دونوں چونک کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔

''یار! وہی تھانا؟''

اسمٰعیل مرچنٹ نے کہا اور مبشر رجائی نے سنا۔

''ہاں برادر! تھا تو وہی مگر ہے کہاں؟''

''میں یہاں ہوں... یہاں ہوں... ہوں... ہوں...''

''فضول کو، کاہے کو ڈراتا ہے، ہے تو سامنے آ۔''

اسمٰعیل پر جیسے کپکپی طاری ہوگئی، مبشر رجائی بے ساختہ ہنسا کہ غائب حاضر کا صیغہ استعمال کر رہا تھا... شاید اثبات کے لیے یہ ضروری ہے۔ ضروری ہو یا نہ ہو، مگر وہ جدا ہو چکا تھا، سامنے نہیں تھا، پھر بھی آواز کی بازگشت جاری تھی ...او اسمٰعیلا! میں ہوں ... ہوں...'' تب ایسے میں مبشر اور اسمٰعیل دونوں تشویش میں پڑے۔

دونوں تشویش میں پڑے کہ دل دہلا دینے والی بھیانک رات کا سامنا تھا، برسات کا صرف

موسم ہی نہیں تھا، بلکہ بارش ٹھائیں ٹھائیں ہورہی تھی،طوفان گرج اور چمک کے ساتھ...جب جب بجلی چمکتی تو جنگل کے بھیانک پن کا قدرے اندازہ ہوتا،اور جب بجلی چمک کر دُھندا اور اندھیرے میں کھو جاتی تو ماحول کا بھیانک پن اور بڑھ جاتا۔

پورا شہر برقی قمقموں کی روشنی میں جگمگا رہا تھا کہ چودہ سال بعد ایسی خوشی کا موقع آیا تھا،لڑکے بالے نئے نئے یا دُھلے دُھلائے صاف کپڑوں میں،نوجوان جوش وولولہ سے سرخ...سارے شہر میں قمقموں،جھنڈیوں،نعروں اور لوگوں کا سیلاب سا تھا۔

''اُس رات کی بات تجھے یاد ہے برادر؟'' اچانک مبشر رجائی نے سوال کر دیا۔

''کس رات کی بات؟'' اسمٰعیل کی سوچ میں اڑچن پڑی تو وہ قدرے جھنجھلا گیا۔

''جس رات وہ ہم سے آن ملا؟''

''نہیں۔'' اسمٰعیل نے مختصر سا جواب دیا...تاکہ مبشر رجائی کسی طور چپ ہو جائے۔

اسمٰعیل صدیوں پرانی،اپنی قومی عادت کے حصار میں تھا۔

''وہ رات تو بھول گیا؟ حیرت ہے تجھ پر!وہ رات اور اُس رات کی کوئی بات بھلائی بھی جاسکتی ہے؟ وہ رات تو انسانی تاریخ کا ایک اَنمٹ باب ہے برادر!'' مبشر رجائی کے لہجے سے تحیر اور تاسف دونوں جھلک رہا تھا۔

اسمٰعیل انتہائی جھلاّہٹ کا شکار ہو چکا تھا،مہمان سمجھ کر چپ رہا،ورنہ اتنا تو پوچھا ہی جاسکتا تھا کہ تُو ایک رات کی بات کرتا ہے اور خود تو نے جو اَنگنت راتیں فراموش کر دیں؟ دشمنوں میں گھرے شخص کی روانگی کی رات...ناقہ پر لاشہ رکھ کر گمنام سمتوں میں روانہ کر دینے والی رات...شمعیں بجھا دینے والی رات...مقتل کی تنہا کر دینے والی رات...''

راتوں کی کمی کہاں تھی؟ جو یہ یاد دِلا رہا ہے...جدا ہو جانے والے کی ناقابلِ فراموش رات!

یاد تو اُس کو بھی تھی...اچھی طرح یاد تھی...وہ رات جب وہ کتوں کے نرغے سے بچ کر قلعہ میں پہنچا تھا...مگر قومی مفاد بھی تو کوئی چیز ہے،مگر قومی مفاد اور مصلحت سے اس رجائی کو کیا لینا دینا؟ اپنا علاقہ چھوڑ کر بھاگ آیا اور یہاں سمجھا رہا ہے۔

اسمٰعیل کے اندر کڑواہٹ سی پھیل گئی،مگر وہ خاموش رہا...اور مبشر آموختے کی طرح دُہراتا رہا...''جس رات وہ ہم سے آن ملا!''

پھر کچھ دیر بعد...اسمٰعیل بھی چونکا...بات ذرا عجیب سی تھی...وہ رات تو وہ واقعی بھول چکا تھا ...اُسے تو قلعہ بند ہونے والی رات یاد تھی۔

''اپن کچھ بھول رہے ہیں یار...کیا ہوا تھا اُس رات کو؟'' اسمٰعیل بھی ہمہ تن گوش ہو گیا۔

''وہ رات...'' مبشر رجائی بالکل داستان گو کے انداز میں شروع ہوا:

''وہ رات انسانی تاریخ کی ایک اَنمٹ رات ہے، ویسی ہی راتوں کے بارے میں ہمارا شاعر کہہ گیا ہے...شبِ تاریک وبیمِ موج وگردابِ چنیں حائل...مرچنٹ!تم نے حافظ کو پڑھا ہے؟''

''نہیں یار! نصاب پڑھنے کے علاوہ کچھ پڑھنے کا موقع ہی کہاں ملا؟ وہ قیامت کے دن تھے،ملک ابھی ابھی آزاد ہوا تھا،امیر رشتہ دار اور جان پہچان والے جا چکے تھے،ہم لوگوں کو تو کھانے کے لالے پڑے ہوئے تھے،پڑھنے کی بات کہاں سے سوجھتی؟ وہ تو کہو کہ ہمارے پاس جانے کے لیے بھی پیسہ نہ تھا،ورنہ ہم بھی جا چکے ہوتے،تو ہم نہ جاسکے اور لشٹم پشٹم کسی طرح میٹرک کرنے کے بعد ہمارے باپ نے ایک جان پہچان کے لوم والے کے ساتھ کر دیا۔شروع شروع تو اُس کے گھر کا سودا سلف بھی لانا پڑتا تھا مگر آہستہ آہستہ جب کام سیکھ گیا تو میری خدمت اور محنت سے خوش ہو کر اور میرے باپ کی منّت سماجت سے متاثر ہو کر میرے مالک نے ایک چھوٹا سا لوم الگ سے کھولا جس میں اُس کا پیسہ اور میری محنت شامل رہی،لیکن ساجھے کی ہانڈی تو بیچ چوراہے پر پھوٹ ہی جاتی ہے،کچھ اُس کو شکایت ہوئی کہ میری نیت خراب ہو گئی ہے،کچھ مجھ کو شکایت ہوئی کہ میری محنت کا پھل جتنا ملنا چاہیے،اتنا نہیں مل رہا ہے،نتیجہ یہ ہوا کہ اپن اُس سے الگ ہو گئے مگر اتنے دن میں اتنا پیسہ جمع ہو گیا تھا کہ ایک اتنا ہی بڑا لوم میرا اپنا ہو گیا اور پھر میری محنت نے اُس میں چار چاند لگا دیئے اور جب ذرا مالی طور پر پُرسکون ہوا تو کسی طرح آئی.اے. بی.اے. کر لیا۔

''اوہ!'' مبشر رجائی کے لہجے سے تحقیر جھلک رہی تھی۔

اس حقارت کو اسمٰعیل نے بھی محسوس کیا مگر چپ رہا کہ اَب اُس کے پاس مبشر رجائی کے علاوہ کچھ نہیں بچ رہا تھا...اور اُن دونوں کے بیچ بھیانک رات کھڑی تھی۔

''صرف مبشر رجائی کے بچنے کا مطلب یہ ہے کہ...'' اسمٰعیل نے سر جھٹکا۔

''اب اِس وقت یہ آخری سہارا ہے،خواہ یہ فریب ہی کیوں نہ ہو۔''

پھر اُسے مولانا عبداللہ سرحدی یاد آ گئے،جو ''دینِ قیّم'' اور بڑے چھوٹے شیطان وغیرہ کی نہ

جانے کیا کیا باتیں کرتے تھے، پتہ نہیں اُن کا کیا ہوا؟ اُسے اُن کے نام کے بارے میں سوچ کر ہنسی آ گئی... سرحدی ہی ٹھہرے، کبھی سرحد کے اس طرف کبھی اُس طرف!

مگر تب ایک اور بات ذہن میں آئی... گویا جب رہیں گے تو سرحد پر۔

''یار مبشر رجائی! تم اس طرف ہو یا اُس طرف۔''

''یار میں اگر کسی طرف بھی ہوتا تو تم سے ملاقات ناممکن تھی۔''

''تب پھر تم اپنا نام کیوں نہیں بدل لیتے؟''

''ارے تم کہتے ہو کہ صرف نصاب پڑھا ہے، اور ناموں کے فلسفے پر گفتگو کر رہے ہو؟''

''تم جیسے عالموں کی صحبت کا اثر ہے۔'' اسمٰعیل ہنس کر بولا۔

مبشر رجائی کو پھر وہ یاد آ گیا جو جدا ہو گیا تھا... کیسی عالمانہ اور دل موہ لینے والی گفتگو کرتا تھا وہ!

''تم نے سنا ہے نا؟ اُس کی تقریروں کا کیسٹ بھی بازار میں آ گیا۔''

''ہاں سنا ہے... مگر سنا نہیں ہے۔''

اور ایسی ہی سننے نہ سننے والی کیفیت پر مرچنٹ کو پھر وہ رات یاد آ گئی، جس رات سنی سنائی باتوں کا طوفان در آیا تھا، جو آتا ایک نئی بات سنا جاتا، خود وہ طبعی طور پر سکون پسند تھا، اور اس لیے بھی کہ تنکا تنکا کر کے جو آشیانہ اُس نے بنایا تھا، اس میں افواہوں کی جلتی بھبھکتی شہتیر کھڑی کرنے سے وہ ہمیشہ گھبراتا تھا۔ اسمٰعیل بنیادی طور پر مزدور آدمی تھا، سننے کو وہ مولانا عبداللہ سرحدی کی بات بھی سن لیتا تھا اور بنات والا کی بھی مگر جو لذت اور شیرینی اُسے گاہکوں کی گفتگو میں ملتی تھی وہ کسی کی بات میں نہیں، اُس کی توجہ بھی اُن لوگوں کی طرف ہی رہتی، اس بے توجہی سے جھلّا کر ایک مرتبہ مولانا عبداللہ سرحدی نے اُسے ڈانٹ بھی پلائی تھی۔

''ہم دیکھتے ہیں کہ تم کو خدا کا خوف ذرا بھی نہیں ہے؟ ان شیطان دنیادار گاہکوں کی باتوں پر تم ہمہ تن گوش ہو جاتے ہو، مگر دین کی جب بھی کوئی بات ہوتی ہے تو تم اُکتائے اُکتائے دکھائی دینے لگتے ہو۔''

''کیا واقعی مجھے خدا کا خوف نہیں ہے؟'' اسمٰعیل نے متفکر ہو کر سوچا تھا، اُس وقت اُسے کسی شاعر کا شعر یاد آ گیا تھا جو اُسے اس کے شاعر دوست گوہر مالی گانوی نے سنایا تھا... اے آسمان! تیرے خدا کا نہیں ہے خوف/ ڈرتے ہیں اے زمین ترے آدمی سے ہم... مگر اِسی کے ساتھ یہ بھی

یاد آیا تھا کہ شاید شاعر خود بھی لامذہب تھا۔ سو اسمٰعیل نے لاحول پڑھی کہ بقول مولانا عبداللہ سرحدی، اس قسم کی گمرہی کی باتیں قوم کے زوال کا سبب بنتی ہیں۔ ''مگر میرے شہر میں تو دین کا غلغلہ بہت زیادہ تھا۔'' پھر ایک سوال نے سر اُٹھایا۔

اور پھر شاید کچھ اور بھی یاد آ گیا... 'میرا شہر'... وہ سرگوشیوں میں کہہ رہا تھا... کبھی میرا شہر شہر تھا ...اب وہ جلی ہوئی جھونپڑیوں، تباہ مکانوں، بند لوموں اور کیمپوں میں پڑے تباہ حال انسانوں کا کھنڈر رہے... دلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب!

دلی کا اُجڑنا کیا صرف دلّی کا اُجڑنا ہے؟

گوہر مالیگانوی بتا رہا تھا کہ جب وہ لال قلعہ میں گیا تو اُس پر عجیب کیفیت طاری ہو گئی... یہ دیوانِ خاص... یہ دیوانِ عام... یہاں سے ہم احکام صادر کرتے تھے اور جزیہ لیتے تھے...''

پاس ہی ایک کمیونسٹ دوست بیٹھا تھا... جھلّا کر بولا... ''۳۷ برس کے بعد بھی اگر عادتیں نہ بدل سکیں تو تباہی کو کوئی نہیں روک سکتا...'' تو گوہر مالیگانوی مسکرا کر بولا تھا: ''ہزار برس کی عادت 37 برس میں کیسے ختم ہو جائے بھائی؟''

''شکر ادا کرو کہ زمانہ بدل گیا ورنہ جزیہ تو تم لوگوں سے وصول کیا جانا چاہیے تھا۔''

''یہ شاید ۳۷ برسوں کی یک بارگی وصولی تھی۔'' اسمٰعیل کو پھر اپنا لوم یاد آ گیا۔

بہت اطمینان سے لوم چل رہا تھا، چھوٹی سی رقم سے شروع ہوا مگر اسمٰعیل نے اپنی محنت سے اُسے آگے بڑھا دیا، وہی اسمٰعیل جو بچپن میں تین وقت کا کھانا بھی شوق سے نہیں کھا پاتا تھا، اُس کو اتنا موقع ملا کہ اپنا الگ گھر بھی بنا لیا، گھر میں فریج، گودریج، صوفہ سیٹ، ڈائننگ ٹیبل، اسکوٹر، فون، ڈبل بڈ مسہری... کار چھوڑ کے سب میسر ہو گیا۔ ''اور یہ سب کچھ بس ایک پَل میں؟'' اسمٰعیل کی آنکھیں نم ہو گئیں... ''بس ایک پل میں ''ہاں'' سے ''نہیں'' بن گیا؟''

''کتنی آسانی سے وہ ''نہیں'' سے ''ہاں'' بن گیا؟ رجائی ابھی تک گم شدہ رفیق کے ساتھ چل رہا تھا۔

''ہاں سچ ہے۔'' اسمٰعیل کو بھی یاد آیا۔ شروع میں وہ کیا تھا... بس دمادم مست قلندر... اُس قلندر کی اصل دلچسپی تو بس یہی تھی کہ اپنے قصبے اور علاقے کے لوگوں کو میٹھی میٹھی آواز میں وہ سناتا رہے جو سننا اُن کا ہر روز صبح کا مشغلہ ہی نہیں بلکہ سب سے زیادہ پسندیدہ اور اطمینان و سکون بخش

عادت تھی۔

اور اُس شیریں مقال کو شعلہ بیان بنا ڈالا گیا۔

تیس برس کا وہ خوب رو، باریش اور بادستار نوجوان پھر کیا کیا نہ بنا...سیاست داں...قاتل، مجرم...''

اور پھر آخر میں؟

اسمٰعیل کو یہ سوچ کر ہنسی آ گئی کہ اگر ہر مجرم وہی بننے لگا جو وہ بن گیا تو پھر کون ہے جو اپنی دنیا چھوڑ سکے—؟

''لیکن یار مبشر رجائی! تم اپنی دنیا چھوڑ کر ہماری دنیا میں کیسے آ گئے؟''

''برادر! وہاں زبردستی پکڑ پکڑ کر سرحدوں پر بھیج دیا جاتا ہے۔''

''تو فرق کیا ہوا؟ وہاں سیکڑوں کوس چل کر موت خریدی جاتی ہے، یہاں گھر بیٹھے موت مل جاتی ہے۔''

''ہاں فرق ہے۔ اُس موت میں جسے حاصل کرنے کے لیے خود مرنے والا آگے بڑھے... اور اُس موت میں جو بے سوچے سمجھے، دیکھے بھالے سروں پر آن پڑے...دونوں میں بڑا فرق ہے۔

اسمٰعیل کچھ کہتے کہتے رُک گیا کہ ابھی جانبین کے معاہدوں کی روشنائی بھی خشک نہیں ہوئی تھی ...مگر تب پھر ایک دوسری بات یاد آ گئی: ''یار تم واجب القتل تو نہیں تھے؟''

''اسمٰعیل! تم ایجنٹ ہو کیا؟''

''لاحول ولاقوۃ!''

''تب پھر زخموں پر جمتی پھپھوندا کھیڑنے سے کیا فائدہ؟''

''اچھا اتنا بتا دو کہ تمھاری وابستگی کس سے ہے؟''

''میری وابستگی صرف مجھ سے ہے۔''

اب اس پر اسمٰعیل کیا کہتا؟ کیا کہا جا سکتا ہے؟ بس سوالات سر اُٹھا رہے ہیں، وابستگیِ ذات کیا ہے؟ خود ذات کیا شئے ہے، سارا وجود سلامت رہے اور دماغ ساتھ دینے سے انکار کر دے تو پورے وجود کی معنویت کیا ہے؟ اگر دماغ زندہ ہے تو کیا دماغ کو سوچنے سے روکا جا سکتا ہے؟ کیا

سوچنے والا دماغ ''لاکیفیتی کیفیت'' میں بھی زندہ رہ سکتا ہے؟

اسمٰعیل کو اپنے سوال کا جواب خود مل گیا، کئی دن تو اُس نے بھی ''لاکیفیتی کیفیت'' میں گزارے، آنکھیں تھیں مگر دماغ نہیں تھا، ہاتھ پیر تھے مگر دماغ نہیں تھا۔

اس نے کیا نہیں دیکھا، کیا نہیں سنا، کیا نہیں سونگھا، کیا نہیں کیا۔

مگر سوچا کیا؟

وہ کیا سوچ سکتا تھا؟

وہ کچھ سوچنے کے قابل نہیں تھا، اس لیے وہ اپنی مرضی سے کچھ کرنے کے قابل بھی نہیں تھا...

اُن دنوں تو اُنہوں نے جو چاہا وہ کیا، کچھ ایسا جو مسلسل سوچتے رہنے کے نتیجے میں ایک صورت حال ...خوف ناک صورتِ حال کو پیدا کرنے کے قابل ہو سکے، اور انھوں نے وہ صورتِ حال پیدا کر دی، نتیجتاً اسمٰعیل مرچنٹ جیسے لوگ اُس صورتِ حال کے حصار میں پھرکی کی طرح گھومتے رہے اور وہ سب کچھ دیکھتے رہے، جو دوسروں نے دکھانا چاہا، وہ سب کچھ کرتے رہے جو دوسروں نے کرانا چاہا، وہ سب کچھ سنتے رہے جو دوسروں نے سنانا چاہا وہ سب کچھ سونگھتے رہے جو دوسروں نے سونگھانا چاہا۔

طرح طرح کی افواہیں، نعرے، گالیاں، سڑتی لاشوں کی سڑاند، بجباتی موتریوں اور اُبلتے ہوئے سنڈاس کی بدبو، جلے ہوئے گھر، گرتی ہوئی شہتیریں، اور پل کے پل میں راکھ ہوتی ہوئی مشینیں، لاشوں کے انبار سے گزرنے کا عمل، اور لاشوں کو آنگنوں میں بغیر نہلائے دفنانے کا کرب، گولیوں کی تڑتڑاہٹ، فوجی بوٹوں کی چاپ اور سینے کو روندتے ہوئے اور خوابوں کو چکنا چور ہوتے ہوئے دیکھنے پر مجبور آنکھیں...

اسمٰعیل اپنے آپ میں بے بس تھا اور یہ سب کچھ بھوگنے پر مجبور۔

بس وہ زندہ تھا مگر ہر کیفیت سے عاری۔

اور مبشر رجائی نے گریز کی راہ اختیار کی مگر اپنے احوال کے سلسلے میں مُہر بلب تھا۔

اور وہ گم شدہ رفیق...جانے کون سا موڑ مڑا کہ حضور نے غیوب کی رِدا تانی۔

مگر جانے یہ کیسا غیوب تھا کہ مسلسل رفاقت اُس کا شعار بنی۔

اسمٰعیل مرچنٹ، مبشر رجائی، اور میاں میر والا...تینوں میں حاضر کون ہے اور غائب کون؟

اسمٰعیل کو صرف اتنا یاد تھا کہ وہ حاضر ہو یا نہ ہو موجود ضرور ہے، اور اُس کے ماں باپ بھائی بہن، بیوی بچے معدوم ہو چکے... جب کہ وہ آزاد مرد موجود اور معدوم کی منطق سے پرے... غیوب کی رِدا تانے تھا... اور غیوب بھی ایسا کہ غائب ہو کر بھی ''اوئے اسمٰعیلا... اوئے رجائیا'' کر رہا تھا۔

اور یہ سب جب موجود تھے تب بھی ایسے جیسے اجنتا ایلورا کی مورتیاں
خوب صورت، دل کش مگر خاموش!
مورتیوں کے سامنے کوئی غلط آسن سے مباشرت بھی کرے تو وہ کیا کہہ سکیں گی؟

''پس اِس لحاظ سے تو تم بھی مورتی ہوا اسمٰعیل مرچنٹ!'' ہمزاد نے طعنہ دیا اور وہ بلبلا اُٹھا کہ یہ سب کچھ تو اُس پر بیت چکا تھا۔

اب کس سے کہنے جائے، کس دربار کی زنجیر کھٹکھٹائے؟ کہ جن پہ تکیہ تھا وہی پتّے ہوا دینے لگے، ہمت اور انصاف کا مجسمہ ٹوٹ پھوٹ چکا تھا، جب اپنے ہی ہاتھوں تراشے ہوئے بُت تڑختے ہیں تو کرب کی کیسی اَن دیکھی مگر طاقت ور لہر اندر اندر دوڑتی ہے... اسمٰعیل ہی اِسے محسوس کر سکتا تھا۔

''اسمٰعیل بھائی! وہ آزاد مرد ''نہیں'' ہو کر بھی ''ہاں'' کا استعارہ بن گیا۔

اسمٰعیل مرچنٹ خاموش رہا۔

''پانچ دریاؤں کا وہ بہت مضبوط حوالہ بن گیا۔''

تس پر بھی اسمٰعیل چپکا بیٹھا رہا۔

''یہ وہ بُت ہے جس نے اپنے آپ کو تڑخنے اور ٹوٹنے سے بچا لیا۔''

''پر تو کیسا بُت ہے کہ مون سادھے بیٹھا ہے؟'' اسمٰعیل سنتے سنتے چیخ پڑا۔ ''تو بھی تو کچھ بول رجائیے، تو کس کا استعارہ ہے؟ تیرا بُت کون سا ہے؟''

تو مبشر رجائی ہلکے سے مسکرا دیا... اور بس!

اور اس مسکراہٹ پر اسمٰعیل الف ہو گیا... سالا بنتا ہے، گریویٹ مٹین کرتا ہے... ہفتوں سے ساتھ ہے پر ہونٹ جو سیئے ہیں تو دھاگا ٹوٹنے کا نام ہی نہیں لے رہا ہے۔

'اوئے رجائیے! یہ مسکرانے کا موسم نہیں ہے۔'' آواز کی بازگشت گونجی تو مبشر رجائی تڑپ اُٹھا۔

''ہاں قلندر! میں مجرم ہوں، مجھے معاف کر دینا، پر کیا کروں؟ جب سے لالہ اور سرو کے درختوں کا قد کم ہوا ہے اور نظریہ جان سے قیمتی ٹھہرا، تب سے میں وقوعات کے سلسلے میں کچھ ردِّ عمل کا شکار ہو چکا ہوں، چاہے بصرہ اور ہرمز کی گنجان آبادیاں ہوں یا بقا کی وادی، العریش کی بستی، مائی لائی کی سڑکیں یا تیرے شہر کی پناہ گاہیں... جان اپنی اہمیت کیوں کھو چکی قلندر؟ تو بڑی چیز ہے، میں مانتا ہوں کہ تیرے جیسا لال مائیں صدیوں میں جنم دیتی ہیں، آسمان تیرے جیسوں کو برداشت نہیں کر پاتا، زمین تیرے جیسوں کو اپنے اندر سمو کر اور آگ جلا کر اور دریا بہا کر پُرسکون نہیں رہ سکتا... پر تو بھی یہ بھول گیا کہ نظریہ جان کے سبب استوار ہوتا ہے یا جان نظریے کے سبب بچی رہتی ہے؟ انسان اور حیوان کی بات مت کرنا بادشاہو... میں جان کی بات کر رہا ہوں، درد کی بات کر رہا ہوں... لیکن مشکل یہ ہے کہ تیرے جیسے جیوٹ والے دھرتی کے مہان بیٹے مشترک کے بجائے انفرادیت کے رسیا ہوتے ہیں... سو کچھ ایسا ہے کہ اب وقوعات میرے لیے بے معنی ہو چکے ہیں... اس دھرتی پر اتنی مہاماری اور آدمی کی کمزور جان پر اتنے مظالم ہو چکے ہیں کہ اب کسی ظلم پر رونا بھی اِک ڈھونگ لگتا ہے۔

مبشّر رجائی کی خود کلامی پر اسمٰعیل مرچنٹ اُس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''سن برادر!'' مبشر نے جب گریز کی راہ مسدود دیکھی تو بڑے رسان سے بولا... ''تو دیکھ رہا ہے کہ میرے تیرے بیچ گھنی اندھیری رات کھڑی ہے، تو اچھی طرح جانتا ہے کہ ہم تینوں ساتھ چلے تھے، اور وہ بیچ راہ میں ہم سے بچھڑ گیا، ہم وقت کے جس حصار میں گردش کر رہے ہیں، اس میں کوئی پَل اعتبار کے قابل نہیں، کیا پتہ کون لمحہ ہمیں دھوکا دے جائے اور ہم ایک دوسرے کو کھوجتے رہ جائیں، اور ایک دوسرے کا ایک دوسرے کو ملنا تو درکنار، ہمارا اپنا آپ بھی ہمارے اپنے آپ کو نہ ملے، شکاری کتے ہماری کھوج میں ہیں، میرا المیہ تجھ سے بڑا ہے، تو بہرحال اپنی سرحدوں کے اندر ہے مگر میرا مسئلہ تو یہ ہے کہ میں نے ہمیشہ سرحدوں کی نفی کی اور اس جرم کے سبب اپنے یہاں مشکوک گردانا گیا، پس سرحدوں پر سرحدیں پھلانگتا تیری سرحد میں آ گیا مگر ہیہات... ہیہات کہ پروپیگنڈہ بڑی بُری چیز ہے، چہار دانگ عالم میں تیرے عدم تشدّد اور رائے عامّہ کے اُصولوں کا بڑا چرچا ہے... مگر اسمٰعیل مرچنٹ تو... اور وہ... فرید کا چہیتا... جو بیچ راہ میں ہم سے جدا ہو گیا... اُس پروپیگنڈے کے جھوٹ کا پول کھولنے کے لیے کافی ہے... سو اس لمحے کو غنیمت جان

اور جو ہو چکا اُس کو یاد کر کے اس لمحہ غنیمت کو کھنڈت میں نہ ڈال۔

''اوئے رجائیے! اتنی لمبی چوڑی بات نہ کر۔'' اسمٰعیل جھلّا کر بولا... تیرے بارے میں کچھ میں نے بھی تیرے جیسے عالموں سے سن رکھا ہے کہ فتح کے بعد، حد یہ ہے کہ رسم الخط کے بدل جانے کے بعد بھی تیرے یہاں کوئی شاعر ہوا، جس نے عقیدے والی روایت کی دھجیاں بکھیرنے کی کوشش کی اور آنے والوں کو غلیظ کھانے والا بتایا بلکہ ابھی حال ہی میں سنا کہ تیرے یہاں سائرس سے سلسلہ نسب جوڑنے کی کوشش کی گئی جس پر مولانا عبداللہ سرحدی نے تیری قوم کو گمرہی میں گھرا اقرار دیا... اس لیے تو بنیادی طور پر اُسی قوم کا ورثہ ہے جس کے یہاں فلسفے کی بنیاد پر سارا مسئلہ طے ہوتا ہے، مگر ہم لوگ وہ ''ہو کر بھی'' وہ ''نہیں ہیں، پتہ نہیں خدا بنات والا اور اُس کے آگے والوں کا بھلا کرے گا یا برا، مگر ہماری عادت تو صحرائی اور سپاہیانہ ہے، سپاہیانہ روش میں لمحہ غنیمت تو گاہے گاہے میسر ہوتا ہے، پس تو اپنا حال بیان کر، اس لیے بھی بیان کر کہ جو بھیانک رات میرے تیرے بیچ آن پڑی ہے، یہ ٹلنے کا نام نہیں لیتی، شاید اسی طرح یہ رات گزر جائے اور آنے والی صبح کا چہرہ دیکھنا نصیب ہو۔''

''اچھا، جب تو بضد ہے تو ایک بات کر۔'' مبشر رجائی کا انداز ہتھیار ڈال دینے والا تھا، ''تو اپنے کو جمع کر اور اپنا حال تفصیل سے سنا کہ جب سے ہم ساتھ ہیں، بس بھاگ رہے ہیں، ایک دوسرے سے کچھ کہنے سننے کا تو موقع ہی نہیں ملا، کل جانے کون بلا سروں پر آن کھڑی ہو، پس تو بیان کر، پھر میں بھی اپنا حال سنا دوں گا۔''

''بھیا! یہ تو نے بڑی مشکل بات کہہ دی۔'' اسمٰعیل مرچنٹ کی آواز بھاری ہو گئی۔ ''سب جمع جتھا تو لٹ گیا، اب یہ لٹا پٹا کیا جمع کرے اور کیا دکھائے... خیر تو کہتا ہے تو ٹھہر... کچھ دیر انتظار کر!''

یہ کہہ کر اسمٰعیل مرچنٹ تقریباً مراقبے میں چلا گیا۔

مبشر رجائی انتظار کرتا رہا۔

پھر مدتیں بیت گئیں اور اسمٰعیل مرچنٹ نہ لوٹا۔

وہ اُس جنگل سے شہر کی طرف روانہ ہو چکا تھا...

شہر کی فضا مسموم ہو گئی تھی، ۶۰ء کے آس پاس نمایاں ہونے والا مورتیوں کے ساتھ جینے مرنے والا علاقائی بنیاد پسند رہنما زہریلی تقریریں کرتا پھر رہا تھا، اور ہر کمزور اپنے کو ''لنڈیا'' سمجھ کر

سہما ہوا تھا، سہم جانے کی بات یہ بھی تھی کہ چھوٹی چھوٹی غیر اہم بنیاد پسند جماعتیں اُس کے جھنڈے تلے جمع ہو گئی تھیں اور بھائی کو قتل کرنے والے اور باپ کو قید کرنے والے کے مخالف کی یادگار منائی جانے والی تھی، چودہ برس بعد انتظامیہ نے یہ اجازت دی تھی، اور کمزوروں کو یاد تھا کہ چودہ برس پہلے بھی جب یہ دن منایا گیا تھا تو شہر کا سکون برقرار نہیں رہ سکا تھا... اندیشے کی بات یہ بھی تھی کہ دوسری طرف کے بنیاد پسند نے بھی دفاعی تیاریاں شروع کر رکھی تھیں، سارا شہر زرد اور سبز رنگ کی جھنڈیوں سے پٹا پڑا تھا... اور تب پہلی چنگاری پہلے گروپ کے بنیاد پسند نے یوں پھینکی کہ اُس نے سو عظیم آدمیوں کے پہلے عظیم ترین آدمی پر کچھ الزامات عائد کیے اور جواب میں دوسرے گروہ والوں نے اُس الزام لگانے والے بنیاد پسند کی تصویر کو چپلیں پہنا دیں، بظاہر وجہ صرف اتنی ہی تھی ،لیکن سچ پوچھئے تو وہی صدیوں پرانا چوہے بلّی والا کھیل ایک مرتبہ پھر کھیلا گیا۔

بیچارہ اسمٰعیل پریشان تھا کہ شہر میں داخل ہو کر کیا کیا دیکھے۔

چھ سالہ شاہ عالم اپنی آنٹی شمیم بانو کی گود میں روتا ہے کہ اُس کا باپ مار ڈالا گیا، ہزاروں ہزار جلی ہوئی جھونپڑیاں اور تباہ حال لوم پکارتے ہیں کہ... ''ہمیں دیکھو...'' راتوں رات ''مارو جلاؤ بھاگو'' والی تکنیک بتاتی ہے کہ حملہ منظّم اور منصوبہ بند تھا، مقتولوں، گرفتاروں اور زخمیوں کی تعداد بتاتی ہے کہ نیلی کی تاریخ ایک مرتبہ پھر دُہرائی گئی۔

تب ایسے میں بے چارہ اسمٰعیل اپنے گھر کیا جاتا؟

اور کیا دیکھنے جاتا؟

جو کچھ وہ دیکھ چکا تھا، اب اس کے بعد دیکھنے کو باقی کیا رہ گیا تھا؟

چار پہلوانوں نے اُسے پکڑ لیا... اس نے آنکھیں بند کرنی چاہیں تو اُس کی آنکھوں میں مرچیں لگا دی گئیں... ماں چیخی... بہن تڑپی، چھٹپٹائی... چاند جیسی دوست بیوی بھکار مار کر روئی... اس کے آنگن کے جگنو اور چراغ اس کے راج دُلارے بلبلائے... بابا...''

اور وہ سب دیکھتا رہا، سنتا رہا، اور...

آنگن میں لگا چھتنار سایہ دار درخت گرا... فاختہ کی چیخ بلند ہوئی... بلبل کی ٹانگیں چیر دی گئیں... چراغ بجھ گئے...

اور وہ سب کچھ دیکھتا رہا اور سنتا رہا... وہ شاید کبوتر تھا... کبوتر، جو قتل ہوتے وقت بھی قاتل سے

آنکھیں لڑاتا ہے...نہیں، وہ کبوتر نہیں تھا...وہ تو میمنہ تھا مگر اُسے کبوتر بنا دیا گیا تھا...

تب ایسے میں وہ گھر کیا جاتا، وہ گھر نہیں گیا، بیچ راستے سے لوٹ آیا، اور جب رجائی نے پوچھا، ''برادر! تو نے خود کو جمع کیا؟'' تو اُسے وہ شاعر یاد آ گیا جس نے دوسرے ملک میں اپنی نظم ''بھاگ مسافر بھاگ یہاں سے'' یہ کہہ کر سنانے سے انکار کر دیا تھا کہ ''وہ اپنوں کی شکایت اپنوں سے تھی۔''

سو اسمٰعیل مرچنٹ کو بھی مبشر رجائی کی حد یاد آ گئی اور اس نے بڑے رسان سے جواب دیا:

''نہیں بھائی! ابھی بہت گڑبڑ گھٹالا ہے، ایسے میں جمع جتھے کی بات کیا کی جائے...ابھی تو دتا رام چپراسی بلبلا رہا ہے کہ اُس نے تین ہزار قرض لے کر جھونپڑی کھڑی کی تھی، وہ بھی جل گئی۔ مینا بستی کی عابدہ بی بی اور شیاما انگیا موچی یا دونوں کا مکان ایک ساتھ جلا اور ابھی دونوں ریلیف کیمپ میں رہ رہی تھیں، نند کمار گوکھلے سب انسپکٹر کے گھر میں کہرام مچا ہوا ہے کہ گوکھلے اپنے گھر کا واحد کمانے والا نوجوان تھا، اُدھر آدم ٹکنکل اسکول کے سارے لڑکے ابھی تک اسکول میں جمع ہیں کہ ایک مرتبہ تو کتوں کو بھگا دیا مگر کہیں وہ پھر نہ آ جائیں۔

''اے پیارے نیشنلسٹ! کم از کم اُن ۲۷ آدمیوں کو ہی یاد کر لے جو زندہ جلا دیے گئے۔''

مبشر رجائی ہنس کر بولا۔

تو اس پر اسمٰعیل مرچنٹ کو غصہ آ گیا اور وہ بہت جھلّا کر بولا: ''پاگلوں کی نوچا کھسوٹی کا کیا تذکرہ کیا جائے؟...۲۹؍ڈاؤن ہاوڑہ بمبئی ایکسپریس پر تیزاب کے بلبوں سے جو حملہ کیا گیا، وہ کیا تھا؟''

''سنو رجائی!'' پھر اسمٰعیل نے ذرا تھم کر اور رسان سے کہا: ''بات وہی صحیح ہے جو رخسانہ قریشی نے کہا۔''

''تم گریز کر رہے ہو مرچنٹ، اور یہ تمھاری قومی مجبوری ہے۔''

اگر گریز نہ کیا جائے تو ''نئی دنیا'' کی تلاش میں مزید ''نشیمن'' جلائے جائیں؟

''نہیں اسمٰعیل! طریقۂ کار اور اندازِ نظر بدلنے کی ضرورت ہے۔''

'بور مت کرو یار...تقریر کرنے کا موقع ہے، نہ تقریر سننے کا موڈ۔''

''تم کو کچھ دنوں کے لیے ہمارے یہاں بھیج دیا جانا چاہیے۔'' رجائی ہنس پڑا۔

''ہنھ!'' اسمٰعیل نے منھ بنایا...جہاں حافظ کو دیس نکالا مل گیا وہاں میری کیا اوقات؟''

''ہاں یار، سچ کہتے ہو، میرے یہاں تو سارا معاملہ ہی اوندھا ہو گیا، ورثہ اور صدیوں پرانی قومی عادتیں اور تہذیبی روایات...سب تہہ تیغ کر دی گئیں۔

تب اس بات پر محفل میں سنّاٹا آن براجا کہ اسمٰعیل مرچنٹ اور مبشر رجائی دونوں اپنی اپنی دنیاؤں میں گم تھے اور اُن دونوں کے بیچ ایک آواز کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

''سب راستے بند ہیں اور ملاقات کا کوئی امکان نہیں۔''

''ہاں بادشاہو! سب راستے بند ہیں، پر مجھے دیکھو، میں آزاد ہوں۔''

آواز کے ٹھاٹھیں مارتے سمندر پر ایک اور آواز کی سمفنی گونجی، چراغ جلا، لنگر اُٹھا، کشتی چلی مگر مبشّر رجائی اور اسمٰعیل تاسف میں پڑے کہ وہ یار جانی اب صرف آواز تھا اور آواز سے نجات کہاں؟

پس آواز گونجتی رہی اور یہ دونوں سنتے رہے۔

''یار...رجائی! وہ تم کون سی رات کی بات کر رہے تھے؟'' اسمٰعیل پھر پیچھے لوٹا کہ اُس گونجتی آواز میں کچھ تو شامل ہو!

''کس رات کی بات میں کر رہا تھا یار؟''

''وہی رات...جب وہ، وہ ہم سے آن ملا۔''

''ہاں، وہ رات...'' مبشر اتنا کہہ کر چپ ہو گیا۔

''اُس رات کیا ہوا تھا؟''

''ہاں...اُس رات کیا ہوا تھا؟'' رجائی سوچنے لگا اور پھر بہت دیر تک سوچتا رہ گیا۔

''بتاؤ نا، اُس رات کیا ہوا تھا؟'' جب ایک مدت گزر گئی اور رجائی اپنی سوچ کے سفر سے واپس نہ لوٹا تو اسمٰعیل نے اُسے کریدا۔

''یار عجیب بات ہے۔'' رجائی کے لہجے میں حیرت اور افسوس دونوں شامل تھے...''میں وہ رات بالکل بھول گیا...لاکھ یاد کرنے پر بھی وہ رات یاد نہیں آ رہی ہے۔''

''وہ رات تُو بھول گیا؟ حیرت ہے تجھ پر، تو ہی نے مجھے بتایا تھا کہ وہ رات انسانی تاریخ کا ایک انمٹ باب ہے اور اُس رات کی کوئی بات بھلائی نہیں جا سکتی۔'' اسمٰعیل کے لہجے سے تحیّر، تاسف اور تمسخر سب جھلک رہا تھا۔

پر مبشر رجائی کیا کرتا؟ یاد نے اُس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا، اور جس پر وہ رات بیتی، وہ سفر کے دوران اُن دونوں سے جدا ہو چکا تھا اور آواز بن چکا تھا...آواز جو سنی جا سکتی ہے، نہ دیکھی جا سکتی ہے نہ بلائی جا سکتی ہے!

تب اسمٰعیل مرچنٹ نے غنیمت جانا کہ ایسی مشکل گھڑی میں جب وصل کی شب رجائی کے ذہن سے اُتر چکی ہے، وہ رات اُسے یاد ہے جو اُس کے قلعہ بند ہونے کی رات ہے۔

سو اُس نے اپنے دھیان کی باگ موڑی اور اُس رات کی سمت چلا...

''وہ رات جب وہ قلعہ بند ہوا تھا...اسمٰعیل نے دھیان لگایا۔

مگر کچھ دور چل کر رُک گیا...پھر خیال نے قدم اُٹھایا مگر اُٹھایا ہوا قدم کہاں رکھے، یہ خود اسمٰعیل کی سمجھ میں نہیں آیا...خلا میں کہیں قدم رکھا جاتا ہے؟

''وہ رات، جب وہ قلعہ بند ہوا۔'' اسمٰعیل نے پھر دھیان لگایا اور ایک مرتبہ پھر دُھند سے اُس کی ملاقات ہوئی۔

''پروردگار! اسمٰعیل نے بلبلا کر گریہ کیا۔ ''تو نے یہ کیا سخت گھڑی مجھ ناتواں کی تقدیر بنائی کہ وہ رات جب وہ آن ملا تھا، مبشر رجائی کے ذہن سے نکل گئی...اور وہ رات جب وہ قلعہ بند ہوا تھا مجھ عاجز درویش کے سینے میں ٹھہر نہ پائی۔

''اب ہمارے پاس کیا ہے الٰہ العالمین...کیا ہے؟ اسمٰعیل چیخا اور مبشر نے اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

''ہوش میں آؤ برادر! شکاری کتّے ہماری تلاش میں ہیں۔''

تو اسمٰعیل چونک کر چپ ہو گیا اور صورتِ حال کی سنگینی محسوس کر کے پھپھک پھپھک کر اور سسک سسک کر رویا اور گھنی اندھیری رات چاروں اور کھڑی رہی اور ایک آواز کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا رہا۔

سب راستے بند ہیں، ملاقات کا کوئی امکان نہیں۔

سب راستے بند ہیں، ملاقات کا کوئی امکان نہیں۔

مبشر رجائی جہاں تھا وہیں تھم گیا، اس کے اندر ہی اندر ایک درد سا اُٹھا...کیا واقعی ملاقات کا اب کوئی امکان نہیں؟ رجائی نے اپنے چاروں طرف نگاہ کی...وعدہ دیدار کہاں...مگر دیدار کا وعدہ ہی کس

نے کیا؟ عہد و پیماں کا موقع ہی کب ملا؟ پت جھڑ کا موسم جب دروازے پر سر مارنے لگا تو پھر سوچنے کی فرصت کسے ملی؟ تیغِ اُردی نے کیا ملک خزاں مستا...میں سلطنتِ ہجر کا شہنشاہ...دربدری میری قبا...اشک میری دستار، درد میری قبا کا تکمہ، حزن میرا ہتھیار اور افسوس میرا لشکر...میں شیخِ زماں، وقتِ گزراں کا مرید، صبر میری مجبوری اور بے قراری میرا عمل...میں کن جہانوں میں جیتا ہوں...کن جہانوں میں جی سکتا ہوں...کیا جینا میرے اختیار میں ہے؟ میرا اختیار نہ جینے پر نہ مرنے پر...اُٹھ گیا بھمن ودے سے چمنستاں کا عمل...پر چمنستاں پر بھمن ودے کا عمل کب تھا؟ وہ جو جلاوطنی کی موت مرا، اس کے وقت میں؟ نہیں...وہ تو ایک سفید جھوٹ تھا، اور یہ سفید ریش بنیاد پسند بھی ایک جھوٹ ہے۔

جواب کون دے گا؟

آج تک جواب کسے ملا ہے؟ معلوم یہ ہوا کہ...

میں آپ اپنا حجاب تھا...ابنِ عربی سے سارترے تک سوالات کا سلسلہ جاری ہے، الفاظ اور اصطلاحوں کی تبدیلی سے معاملات نہیں تبدیل ہوتے...وجود کی وحدت ہمیشہ سے وہی کہتی رہی ہے جو آج بھی کہہ دینا چاہیے...انا الحق...مبشر رجائی! خاموش رہو، صلیبیں تیار ہیں...ہم کو منظور تنک ظرفی منصور نہیں...سبکِ ہندی والے شاعر تو خوش نصیب تھا کہ تو شعر کی ڈھال کے سبب بچ گیا۔

پر میں کیا کروں کہ کرسی نشینوں کی تلواریں بے نیام ہیں اور میرے پاس کوئی ڈھال نہیں۔

پس میں واجب القتل ہوں اور بھاگتا پھر رہا ہوں۔

اور یہ اسمٰعیل مرچنٹ پوچھتا ہے کہ تم واجب القتل تو نہیں تھے؟

اُسے کیا جواب دوں؟

اُسے کیا جواب دے سکتا ہوں؟

میں بھاگتا پھر رہا ہوں اور سوال میرا تعاقب کر رہا ہے۔

میں کیوں بھاگ رہا ہوں؟

ہاں، بھلا میں کیوں بھاگ رہا ہوں؟

''میں سائرس سے سلسلہ نسب جوڑنے والوں کا حمایتی نہیں تھا، میں نے پیمبرِ بے کتاب کی ایجنسی نہیں لی تھی، میں بڑے شیطان کا پجاری نہیں تھا، میں راک اینڈ رول، تھری ایکس اور فری سیکس

کا شیدائی نہیں تھا، میں بالفور اعلانیہ کو تسلیم کرنے والوں میں نہیں تھا، تہذیب پر مابعدالطبیعات کو قربان کرنے کے بارے میں کبھی سوچا بھی نہیں تھا، میں نے سازش نہیں کی تھی، آزادیِ نسواں کے قانون کی حمایت نہیں کی تھی... لیکن میں بھاگ رہا ہوں... میں کیوں بھاگ رہا ہوں...؟

میں فضائیہ کا ایک معمولی افسر، اپنے فرائض کا پابند شہری مساواتِ انسانی کا قائل فرد، سماج کا ایک کم آمیز اور کم سخن رُکن، خاندان کا ایک ذمہ دار شخص، بال بچوں کا ایک اوسط اوقات والا باپ، ماں باپ کا خیال رکھنے والا بیٹا، بیوی کا ایک وفادار شوہر، خیر وفلاح کے کاموں میں آگے رہنے والا شہری، زندگی کی اصلاح کے سلسلے میں جسم پر روح کو ترجیح دینے والا جان دار، روح کی بالیدگی کے سلسلے میں مابعدالطبیعاتی رویوں کا قائل انسان، مابعدالطبیعاتی سلسلوں میں خیر البشری اُصولوں کا پیرو کار...

میں کیوں بھاگ رہا ہوں؟

کیا صرف اس لیے کہ میں نے تمام عالم کے لیے رحمت بن کر آنے والے کی رحمتوں کے بارے میں کچھ زیادہ پڑھ لیا تھا؟ میں نے ساتھیوں میں تذکرہ کیا تھا کہ اُس کا رویہ تو یہ تھا کہ اُس کے بھائی نے جب ایک دشمن کو قتل کر دیا تو اُس نے خفگی بھرے لہجے میں بھائی سے پوچھا: ''کیا تم نے اُس کا سینہ چیر کر دیکھا تھا؟'' میں اُس کا قول بار بار دُہراتا تھا کہ اُس کا ماننے والا دراصل وہ ہے جس کے ہاتھ اور منھ سے اُس کے کسی دوسرے نام لیوا کو تکلیف نہ پہنچے... کیا اسی لیے؟

میں کیوں بھاگ رہا ہوں؟ اور بھاگ کر بھی مطلع نہ ہونے اور جاننے کا کرب نہ سہنے پر تو قدرت نہ پا سکا، خبریں تو لگا تار مل رہی تھیں، جنگ کا اختتام کہیں نہیں تھا... ہرمز، بصرہ، ابادان، نہاوند... اور اب گردیز، خوشت اور جلال آباد... انسانی جان کے زیاں کی خبریں مسلسل آرہی تھیں، اور ہر ٹیلی ویژن اپنے مخالف کی بربادی کا سماں پیش کر رہا تھا... اور میں اشک کی دستار پہنے، درد کا تکمہ لگائے اور حزن کا ہتھیار باندھے افسوس کے لشکر کا سپہ سالار تھا... اور یہ لشکر بھاگ رہا تھا، کیوں کہ بہشت کے محلوں میں سبقِ عشق کی تکرار نہیں ہو سکتی، پس وحشت کے ویرانے سے موافقت کرنی چاہیے کہ عاشق عشق میں ثابت قدم رہے۔

مگر وہ عالم بہشت کے محلوں کا سبق یاد کراتا ہے اور اُس کے ثنا خواں برصغیر ایشیا میں عشق کو ملعون گردانتے ہیں... اُدھر پاک پٹن کا فریدا کہہ گیا کہ آدمی کے تمام اعضا عشق سے گوندھے گئے

ہیں کیوں کہ یہ تمام ولولہ عشق کا ہے جو عاشقوں میں پایا جاتا ہے اور وہ ازل سے ابد تک ''اَرِنی اُنظُر'' کا دم بھرتے ہیں، اور خود میں نے بھی ''آثار الاولیا'' میں لکھا دیکھا کہ خلیل علیہ السلام کو ایسی محبت تھی کہ محض محبت کی بنا پر فرزند قربان کرتے تھے۔

اُسی وقت بشارت ہوئی کہ ''اے ابراہیم! تحقیق ہو گیا کہ تم میری محبت میں ثابت قدم ہو۔''

''پس لعنت ہو مجھ پر کہ میں ثابت قدم نہ رہ سکا۔'' رجائی بدبدایا اور سسکیوں میں گرفتار ہوا۔

''تو کاہے میں ثابت قدم نہ رہ سکا بھائی؟ کچھ اپنا حال سنا۔'' اسمٰعیل نے اُسے پھر کریدا۔

تِس پر مبشر رجائی پھر مخمصے اور شک میں گرفتار ہوا کہ جانے یہ کون ہے، جس کا نام اسمٰعیل مرچنٹ ہے، کیا یہ واقعی اسمٰعیل مرچنٹ ہے؟ سارے میں مکر کا کاروبار پھیلا ہوا ہے، ایسے میں اُس کے خلوص کی کسوٹی کیا ہے؟ یہ بھی جدا ہو جانے والے ''رفیقِ گمشدہ'' کی طرح سفر کے بیچ ہی ملا تھا، وہ تو جدا ہو گیا، پھر یہ کون ہے جو ہنوز ساتھ ہے۔ اس عرصہ محشر میں، جہاں ہر پل جدائی تقدیر ہے، یہ کیسا رفیق ہے جو جدا نہیں ہوتا!

تب اندر ہی اندر جواب نے بھی سر اُٹھایا... رجائی کو محسوس ہوا کہ وہ اور اسمٰعیل الگ الگ نہیں ہیں۔ شاید کوئی ایک جان دو جسموں میں سانس لی رہی ہے، دربدری دونوں کی تقدیر اور جھما جھم برستا افسوس دونوں کا حاصل، قرب سے دونوں کی جدائی تھی، اور جدائی سے دونوں کا وصل... شاید دونوں اپنے اپنے گلّے سے بچھڑے ہوئے میمنے تھے اور شاید دونوں ایک دوسرے کی تلاش میں تھے۔

عرفانِ ذات کا عمل جب تکمیل کو پہنچا تو مبشر رجائی مخمصے اور شک کے جھگھٹے سے باہر آیا اور دونوں نے ایک دوسرے کو پہچانا۔

''بھائی!'' مبشر رجائی اسمٰعیل مرچنٹ سے مخاطب ہوا۔ ''میری کہانی بہت چھوٹی ہے، جب میں فضا کی انتہائی بلندیوں میں پرواز کر رہا تھا تو میری اور میرے رفیقوں کی چھٹی حس نے خبردار کیا کہ ہماری زمین ہمارے لیے تنگ ہو چکی۔''

''کیوں؟ تمہاری زمین تمہارے لیے کیوں تنگ ہوئی؟''

''کیوں کہ شکاری کتوں کا گھیرا ہمارے گرد تنگ ہوتا جا رہا تھا اور ملک میں موجود دوستوں کی طرف سے ایسے اشارے مل چکے تھے، کہ واپس لوٹ کر ہمارے پاس، سرحدوں پر جا کر بغیر سوچے سمجھے قتل کرنے یا قتل ہونے کے علاوہ اگر کوئی دوسرا چارہ کار تھا تو بس یہی کہ ہم قید خانے کا خیر مقدم

کریں، اس لیے ہم نے اپنا رُخ موڑا اور اہرام کے سائے میں پناہ کے طالب ہوئے۔ مگر ہر جگہ علاقائی یا قومی مفادات انسانی جان اور تحفظ پر غالب آ چکے ہیں، مجبوراً ہمیں وہاں سے اُلٹے پاؤں پلٹنا پڑا۔ آگے بڑھے تو افلاطون اور ارسطو یاد آئے لیکن جو حال عین کا وہی غین کا، لے دے کر ہمارے پاس گاندھی اور سارترے بچے، باقی دوست پتہ نہیں کہ پہنچ سکے یا نہیں، میں کاٹھمنڈو کی ترائی سے نیچے اُتر آیا اور کاسمو پولیٹن کے چکر میں عروس البلاد کا رُخ کیا مگر خبر نہ تھی کہ وہاں بھی مہاماری مچی ہوئی ہے... اور تب ایسے میں تم آن ملے۔''

''اس میں سچ کتنا ہے اور جھوٹ کتنا؟''

''اتنا ہی جتنا تمھارے احوال میں تھا۔'' رجائی نے ہنس کر جواب دیا۔

دونوں پھر تاسّف میں گرفتار ہوئے کہ اب دکھ بھی مکر و منافقت کو گہری نیند نہیں سلا پاتا۔

دونوں تاسف میں گرفتار رہے اور دونوں کے اِردگرد گہری سیاہ اور شاید جامد شب کا خیمہ تنا رہا، اور زمان ایک لامعلوم شئے بنا رہا جو سیّال لہروں کی طرح رواں دواں ہونے کے باوجود ٹھہرا ہوا تھا... پس ایسے عالم میں جب زمان لامعلوم ہو... آدمی کے پاس مکان کے علاوہ بچتا کیا ہے؟

بے در و دیوار کا اک گھر بنانا چاہیے...

اسمٰعیل آہستہ سے گنگنایا، مبشر زیرِ لب ہنس دیا: ''اچھا گاتے ہو!''

پھر اچانک دونوں چپ ہو گئے۔

ٹرک کی گھڑ گھڑاہٹ دونوں نے ہی سن لی تھی —!!

• • •

3

وہ جہاں چھپے ہوئے تھے وہ ایک جنگل تھا۔

دراصل وہ چلے تو تھے عروس البلاد کے لیے مگر جب وہاں بھی خلفشار کی خبر ملی تو وہ بے تھاہ ہو کر انجان رستوں پر مڑ گئے، اور وہ موڑ جو جانا پہچانا نہ ہوا اُس کا اختتام تو ایسے گھنے جنگلات پر ہی ہوتا ہے جہاں سے کوئی راہ کسی طرف نہیں جاتی۔

پس وہ جنگل میں چھپے ہوئے تھے... نہیں بلکہ گھرے ہوئے تھے... اور راستوں کی اُنھیں خبر نہیں تھی... اب جو اچانک ٹرک کی گھڑ گھڑاہٹ سنائی دی تو دونوں چونک کر آواز کی طرف متوجہ ہوئے۔

کچھ دیر بعد، کچھ دور پر ہیڈ لائٹ کی روشنی میں، فوجی گاڑیاں جاتی دکھائی دیں۔

''گویا فوج بلانی ہی پڑی۔'' اسمٰعیل بدبدایا۔

''گویا راستہ گم نہیں ہوا ہے۔'' مبشر کی سرگوشی گونجی۔

اچانک رجائی چونک پڑا... جیسے کوئی بھولی بسری بات یاد آ گئی ہو۔

''اُس یار جانی کے یہاں بھی تو فوج آ گئی؟'' مبشر رجائی کی سرگوشی پھر اُبھری۔

اور اسمٰعیل کی آنکھوں کے آگے جیسے سیکڑوں چاند نکلے، ہزاروں سورج طلوع ہوئے، لاکھوں ستارے جگمگائے... اور یک بارگی سب روشن ہو گیا۔

''یاد آ گئی یار!'' اسمٰعیل نے خوشی سے کپکپا کر مبشر کے بازو پکڑ لیے۔

''کیا؟''

''وہ رات یاد آ گئی... جب وہ ہم سے آن ملا۔''

''ہاں! مجھے بھی یاد آ گئی۔'' مبشر رجائی آہستہ سے بولا، پھر بہت ٹھہر ٹھہر کر بولا۔ ''معاملہ کچھ ایسا ہے اسمٰعیل مرچنٹ کہ یہ کسی ایک رات کی بات نہیں ہے... جب جب جوان ہمارے گھروں

میں داخل ہوتے ہیں، تب تب وہ ہم سے آن ملتا ہے۔''

''پر اس میں تھوڑا سا فرق ہے یارو!'' اُس رفیقِ گمشدہ کی آواز بہت دیر بعد پھر گونجی۔''جب تمھارے گھروں میں فوج داخل ہوتی ہے تو تم اطمینان کا سانس لیتے ہو، اور جب میرے گھر میں فوج داخل ہوئی تو میں نے آنکھیں بند کر کے جان دوست کے سپرد کر دی، اور جب جنازہ اُٹھایا گیا تو میری لاش کے ایک کونے پر ایک سفید کبوتر آ بیٹھا...'' اُڑانے والوں نے اُسے اُڑانے کی بہت کوشش کی مگر وہ نہ اُڑا... تب آواز آئی کہ تم پریشان نہ ہوؤ اور اُسے نہ اُڑاؤ کیوں کہ اس کا پنجہ عشق کے منقار سے جنازے کے کونے پر سی دیا گیا ہے تا کہ وہ ہوا میں ہمارے ساتھ اُڑے... اور جب مجھ سے پوچھا گیا کہ تیرا رب کون ہے؟ تو میں اُن کی طرف دیکھ کر ہنسا... جس نے بادشاہ کو جواب دے دیا وہ غلاموں سے کیا خوف کھائے گا؟

اور جیوں ہی وہ قلندر اِس مقام پر پہنچا... مقامِ فنا پر ایستادہ ہوا۔

اور سارا عالم تحیر میں گرفتار ہوا کہ یہ درویش جسے بغداد کے باہر دجلہ کے کنارے سربسجود ہونا چاہیے تھا... اس نے فنا سے کیسی یاری کی کہ کفن کے باہر پیر ہلتا تھا اور کفن کے اندر اُس کا پتہ نہ تھا۔

تب اُسی لمحہ... مبشر رجائی اور اسمٰعیل مرچنٹ پر یہ روشن ہوا کہ وہ یار جانی...''رفیقِ گمشدہ''... آواز کا پیکر اور فرید کا چہیتا نہ اُن سے الگ ہوا، نہ موڑ مڑا بلکہ دراصل وہ اپنی آگ کا خود نوالہ بنا۔

پس جب تک آگ روشن ہے، تب تک اُس کی جگمگاہٹ بھی برقرار ہے۔

مگر سوال یہ ہے کہ یہ آگ کب تک؟

اور آگے کا قصہ کچھ یوں ہے کہ جب فوجیں فسادیوں، قاتلوں، دہشت پسندوں اور اُن کے ہتھیاروں کی تلاش میں، جنگلوں میں داخل ہوئیں اور جنگل کے اُس گوشے تک پہنچیں، جہاں مبشر رجائی اور اسمٰعیل مرچنٹ نے پناہ پکڑی تھی تو وہاں اُن دونوں میں سے کوئی نظر نہ آیا۔ البتہ کچھ کاغذات ضرور ملے، جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

پہلا کاغذ: خط بنام سکریٹری اقوامِ متحدہ

[پورا خط سادہ، کہیں کچھ نہیں لکھا گیا، صرف دستخط کی جگہ خون میں ڈوبے انگوٹھے کا نشان]

دوسرا کاغذ: خط بنام وزیرِ اعظم۔

[خط پر صرف ایک سطر تحریر ہے... مضمون حسب سابق ہے]

تیسرا کاغذ: مرثیہ یار جانی۔

ہوا سے کہو، اپنے بال کھولے، پانی سے کہو، اپنی باڑھ مارے، مٹی سے کہو، اپنے کو پریشان کرے، آگ سے کہو اپنے کو پشیمان کرے کہ کئی صدیاں گزر چکنے پر پیدا ہونے والے لعل نے اپنی آنکھیں بند کیں۔

اے شورہ پشت آسمان! تیرے ستاروں کی روشنی کم ہو کہ تو رذیلوں کا دوست ہے۔

اے خاکِ لئیم! تیری قوتِ نمو ختم ہو کہ تو نے اپنے لعلِ بدخشاں لٹا دیئے۔

اے انسانِ ضعیف البُنیان! تیری ماں تیرا ماتم کرے کہ تو نے مکر سے شیر کا شکار کیا۔

اے آنکھ! خون بہا کہ شجاعت ظلم اور سازش سے ہار گئی۔

اے ہاتھ! سینہ پیٹ کہ ہاتھ بڑھا کر اپنا حق چھیننے والا نہیں رہا۔

اے پیر! لُنج ہو کہ میدان کارزار میں نبرد آزما ہونے والا رخصت ہوا۔

اے سر! احترام میں جھک کہ نہ جھکنے والا سر کٹ چکا۔

اے قلم! اُس کا مرثیہ لکھ جس کی تاریخ لکھنے کے لیے وقت منتظر ہے۔

[اتنا لکھ کر لکھنے والے نے اوپر لکھا، سب کچھ کاٹ دیا تھا اور نئے سرے سے لکھا تھا]

جنس کو تمام جذبات کی اصل بتانے والا ہمارا رہنما بن سکتا ہے۔

وہ ہماری دانش کا قطب نما بن سکتا ہے جس کے نزدیک ''ایفائے عہد'' سیاست داں کی کمزوری ہے۔

سُپر مین کے چکر میں ابلیس، ہٹلر اور مسولینی کی تعریف کی جا سکتی ہے۔

قاتل ہیرو کی کرسی پر بیٹھ سکتا ہے۔

لیکن اے گبرو جوان! میں تیرا ماتم نہیں کر سکتا کیوں کہ میں ایک بزدل اور ڈرپوک آدمی ہوں، اور بزدل کو کسی بہادر کی تعریف یا ماتم کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔

اے گبرو جوان! میں تیرا ماتم نہیں کر سکتا کہ میں پروپیگنڈہ ریج میں ہوں اور فی الحال پروپیگنڈے پر اقتدار حاوی ہے۔

اے گبرو جوان! آ ہم رخصت ہوں، اپنی راہ چلیں اور آنے والے وقت کا انتظار کریں جو سب سے بڑا منصف ہے۔

[اتنا لکھ کر لکھنے والے نے اوپر لکھا، سب کچھ کاٹ دیا تھا اور نئے سرے سے لکھا تھا]

ماتم اُس شعلہ جوّالہ کا جو اپنی آتشِ شوق کا لقمہ تر بنا۔

ماتم اُس قدِ رعنا کا جو گھر سے سج دھج کر چلا اور بیچ راہ میں بے ستر ہو گیا۔

ماتم اُس لعلِ بدخشاں کا جو کوئلے کے ڈھیر میں جا پڑا۔

ماتم اُس شیریں دہن کا جس نے دشنام طرازی شعار کی۔

ماتم اُس درویش کا جو بے خوفی کی راہ چلا اور دل شکنی کے دام میں گرفتار ہوا۔

ماتم اُس قلندر کا جس نے فقر کا نعرہ بلند کیا اور حرص و ہوا کے کوچے کو جا نکلا۔

[اتنا لکھ کر لکھنے والے نے اوپر لکھا، سب کچھ کاٹ دیا تھا اور نئے سرے سے لکھا تھا]

ماتم اُن جانوں کے زیاں کا، جو نظریئے کی بھینٹ چڑھیں۔

[اتنا لکھ کر لکھنے والے نے اوپر لکھا، سب کچھ کاٹ دیا تھا اور نئے سرے سے لکھا تھا]

ماتم اُن تمام مرنے والوں کا جو نظام کے جبر کا شکار ہوئے۔

جوانوں کو اس کے علاوہ کچھ نہ ملا۔

البتہ جوانوں سے دور... اُن کی نظروں سے اوجھل... سڑک کی طرف، اندھیرے کا حصہ بنے ہوئے... دو ہیولے نپے تُلے انداز میں بڑھ رہے تھے اور انتہائی آہستگی کے ساتھ آپس میں باتیں کر رہے تھے۔

''برادر! رات ابھی تک ویسی ہی اندھیری کی اندھیری ہے، اور وہ ہماری تلاش میں ہیں۔''

''ہاں رجائی تیرا نام فریب ہے۔''

اس پر رجائی کچھ نہ بولا اور دونوں بڑھتے رہے... یہاں تک کہ سڑک کے کنارے پہنچ گئے۔

''اچھا برادر! ہمیشہ کی طرح تجھے ایک مرتبہ پھر خدا کو سونپا۔'' رجائی نے اسمٰعیل کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''اور تو؟'' اسمٰعیل نے کپکپا کر پوچھا... اُسے یاد آیا کہ یہ آخری سہارا ہے... خواہ یہ فریب ہی کیوں نہ ہو!''

''میں تو اپنے کوچے کو جاتا ہوں۔''

''وہاں تو لوگوں کو زبردستی سرحدوں پر بھیج دیا جاتا ہے۔''

''سو تو ہے۔''

''وہاں تو ورثہ، قومی عادتیں، تہذیبی روایات، سب تہہ تیغ کر ڈالی گئیں۔

''ہاں... وہ بھی صحیح!''

''پھر تو!''

''تیرے یہاں بھی کچھ زیادہ مختلف صورتِ حال نہیں ہے۔''

اس پر اسمٰعیل کیا کہتا... چپ رہا... کچھ دیر بعد صرف اتنا پوچھا... ''پہنچ سکو گے؟''

''تم تو جانتے ہو... میرا نام رجائی ہے۔''

مبشّر رجائی نے آہستہ سے جواب دیا اور آگے قدم بڑھاتا ہوا سڑک پر چاروں طرف پھیلے اندھیرے کا ایک حصہ بن گیا۔

''ہاں بھائی، تیرا نام رجائی ہے... پر میرا نام تو اسمٰعیل ہے... ایسا انسان جس کا بدل میمنہ ہوتا ہے۔'' اسمٰعیل مرچنٹ نے دھیرے سے خود کلامی کی اور جنگل کی طرف مڑ گیا۔

''میری تقدیر؟'' ایک سوال سانپ کی طرح ذہن میں رینگا۔

''صحرا... جنگل!'' سانپ ہی کے جیسی پھنکار گونجی اور اسمٰعیل بے اختیارانہ کچھ سوچے سمجھے بغیر پچھلے ٹھکانے کی طرف دوڑ پڑا۔

سارا جنگل قدموں کی چاپ اور سرسراہٹ سے گونجتا رہا مگر اسمٰعیل بے تابانہ دوڑتا رہا، پھر اپنے پرانے ٹھکانے پر پہنچ کر مانو تھونس کر بیٹھ گیا... سانس دُھکنی کی طرح چل رہا تھا، خوف کی پھنکار اُس کے اندر باہر... چاروں طرف سر مار رہی تھی۔

جب وہ قدرے پُرسکون ہوا تو اپنے اِردگرد نگاہ کی۔

اندھیرے میں نظر کیا آتا... خاک؟... صرف ہاتھ سے ٹٹول ٹٹول کر یہ اندازہ کیا کہ جوانوں نے تلاش کا کوئی امکان باقی نہیں چھوڑا... بس اچانک ٹٹولتے ٹٹولتے ہاتھ کاغذ کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے پر پڑ گیا جسے اسمٰعیل نے بے سوچے سمجھے اپنی جیب میں ڈال لیا۔

پھر آہستہ آہستہ ہاتھ اپنے عمل سے باز آیا اور تھکان غالب ہوئی۔

اسمٰعیل یوں بے خبری کی نیند سویا جیسے فساد میں گھرے لوگ ریلیف کیمپ میں آ کر حالِ مستقبل سے بے نیاز ہو کر سوتے ہیں۔

تازہ صورتِ حال یہ تھی کہ مبشر رجائی اندھیری سنسان سڑک پر، اپنے کوچے کی طرف بڑھنے کا شعبدہ، خود کو ہی دکھانے میں مصروف تھا... چاروں طرف فضاؤں میں ایک آواز گونج رہی تھی... اوئے اسمٰعیلا... اوئے رجائیا... اور اسمٰعیل کی جیب میں کاغذ کا وہ ٹکڑا پڑا ہوا تھا جس پر مبشر کی تحریر ثبت تھی...

"میرا نام مبشر رجائی ہے!"

بحرِ ہند سے گنگا جمنا کے کناروں تک ایک آواز گونج رہی تھی...

کوس کوس پر پہرہ بیٹھا... پینڈ پینڈ ہٹ مار... ہے وِدھنا! کیسا رچ دینی... ہے وِدھنا کیسی رچ دینی...

سارے میں آواز مسلسل گونج رہی تھی اور اسمٰعیل سویا ہوا تھا!

• • •

4

جب اسمٰعیل جاگا!

اسمٰعیل مرچنٹ کی بیداری ابھی ایک مشکوک عمل ہے، ویسے یہ صحیح ہے کہ اگر وہ جاگا نہیں ہے تو سویا ہوا بھی نہیں ہے... وہ نہ جانے کتنی مدت اِسی کیفیت سے دوچار رہا... نیم خواب... نیم بیداری۔

تپتا سورج سر پر انگارے برسا رہا تھا اور فضاؤں میں چنگاریاں اُڑ رہی تھیں... اسمٰعیل کو یاد آیا، پچھلا سارا کچھ جو بیت گیا، مگر جو بیت گیا، کیا وہ واقعی بیت گیا؟ جیسا کچھ بیتا کیا ویسا کچھ کہیں اور نہیں بیتا؟ جو بیتا، کیا آئندہ وہ نہیں بیتے گا؟

اسمٰعیل نے سر جھٹکا... اصل مسئلہ یہ تھا کہ اب کیا کیا جائے؟

اسمٰعیل نے اندازہ لگایا، فضا کی تمازت میں ذرا بھی فرق نہیں آیا تھا، اُس نے اپنے چاروں طرف نگاہ کی... وہی گھنا جنگل... اُس گھنے جنگل میں ایک تنہا پرندہ... اور اُس کے گرد شکاری... کتّے!

رات والی آواز پھر سنائی دی۔ اُس نے لپک کر سر اُٹھایا اور دیکھا۔

فوجی گاڑیوں کا رُخ ابھی بھی اُس کے شہر کی طرف تھا۔

درد کی ایک گھٹا اُٹھی، جھکی، برسی، وہ پور پور بھیگ گیا... کب تک چلے گا یہ سارا کچھ؟ لہو مانگتا ہے ارزانی... اب اس سے زیادہ ارزاں کیا ہوگا؟ زمین تیری پیاس کب بجھے گی؟ آدمی تو یہاں چھپا بیٹھا ہے، فوجیں کسے بچانے جا رہی ہیں؟

اسمٰعیل کو اپنے آپ پر ہنسی آ گئی... گویا صرف میں ہی آدمی ہوں؟

"مگر وہاں کون ہے؟ اسمٰعیل نے سوچا... چھتنار درخت، فاختہ، بلبل، شمع... کیا بچا؟

اس کا جی چاہا، وہ چیخ چیخ کر گائے:

میں صحرا کی اک ٹھونٹھ ببول

مرے دامن میں کانٹے

مرے ماتھے پر دھول
مرا چہرہ، راکھ میں تپتا
آگ میں جلتا
ماٹی ہوتا پھول
میں سادھو
خوب بھبھوت ملے
اوگھڑ کا ترشول
میں صحرا کی ایک ٹھونٹھ ببول
مرا مصرف حرفِ فضول...حرفِ فضول!
فضول! فضول!!

مگر وہ گا نہ سکا...گاتا بھی کیسے...وہ آگاہ تھا کہ اُس کی پناہ گاہ خطروں میں گھری ہوئی ہے۔

اس کی پناہ گاہ خطروں میں گھری تھی، وہ خطروں میں گھری پناہ گاہ میں تنہا تھا...سب سنگی ساتھی چھوٹ گئے!

اسمٰعیل آپ ہی آپ گریہ میں گرفتار ہوا، ''اب میرا گھر کہاں ہے؟ وہ گھر کہاں ہے جہاں چھتنار درخت ہر پل سایہ کرنے کو اپنی شاخیں پھیلائے رکھتا تھا... جہاں فاختہ بلبل مور...جیسے ساون رُت جھک جھور... جہاں ٹھنڈی ٹھنڈی شمع جلے...کوئی چہرہ چہرے پہ جھکے... ہر رات ڈھلے...''

اسمٰعیل کو اِک اِک بات یاد آ رہی تھی...اس کا گھر، ماں باپ، بیوی بچے، بھائی بہن، دوست، امن اور شانتی کے ساتھ جینے والے پڑوسی، اس کے اپنے شہر کے معصوم لوگ، اُس کے اپنے خواب، اُمنگیں اور آرزوئیں...انسانی زندگی ہے کیا؟ جب آدمی ہوش سنبھالتا ہے تو ایک طرف برسوں کی قربت کچھ لوگوں کو رگِ جاں سے زیادہ قریب محسوس کراتی ہے تو انسان اپنی صبحیں اور شامیں اُن کے ساتھ گزارنا چاہتا ہے... پھر دوسری چیز...اس کے اندر موجود آگے بڑھنے، زقند بھرنے اور پرواز کرنے کی جبلّت...یہی جذبہ پرندوں کو فضاؤں میں محوِ پرواز رکھتا ہے اور آدمی کو خوب سے خوب تر کی جستجو میں مشغول کرتا ہے۔اسمٰعیل کو یاد آیا، وہ بھی ساری زندگی انہی دو کیفیتوں کے حصار

میں رہا، مگر اب نٹ راج شاید اپنا آخری رقص کر رہا ہے...اور کالی، اور دُرگا...اور چنڈی...''

پھر اُسے یاد آیا...سادھوی رُکمنی؟

اچانک اسمٰعیل نے چونک کر اوپر دیکھا۔

ایک پرندا اپنی مکروہ آواز میں چیخا اور اپنے پر پھیلائے اُس کے اوپر سے گزرا۔

''گدھ...ایک اور تمثیل۔'' اسمٰعیل کو ہنسی آ گئی پھر جانے کیا سوچ کر اُداس ہو گیا۔

فضا تو پہلے ہی سے اُداس اور بھیانک ہو رہی تھی۔

پھر دن ڈھلا، شام ہوئی، رات آئی، پھر دوسرا دن طلوع ہوا، اور وہ بھی بیت گیا، مگر جب تیسرا دن نمودار ہوا تو اسمٰعیل کو محسوس ہوا کہ اب آنتیں کٹ کٹ کر گرنے لگیں گی...وہ مسلسل بھوکا تھا اور دو دنوں سے اپنی پناہ گاہ سے حالات کا جائزہ لے رہا تھا، اندازہ ہوا کہ کل شام سے فوجوں کا جانا رُک گیا تھا...شاید سپلائی مکمل ہو چکی۔ مگر اُس کے شہر میں کیا ہو رہا تھا، اس کی اُسے کچھ خبر نہ تھی۔

حالات انتہائی تشویش ناک تھے، اسمٰعیل مرچنٹ کا شہر جلتا ہوا کھنڈر بن چکا تھا.... وہ تو کسی طرح اس جلتے ہوئے کھنڈر سے خود کو باہر نکال سکا تھا...مگر اب؟ کہ فوجوں کی لاریاں پر لاریاں اُس کے شہر کی طرف روانہ ہو چکیں، اور اِدھر بھوک اُس کی جان لینے کے درپے...ایسے میں یہ فیصلہ مشکل تھا کہ وہ کیا کرے... اِسی جگہ پڑے رہنے کی صورت میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جانے کا امکان تھا لیکن باہر نکلنے کی صورت میں اس بات کی بھی تو کوئی ضمانت نہیں تھی کہ جوانوں یا بلوائیوں کی کوئی گولی اُسے چاٹ نہ لے۔

''ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جانے سے بہتر ہے کہ گولی کھا کر مرا جائے۔'' اسمٰعیل بالآخر ایک فیصلے تک پہنچ ہی گیا۔

جب وہ جنگل سے باہر سڑک پر آیا تو شام کا جھٹپٹا پھیل چکا تھا اور سائے طویل ہو گئے تھے، اُس نے تھوڑی دیر سڑک پر کھڑے ہو کر اندازہ لگایا تو اُسے احساس ہوا کہ وہ شہر کی سرحد سے تقریباً تین چار کلومیٹر کی دوری پر ہے، اُس نے اطمینان کا سانس لیا اور چلنا شروع کیا، تھوڑی دور تو وہ جذبے کے بَل پر تیز رفتار سے چلتا رہا، پھر بھوک جذبے پر غالب ہوئی، پھر پیاس نے بھوک پر ایسا غلبہ حاصل کیا کہ اسمٰعیل زمین پر گر گیا۔

حلق میں کانٹے چبھ رہے تھے، آنکھوں کے آگے ستارے کوند رہے تھے، اور آسمان پر

ستارے نکل آئے تھے۔

اسمٰعیل پر پھر گریہ طاری ہوگیا... مرا مصرف حرفِ فضول... میں صحرا کی ٹھونٹھ ببول...''

پھر ذرا شانت ہوا تو اِدھر اُدھر نظر دوڑائی... کچھ نظر نہ آیا... پھر اچانک چونکا... کچھ آواز آ رہی تھی... کیا ہے؟ کیا ہے؟ کیسی آواز ہے؟ اُس نے کان لگایا... لگا ترل ترل کچھ بہہ رہا ہے... جیسے پانی بہہ رہا ہو... پانی ہے؟ ہاں ہاں پانی ہی ہے!

پیاس نے ایک مرتبہ پھر پوری شدت سے حملہ کیا... یاد آیا، شہر سے ڈیڑھ دو کلومیٹر کی دوری پر ایک نہر بہتی ہے... ستارہ سا چمکا... یقیناً وہی ہے... اسمٰعیل کے روئیں روئیں میں کچھ میٹھی میٹھی سی سنسناہٹ دوڑ گئی... برسوں سے بچھڑے محبوب کی آواز سنائی دے تو کیسا لگتا ہے؟

اسمٰعیل آواز کے رُخ پر رینگنے لگا۔

جانے وہ کب تک رینگتا رہا... وہ سب بھول کر بس رینگتا چلا جا رہا تھا... اُسے بس اتنا یاد تھا کہ کسی بھی طرح نہر تک پہنچ جانا ہے۔

نہر کے کنارے پہنچ کر اُسے اتنی تاب نہیں رہی کہ وہ چلّو سے پانی پیتا، وہ پیٹ کے بَل لیٹا ہوا منہ سے پانی پی رہا تھا... چپڑ چپڑ کی آواز مسلسل گونج رہی تھی... اسمٰعیل پانی پی رہا تھا اور اُسے اس کا بھی ہوش نہیں تھا کہ پانی پینے کی یہ آواز اُس کے لیے خطرناک بھی ہوسکتی ہے۔

انسانی زندگی میں کچھ ایسے لمحے بھی آتے ہیں جب وہ سب کچھ بھول جاتا ہے، اپنی ابتدا کی طرف لوٹ جاتا ہے، یوں کہ تہذیب کے تمام طریقوں کو پسِ پشت ڈال کر اپنی بالکل ابتدائی اداؤں اور معصومانہ شباہت کے ساتھ اپنا اظہار کرتا ہے۔

پانی پی کر اسمٰعیل پر غنودگی سی طاری ہوگئی، وہ وہیں نہر کے کنارے سو گیا۔ اسمٰعیل کب تک سویا رہا، یہ تو اُسے یاد نہیں تھا پر جب آنکھ کھلی تو جھٹپٹے کا سماں تھا، ہلکی ہلکی ملگجی روشنی... صبح کاذب کے دھندلکوں میں اس نے دیکھا... پرندے اپنے اپنے آشیانوں سے نکل کر رزق کی تلاش میں روانہ ہو رہے تھے، بھور کی ٹھنڈی ہوا تمام طرفوں میں بہہ رہی تھی، اور نہر کا پانی ہلکورے لے رہا تھا...

اسمٰعیل کو بہت اچھا لگا... کئی دنوں سے وہ جن بھیانک اور تکلیف دہ حالات کا سامنا کر رہا تھا، اس میں آج پہلی مرتبہ صبح سویرے کی ٹھنڈی ہوا اور خوب صورت فضا نے ذرا کمی کر دی، اس کا جی چاہا وہ یوں ہی پڑا رہے، اور سارا کچھ اسی طرح ٹھہرا رہا۔

مگر لمحے کو ٹھہراؤ کہاں میسر؟

سورج آہستہ آہستہ اپنے پروں پر تیز جلتے بھبکتے انگارے رکھنے لگا، ہوا حسبِ عادت پنکھے جھل جھل کر آگ کی لو تیز کرنے کے لیے تیار ہوتی نظر آنے لگی... اسمٰعیل نے اپنے چاروں طرف نگاہ کی اور اُسے یاد آیا کہ یہ پناہ گاہ نہیں ہے، یہاں جب سورج دیوتا کی سواری اُترے گی تو پھر کہیں پناہ نہیں ملے گی۔

وہ رُکتا، ٹھٹھکتا، بچتا بچاتا، چھپتا چھپاتا، حالات کا جائزہ لیتا، اِدھر اُدھر دیکھتا، آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا، شام ہوتے ہوتے شہر کے آس پاس پہنچا۔

پہلے اُس نے دور دور سے اندازہ لگایا اور احساس ہوا کہ شہر کی صورتِ حال میں ٹھہراؤ آ چکا ہے۔

مگر؟ اسمٰعیل نے سوچا... کیا صورتِ حال اتنی بہتر ہو چکی ہے کہ شام سر پر آن کھڑی ہونے کے بعد بھی کوئی کسی کو نہ روکے؟ اگر کسی نے سوال کیا: ''کون ہو تم؟'' اچانک اُس کی نگاہ اپنے آپ پر گئی، تقریباً دس دنوں کے بعد اُس نے اپنے آپ کو دیکھا... اپنے پر نظر کی تو احساس ہوا کہ اُس کا حلیہ تو کسی بھکاری سے بھی زیادہ بدتر ہو رہا ہے... پھر آپ ہی آپ اُس کے ہاتھ اس کے گالوں پر گئے... وہ ہر دن شیو کرنے کا عادی تھا۔ خود بخود اُس کے قدم شہر کے باہر والی درگاہ کی طرف مڑ گئے۔

یہاں وہ اس سے پہلے بھی کئی بار آ چکا تھا۔ لوگ یہاں بلا تفریق مذہب جوق در جوق آتے تھے اور شاید اُنہیں تسکین ملتی تھی... چار پانچ بیگھوں میں پھیلا احاطہ، چاروں طرف قد آدم دیواریں، آگے کی طرف بڑا سا محراب نما گیٹ، جس میں شٹر لگا ہوا تھا، مشرق و مغرب کا سنگم، دروازے پر دربان، بڑے سے محراب نما دروازے کے بعد اونچی برجیوں والی دالان، دالان کے دونوں طرف بڑے بڑے کمرے، پھر آگے بہت بڑا میدان، میدان کے بیچوں بیچ بلند و بالا گنبدوں والا روضہ، جس کے چاروں طرف زائرین کے بیٹھنے کے لیے بہت وسیع احاطہ، اور اُس کے بیچ حضرت کا مزار ایک خوب صورت حجرے میں، حجرے کے اندر دیواروں پر آیات اور طغرے... سرّیت میں گھرا ماحول... اسمٰعیل کو یہ سارا کچھ اپنی ذرا ذرا سی تفصیلات کے ساتھ یاد تھا۔

یہ بھی یاد تھا کہ وسیع میدان کی ایک سمت میں مجاورین و زائرین کے آرام کرنے اور ٹھہرنے

کے لیے کئی کمرے بھی بنے ہوئے ہیں، اور دوسری سمت مطبخ بھی ہے، جہاں دونوں وقت منوں کھانا پکتا ہے۔

مطبخ کا خیال آتے ہی اُسے محسوس ہوا کہ وہ بھوکا ہے۔

بھوک کے احساس نے اُس پر مزید نقاہت طاری کردی۔

اُس نے اپنے قدم تیز کیے، مگر احساس ہوا کہ وہ تیز قدم نہیں چل سکتا۔ اب شام کا ملگجا اندھیرا پھیل چکا تھا، اُسے دور سے دُھند میں گھری درگاہ کی برجیاں دکھائی دیں... بے اختیارانہ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی، بے پناہی کے بعد پہلی پناہ... یاد آیا کہ جب حضرت زینب مدینہ پہنچی تھیں تو روضے پر نظر پڑتے ہی چیخ اُٹھی تھیں... یا جداہ!''

''میں تو اس لائق بھی نہیں۔'' اسمٰعیل کا جی بھر آیا۔

اس کے اندر ایک عجیب سا احساس جاگا... ایسا کیوں ہے؟ آدمی اپنے کو پورا کیوں نہیں کر پاتا ...آدھا ادھورا کیوں جیتا ہے؟ کیڑے کی طرح رینگتا ہوا... پھر ایک دن موت اُسے آدبوچتی ہے ...وہ خود کیا کسی کیڑے سے زیادہ ہے؟ ایک ہفتے سے تو وہ رینگ رہا ہے، اور موت اُس کو دبوچنے کے لیے مسلسل اُس کے تعاقب میں ہے۔

''لیکن میں اب تک زندہ ہوں۔'' اُس کے اندر ایک بھرپور توانائی کے احساس نے سر اُٹھایا۔

''موت مجھے نہیں چھوسکی... موت مجھے نہیں چھوسکتی!''

اچانک وہ چونک اُٹھا۔

فوجی گاڑی کی ہیڈ لائٹ کا ایک پورا فوکس اس پر پڑا، اور اُس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

کہتے ہیں کہ شیر پر شکاری کی ٹارچ کا پورا فوکس پڑتا ہے تو پھر وہ حرکت بھی نہیں کر پاتا... مگر شاید یہی معاملہ مچھر کے ساتھ بھی ہے... سوال یہ ہے کہ اس لمحے میں اسمٰعیل کیا تھا؟

ابھی اِس کا جواب ممکن نہیں مگر سامنے کی بات یہ ہے کہ فوجی گاڑی کی ہیڈ لائٹ کا فوکس پڑتے ہی وہ گنگنا گیا، خوف کی ایک بہت ہی تیز لہر اُس کے اندر سے اُٹھی، اس کے پورے وجود پر چھا گئی، اُسے ایسا لگا کہ جیسے دس دن کی ساری محنت پل بھر میں خاک میں ملنے والی ہو، تب اچانک اُس لمحے میں اُس پر اس کا اپنا آپ کھلا... مکار اور خود غرض اپنا آپ... جس نے خود کو کسی طرح بچالیا ...مگر اپنی جان دے کر اپنے پیاروں کو نہ بچا سکا... اُسے لگا اگر یہ وقت نہ ٹل سکا تو پھر سارے کیے

کرائے پر پانی پھر جائے گا۔

اُس ایک لمحے میں اُس کے اندر سے ایک دوسرا اسمٰعیل برآمد ہوا، جس نے پل بھر میں بچاؤ کے سیکڑوں طریقے سوچے اور ردّ کیے اور جب فوجی اسمٰعیل کے پاس پہنچے تو وہ دوزانو بیٹھا جھوم رہا تھا...

''حق سرّہ... حق سرّہ...'' جانے کہاں سے قمری کا بول اُسے یاد آگیا، اور وہ جھوم جھوم کر ذکر کے انداز میں وِرد کرنے لگا... حق سرّہ... حق سرّہ...''

داڑھی بڑھی ہوئی، کپڑے پھٹے ہوئے، بھوک کی نقاہت چہرے سے عیاں... اُس پر بھی جھوم جھوم کر حق سرّہ کا وِرد... حالاں کہ ایک جونیئر نے چیک کرنا چاہا، مگر انچارج نے ڈانٹا...'' آدمی کو پہچاننا سیکھو!''

''بابا! درگاہ میں چلے جائیے... یہاں خطرہ ہے۔'' انچارج نزدیک آکر بولا۔

بن مانگے موتی ملے، مانگے ملے نہ بھیک... اسمٰعیل جلدی سے اُٹھا مگر لڑکھڑا گیا۔

انچارج نے اشارہ کیا... جوانوں نے اُسے سہارا دے کر گاڑی میں بٹھایا اور درگاہ کے گیٹ تک پہنچا دیا۔

احاطے کے اندر داخل ہو کر اُس نے ایک لمبا سانس کھینچا... اُس نے اس ہفتہ عشرہ میں ایک پوری زندگی جی لی تھی۔

موت اِک ماندگی کا وقفہ ہے... کیا صرف موت ہی ماندگی کا وقفہ ہے؟ اس کی یہ زندگی کیا واقعی زندگی ہے؟ اسمٰعیل کے ذہن میں سوال کا سانپ پھر سرسرایا۔

رات سر پر کھڑی تھی، درگاہ میں قمقمے جل اُٹھے تھے، مختلف جگہوں پر ملنگوں کی ٹولیاں بیٹھی ہوئی تھیں... چاروں طرف اونچی اونچی برجیوں والی دالان، سامنے بلند گنبدوں والا روضہ، میدان کی ایک سمت میں مجاوروں اور زائرین کے رہنے کے لیے کمرے... پچھلی مرتبہ انہی کمروں میں سے ایک میں وہ ٹھہرا تھا... دوسری سمت مطبخ!

مطبخ کا خیال آتے ہی ایک مرتبہ پھر بھوک نے پوری شدت سے حملہ کیا۔

''لنگر تو شاید عشا کے بعد بٹتا ہے، ابھی تو مغرب کی اذاں ہوئی ہے؟'' اس نے اپنے کو سمجھایا۔

مگر پھر ایک بات ذہن میں آئی، ''مطبخ دالان کے اِس احاطے سے کچھ دور پر ہے... کسی

طرح وہاں تک جانا ہے... لائن میں لگنا ہوگا۔''

عشار کی اذان ہوتے ہی اس نے رینگنا شروع کیا، کچھ ہی دور گیا ہوگا کہ پیچھے سے ایک نوجوان ملنگ لپکتا ہوا اُس کے پاس آیا۔ ''کیا بات ہے بابا؟ چلا نہیں جاتا؟''

اس نے انکار میں سر ہلایا۔

''کہاں جاتے ہو؟''

اس نے نوالہ منھ تک لے جانے کا اشارہ کیا۔

''مگر اُس میں تو ابھی آدھ گھنٹے سے زیادہ کی دیر ہے، نماز کے بعد بٹے گا۔''

''جانے میں دیر لگے گی۔'' اُس نے نقاہت کے سبب بڑی دشواری اور آہستگی سے کہا۔

''اوہ!'' نوجوان ملنگ نے سر ہلایا پھر بولا ''بابا! تم یہیں رہو، میں تمھارا کھانا لے آؤں گا۔''

اسمٰعیل کی آنکھیں نم ہوگئیں... وہ فوجی، اور پھر یہ نوجوان ملنگ... ذرا نم ہو تو...''

ملنگ کھانا لے آیا اور اسمٰعیل جیسے کھانے پر ٹوٹ پڑا۔

بھوک کی شدّت کا یہ عالم تھا کہ ملنگ نے اپنے حصے کا بھی کچھ کھانا اُسے دے دیا مگر اُس کے باوجود لگ رہا تھا کہ بھوک ابھی زندہ ہے... پانی پینے کے بعد لگا کہ اُس پر نشہ سا طاری ہوتا جا رہا ہے، تمام رگ و پے میں ایک عجیب سی سنسناہٹ، جس کو کوئی نام دینا مشکل، سرور کی کیفیت، آنکھیں نشے سے بوجھل، جھکی جھکی، کچھ دیر تو اُسے ہوش رہا پھر وہ اپنے آپ سے گزر گیا، جہاں اُس نے کھانا کھایا، وہاں سے ایک قدم بھی آگے نہ بڑھ سکا... ساری رات بے سدھ ہو کر سوتا رہا، جیسے کھویا ہوا بچہ اپنی ماں کے دامن میں آجائے۔

اچانک بھور کے وقت... فجر کی اذاں ابھی نہیں ہوئی تھی صبح کی سمندری ہوا خوشگوار نمکین خنکی کا سبب بنی، ٹھنڈی ہوا کے جھونکے سمندر کی لہروں کو روضے کی دیواروں تک لاتے اور پھر دور پھینک دیتے، پرندے درختوں کی ڈالیوں سے آہستہ آہستہ اُڑ رہے تھے اور نیم اُجالے میں روضے کی گنبد اور سفید عمارت رومانس پیدا کر رہی تھیں۔

فجر کی اذاں ابھی نہیں ہوئی تھی، جھٹپٹے کے اِس عالم میں خود اسمٰعیل بھی نیم بیداری کی کیفیت سے گزر رہا تھا، پچھلی رات پیٹ بھر کر کھانے کا خمار ابھی پوری طرح ٹوٹا نہیں تھا کہ اچانک وہ چونک پڑا۔ اس نیم اُجالے کی کیفیت میں وہ دنیا جہان کی باتیں سوچ رہا تھا اور جانے اَنجانے

انگنت مناظر اُس کی پلکوں کے دوار کو آآ کر چھو رہے تھے اور جا رہے تھے کہ اسی کیفیت میں اچانک وہ نظر آ گیا... لمبا کرتا، پگڑی اور بغل میں کرپان... وہ آہستہ آہستہ اُسی کی طرف بڑھ رہا تھا.. وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا.. ''میاں میر والا؟'' اس نے آنکھیں کھول کر دیکھیں... ہاں بالکل وہی تھا... عین مین اُس کے سامنے۔

''مگر تم تو جوانوں کے ہتھّے چڑھ گئے تھے؟'' بے ساختہ اس کے منھ سے نکلا۔

''تمھارا قصّہ گو میرے ذکر کو قوسین میں قید کر کے سمجھتا ہے کہ میں تمھاری داستان کے مرکزی دھارے سے الگ ہو جاؤں گا؟''

''اُس کی بات چھوڑو، اس کی اپنی مجبوریاں ہیں، مجھے بتاؤ، تم تو جوانوں کے ہتھّے چڑھ گئے تھے؟''

''جس نے بادشاہ کو جواب دے دیا ہو، وہ خادموں سے کیا خوف کھائے گا؟''

''مگر یہاں کیسے؟''

''میاں میر والے کو تو آج یا کل یہاں آنا ہی تھا..'' پھر وہ قہقہہ مار کر ہنسا... ''اپنی سنا... پھر ایک نیا سوانگ؟ ڈھونگی ملنگ؟''

''بھائی، یہ سوانگ نہیں مجبوری ہے۔''

''ابے جا جا... سینے پر ناخن رکھنے سے باپ کو قید کرنے تک... تیری قوم نے ہر ڈھونگ کو مجبوری کا نام دیا۔''

''کس سے باتیں کر رہے ہو بابا؟'' نوجوان ملنگ کی نیند ٹوٹ گئی تھی۔

''اپنے آپ سے۔'' اسمٰعیل آہستہ سے بولا اور لیٹ گیا... چاروں طرف آواز گونجتی رہی...

''ڈھونگی ملنگ!''

اسمٰعیل ایک مرتبہ پھر تنہا تھا... کیا تماشہ ہے... یہ سب میرے پاس آتے ہی کیوں ہیں؟ وہ مبشر رجائی اور یہ میاں میر والا... یہ مجھ پر طنز کرتے ہیں، مگر ان دونوں نے مسلسل دھوپ چھاؤں کا جو کھیل میرے ساتھ جاری رکھا ہے، اِس کا حساب کون لے گا؟

وہ فراڈ... مبشر رجائی... ہر کڑے وقت پر صحرا میں پانی کی آس بنا... پھر معلوم ہوا، سراب تھا۔

یہ میاں میر والا؟ پاک پٹن اور فرید کوٹ کی دہائی دے گا مگر معاملہ کرتے وقت ہمیشہ دو گز دور

سے ڈائیلاگ مارے گا۔

مگر سچ یہ ہے کہ یہ میاں میر والے کی یک طرفہ ڈائیلاگ بازی ہے...ہم دونوں کے درمیان تو مکالمہ کب کا ختم ہوگیا...اسی مکالمہ کے خاتمے نے پاک پٹن اور فرید کوٹ کی دوری بڑھا دی۔

اب دن چڑھ آیا تھا اور روضے میں چہل پہل بھی شروع ہوگئی تھی، اسمٰعیل نے دس بارہ دنوں میں آج پہلی مرتبہ اپنے کو پوری طرح چاق و چوبند محسوس کیا، آج اُس کے حواس اپنی پچھلی جولانی کے ساتھ بیدار تھے۔

''بابا...منھ ہاتھ دھولو۔'' نوجوان ملنگ نے اُس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ چونک پڑا۔

اُسے بہت پرانی بات یاد آ گئی...ایک سے دو بھلے!

اندر ہی اندر کسی فیصلے تک پہنچنے کے لیے جنگ جاری تھی...وہ خموشی سے اُٹھا...منھ ہاتھ دھو کر ناشتے کی لائن میں لگ گیا۔

''لو پیو گے؟'' ناشتے کے بعد نوجوان ملنگ نے سوال کرتے ہوئے بیڑی بڑھائی تو اُسے ہنسی آ گئی...بیڑی تو کبھی اُس نے پی ہی نہیں تھی...مگر سگریٹ کے لیے پیسہ چاہیے...اُس نے چپ چاپ بیڑی سلگا لی۔

اندر اندر کسی فیصلے تک پہنچنے کے لیے جنگ جاری تھی۔

شہر کے حالات کا اثر روضے پر بھی پڑا تھا، باہر سے آنے والے صفر تھے، بس جو احاطے کے اندر رہ گئے تھے، رونق اُنہی کے دم سے تھی...شیخ کے روضے میں حسبِ معمول قوالی ہو رہی تھی...

سب سکھین میں چز موری میلی
رکھیو لاج ہماری نجام!

''سب راستے بند ہیں؟'' اچانک اسمٰعیل کو لگا اس کا دم گھٹ جائے گا۔

مولانا عبداللہ سرحدی تو مزارات پر جانے سے منع کرتے تھے، اُس کے باپ کے پیر میاں نے کئی کتابوں کا حوالہ دے کر بتایا تھا کہ یہ غلط نہیں ہے۔ خیال آیا کہ حمایتی یا مخالف دونوں کے پاس تو حوالہ موجود ہے تب صحیح کون ہے اور غلط کون؟ اور یہ بھی کہ صحیح غلط کا فیصلہ کون کرے گا؟

''کیا فضول خبط مجھ پر سوار ہوگیا ہے۔'' اسمٰعیل نے سر جھٹکا۔ ''صحیح غلط خدا جانے سکون تو بہر حال ملتا ہے!''

قوال گا رہا تھا ؎

سونا لاون پیو گئے، سُونا کر گئے دیس
سونا ملانا پیو ملے، رُوپا ہو گئے کیس

اچانک ایسا لگا کہ اسمٰعیل برسٹ کر گیا...جلتے بجھتے ہزاروں سورج اُس کے روبرو ہو گئے...اور وہ...جیسے بھس میں کسی نے چنگاری پھینک دی...وہ بھک سے جل اُٹھا...وہ روضے سے فاصلے پر تھا مگر اُسے یاد نہیں رہا کہ وہ روضے تک کیسے پہنچ گیا...وہ مزار کی پائنتی میں بجلی کے جھماکوں کی طرح رقص کر رہا تھا...پچھلا سارا گزرا زمانہ فلیش بیک میں اُس کے سامنے جھماکے کر رہا تھا...اور قوال گا رہا تھا..نہ سونا ملا نا پیو ملے...''

قوال گاتا رہا اور وہ رقص کرتا رہا...این وآں کا ہر بندھن توڑ دینے والا رقص..''

وہ مسلسل ناچتا رہا..قوال مسلسل گاتا رہا...نا سونا ملا نا پیو ملے...

ابھی کتنے دِنوں کی بات ہے، بیوی نے کہا تھا: ''شادی میں جانا ہے، ایک کم وزن کا بالا بنوا دیجیے، جو ہر وقت پہنے رہوں...'' بیٹی سے وعدہ کیا تھا: ''اگلے مہینے تمھارا ڈرائنگ سٹ ضرور آ جائے گا...'' بیٹے سے بازی لگی تھی: ''کلاس میں فرسٹ آؤ گے تو سائیکل دلوا دوں گا۔''

وہ مزار سے لپٹ لپٹ کر روتا رہا۔

''اب کوئی تقاضہ نہیں ہوگا...اب کوئی وعدہ پورا نہیں کرنا ہے...اب کسی کو کلاس میں فرسٹ نہیں آنا ہے...''

نا سونا ملا نا پیو ملے۔

ناچتے ناچتے اور روتے روتے وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

ہوش آیا تو اس نے خود کو متولّی کے کمرے میں پڑا پایا..نوجوان ملنگ اُس کے پاس بیٹھا تھا۔

اس سے پہلے کہ وہ حالات کو سمجھ پاتا کمرے کی دیواریں پھٹ گئیں، پھر روضہ کی دیواریں شق ہوئیں، پھر مزار بیچ سے چاک ہو گیا اور اُس نے متولّی کے کمرے میں لیٹے لیٹے دیکھا...مزار میں صاحبِ مزار کی جگہ میاں میر والا لیٹا تھا۔ اس نے دیکھا کہ صاحبِ مزار بھی اُس کے بازو میں لیٹے ہیں اور کہہ رہے ہیں: اِس کا پنجہ عشق کے منقار سے جنازے کے کونے سے سی دیا گیا ہے تاکہ یہ ہمارے ساتھ ہوا میں اُڑے...'' اسمٰعیل مرچنٹ ایک مرتبہ پھر چیخ مار کر بے ہوش ہوگیا۔

ہوش آیا تو متولی صاحب اُس پر جھکے ہوئے، کچھ پڑھ پڑھ کر اُسے دم کر رہے تھے، نوجوان ملنگ اُسے پنکھا جھل رہا تھا... کچھ لوگ ذرا دور سے اُسے متفکر نظروں سے دیکھ رہے تھے... ایک کنارے قوال گا رہا تھا... ''نا سونا ملا نا پیو ملے...''

وہ جی کھول کر، پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا، کچھ دیر بعد متولی صاحب نے اُسے معانقہ دیا، کچھ پڑھ کر اُسے پھر دم کیا، جب وہ بالکل پرسکون ہو گیا تو سبھی لوگ بیٹھ گئے۔ مجلسِ سماع اختتام کو پہنچی۔

رات میں، عشاء کی نماز اور لنگر وغیرہ کی تقسیم کے بہت دیر بعد:

چاروں طرف سناٹا سا چھایا ہوا تھا، زیادہ تر فقراء سو چکے تھے، چند ٹولیوں میں بٹے ہوئے خوش گپیوں میں مصروف تھے، ایک دو مجذوب قسم کے فقراء لا الہ، اللہ ہو... اور ہو حق کا نعرہ بلند کرتے تو فضا میں چند ثانیہ کے لیے کچھ ارتعاش سا پیدا ہوتا، پھر وہی چپ... رات کا گہرا سناٹا... درگاہ کی دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر واپس ہونے والے سمندر کے تھپیڑے۔ تب ایسے میں اچانک نوجوان ملنگ نے اسمٰعیل کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''تم کون ہو؟''

خوف کا ایک بھیانک یا شاید کوئی قاتل لمحہ اُس کے سامنے آن کھڑا ہوا، وہ سر سے پیر تک کانپ گیا، دل دہلا دینے والا ایک خوف ناک بے پیکر ہیولیٰ... ڈراکیولا... شمر، زیاد، راون... یا اسپین سے اِخراج کا آخری پل!

نوجوان ملنگ اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اور اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے پوچھ رہا تھا... ''تم کون ہو...'' اور اسمٰعیل خوف و تشکیک کے جہنم میں آدھا دھنسا سوچ رہا تھا... یہ کون ہے؟

''مم... مم... میں... میں فقیر ہوں...'' اس نے بڑی مشکل سے جملہ ادا کیا۔

نوجوان ملنگ ہنس پڑا۔ ''دیکھو بابا! تم سب کو دھوکا دے سکتے ہو، مگر مجھے نہیں... میں نے بھی بہت عذاب جھیلے ہیں۔''

''نہیں بھائی! میں کوئی دھوکا نہیں دے رہا ہوں۔''

''ارے بابا! پاگل آدمی۔ کم از کم اپنی بات کا انداز تو فقیروں جیسا کر لیا ہوتا۔''

اِس پر اسمٰعیل چونک پڑا... ''تو پھر یہ ملنگ کون ہے، جو لہجے کے فرق کے مسئلے پر گفتگو کر رہا ہے۔''

''بھیونڈی سے بھاگے ہو؟'' نوجوان ملنگ نے آخر سیدھا حملہ کر ہی دیا۔

اسمٰعیل پھر چونکا۔ اب کے اُس پر باضابطہ کپکپاہٹ طاری ہو گئی۔

نوجوان ملنگ نے اُس کے کاندھے تھپتھپائے... ''گھبراؤ مت...'' پھر آہستہ سے بولا... ''میں بھی فسادات کا مارا ہوں!''

اتنا سننا تھا کہ اسمٰعیل کو لگا، اس کا بندھ ٹوٹ گیا، وہ نوجوان ملنگ سے لپٹ کر پھوٹ پڑا... وہ نوجوان ملنگ اُس کا کون لگتا تھا؟ بھائی، دوست، رشتہ دار، پڑوسی، شناسا... کچھ بھی تو نہیں... مگر پھر بھی اُسے لگا جیسے کسی جلتی سلگتی دوپہر میں میلوں سفر کرتے کرتے اچانک کوئی سایہ دار درخت، یا ٹھنڈے پانیوں کا کنواں، یا کسی بڑھیا کی جھونپڑی نظر آ گئی ہو... گھائل کی گت گھائل جانے۔

وہ روتا رہا اور ملنگ اُسے سنبھالتا رہا۔

بیچ بیچ میں گاہے گاہے ملنگ بھی اپنا غم یاد کر کے بے قابو ہو جاتا لیکن جلد ہی سنبھل جاتا، دونوں کی کہانی تقریباً ایک تھی۔ اسمٰعیل کا غم تازہ تھا، ملنگ کا غم پرانا لیکن یادوں کی دھوپ نے اُسے پھپھوند لگنے سے بچا لیا تھا۔

پھر دوسرے دن ملنگ اُسے لیے ہوئے متولی کے پاس گیا اور متولی سے اسمٰعیل کی ساری بپتا بیان کی، متولی نے اُسے تسلی دی، صبر کی تلقین کی پھر رخصت کرتے ہوئے ملنگ ہی جیسا ایک لباس اُسے بھی عطا کیا۔ لباس پہن لینے کے بعد جب وہ متولی کے سامنے آیا تو متولی نے بہت سنجیدگی اور ہمدردی سے سمجھایا... ''یہاں یہ لباس وہی پہنتا ہے جو کسی نہ کسی پیر سے مرید ہو جاتا ہے۔ کوئی پوچھے تو کہہ دینا، تم مجھ سے مرید ہو گئے ہو!''

بعد میں نوجوان ملنگ نے بتایا کہ اُس کو بھی متولی ہی نے ایسا لباس دیا تھا اور دیتے ہوئے یہی کہا تھا، مگر اُس نے سوچا کہ اب پچھلی زندگی میں رکھا کیا ہے؟ اپنے شہر میں نہ کوئی بچا نہ کچھ بچا، پھر کسی نئی زندگی کی شروعات کا کیا معنی؟ خیال آیا کہ جب یہاں پیٹ بھر رہا ہے اور سکون مل رہا ہے تو یہاں سے کہیں اور جانے کا کیا حاصل...؟ پھر بعد میں مرید ہونے کی خواہش جاگی تو جی میں آیا کہ اِس رحم دل متولی میں کیا برائی ہے؟

اسمٰعیل خاموش رہا، مرید و رید کا معاملہ اس کے حلق سے اُترتا ہی نہیں تھا۔

لیکن اسمٰعیل نہ چاہنے کے باوجود ملنگ بن چکا تھا اور جب کئی ملنگوں اور فقراء نے دریافت کیا تو اسمٰعیل کے کچھ کہنے سے پہلے نوجوان ملنگ نے جواب دے دیا... ''ہاں بابا سے مرید ہوئے

ہیں۔''

اسمٰعیل خوش تھا کہ وہ جھوٹ بولنے سے بچ گیا۔

زندگی لشٹم پشٹم گزرتی چلی جارہی تھی کہ پھر ایک دن اُتھل پتھل مچ گئی۔

وہ احاطے میں کسی سنسان مقام پر چپ بیٹھا ہوا تھا کہ اچانک آوازیں گونجنے لگیں...''

''اوئے اسمٰعیلا...اوئے اسمٰعیلا جاگ...اسمٰعیلا جاگ...ہوش میں آ...جاگ...جاگ...''

پھر یہ آوازیں مسلسل آنے لگیں...ہر ایک دو دن پر..کبھی کئی کئی دن مسلسل...

میاں میر والا کہتا کچھ نہیں...صرف آواز لگاتا رہتا...''اسمٰعیلا...اسمٰعیلا...''

اُسے احساس ہوا کہ اس سے اب نجات شاید ممکن نہیں...میاں میر والا آواز بن چکا تھا!

آواز کو قید نہیں کیا جاسکتا، اُسے باندھا نہیں جاسکتا، اُس کو ٹکڑے ٹکڑے نہیں کیا جاسکتا، اس کو ختم نہیں کیا جاسکتا، اس کو بیچا نہیں جاسکتا، اس کو خریدا نہیں جاسکتا، اس پر اپنی مرضی تھوپی نہیں جاسکتی، کمزور اور پست ہو تو اُس کو مضبوط اور بلند نہیں کیا جاسکتا، اس کی تصویر نہیں بنائی جاسکتی، اُس میں رنگوں کی آمیزش نہیں کی جاسکتی، آواز کو قید نہیں کیا جاسکتا۔

آواز کبھی صحراؤں میں گونجتی ہے، کبھی سبزہ زاروں میں، کبھی آبادیوں میں، کبھی ویرانوں میں، کبھی خوشی میں جھوم جھوم کر کبھی غم میں پھوٹ پھوٹ کر، کبھی چھاؤں میں، کبھی دھوپ میں، کبھی رنگ میں، کبھی روپ میں، کبھی سوز میں، کبھی ساز میں، کبھی تہہ بتہہ کسی راز میں، کبھی خواب خواب سکوت میں کہ وہ خود ہے اپنے ثبوت میں، کبھی گوش زد تو دراُ کبھی، کبھی پاس میں تو وراُ کبھی، وہ صدا صفت وہ صدا نما، وہ عجیب شئے ہے خدا نما، کہ بظاہر دیکھو تو کہیں موجود نہیں مگر سننے والے کان اور سمجھنے والا دماغ ہو تو پھر اس کا لطف محسوس کرو اور عش عش کرو کہ قدرت نے اس دنیائے دنیٰ کو بھی کیا کیا نعمتیں عطا کی ہیں، کہ اگر یہ قلم دفتر کے دفتر بھی سیاہ کر ڈالے تو شاید اُس کی عطا کا بیان مکمل نہ ہو...

مگر مشکل یہ ہے کہ انسان کے لیے بھٹک جانا اور بھٹک کر بے نام یا بدنام ہو جانا کوئی امر عجیب نہیں ہے...کیسا معاملہ پیش آیا، فرعون، نمرود، یزید اور اُس کے بعد والوں کے ساتھ کہ آج کوئی اُن کا نام لیوا باقی نہ بچا۔

''ذہن کے بہاؤ کا بھی عجیب عالم ہے۔'' اسمٰعیل نے سوچا، یاد آیا میاں میر والا، اور پھر یاد کی رو پہنچ گئی متولی صاحب کی کل کی تقریر تک!

مگر یہ فرعون، نمرود، یزید کیوں یاد آگئے؟ اسمٰعیل نے سوچا۔

''ستم کی رُت میں ستم گر کی یاد!'' اسمٰعیل کو ہلکا سا جواز ملا۔

پھر ستم کی رُت میں ستم کی یاد بھی آ گئی...وہ رات جب بے پناہ ہو کر اسمٰعیل کو اپنا گھر چھوڑنا پڑا، پتہ نہیں اب کس حال میں ہے، کس بے پناہی اور بے سروسامانی کے عالم میں بھاگنا پڑا...ماں دفن کی، بہن دفن کی، بیٹی دفن کی، بیوی دفن کی اور جب بیٹے کے قتل کی خبر ملی تو اپنے آپ سے ڈر لگنے لگا...اسمٰعیل تم کون ہو؟ اسمٰعیل تم کیوں ہو؟ کیا تم زندہ ہو اسمٰعیل؟ تم زندہ کیوں ہو اسمٰعیل؟

سانپ اُس کا پیچھا کر رہا تھا اور وہ سانپ کی طرح اندر اندر سر اُٹھانے والے شدید درد کے گرد لپٹتا جاتا تھا...جو ہوا، اس پر میرا کیا اختیار؟ تمھاری اپنی موت پر تو تمھارا اختیار ہے؟ حرام موت؟ کیا یہ زندگی اب تم پر حلال ہے؟ سانپ بار بار پھنکارتا رہا..تم زندہ کیوں ہو اسمٰعیل؟ تم زندہ کیوں ہو اسمٰعیل؟

پھر یوں ہوا کہ وہ اپنے آپ پر اپنے ہی حملوں سے تنگ آ کر، دروازہ کھول کر باہر آ گیا... بلوائیو! دیکھ لو، میں زندہ ہوں، مجھے بھی مار ڈالو...دنیا یہی سمجھے کہ میں شہید ہو گیا..مگر واہ ری قسمت ...سب ''مارو جلاؤ بھاگو'' کی اسٹریٹجی کے تحت کسی اور علاقے کی طرف شاید جا چکے تھے...اور وہ بچ گیا...ناقابلِ یقین بات، مگر ایسا ہوا، شاید حملہ آور اُس کے تڑپنے کا تماشا دیکھنا چاہتے تھے...پس اسمٰعیل بچ گیا!

اسمٰعیل جب بچ جاتا ہے تو کیا ہوتا ہے؟

اُس پر گھنے اندھیرے کی کئی صدیاں گزر جاتی ہیں...گھنے اندھیرے سے جھوجھنا شاید اسمٰعیل کی تقدیر ہے!

پس اسمٰعیل تھا...اسمٰعیل تنہا تھا مگر اسمٰعیل تھا!

اعلان کی گونج قائم تھی! ''میں اسمٰعیل سے ایک بڑی قوم پیدا کروں گا۔''

مدتوں پر مدتیں گزرتی رہیں، منظر پر منظر بدلتا رہا، اعلان کی گونج قائم رہی...اسمٰعیل بظاہر کہیں منظر نامے پر دکھائی نہیں دے رہا تھا، پھر بھی کہیں نہ کہیں اسمٰعیل تو تھا، ہاجرہ ختم ہو گئیں، نیو کی اینٹ بن گئیں...قیدار کا گھرانا نام و نشان والا بنا...اسمٰعیل نے روپ بدل لیا تھا مگر اسمٰعیل تھا۔

ہر عہد میں، کسی نہ کسی روپ میں...اسمٰعیل موجود رہتا ہے۔

حالات پُرسکون ہوجانے کے بعد درگاہ کی رونق پھر لوٹ آئی تھی، باہر والوں سے پتہ چلا کہ زندگی پھر پہلے کی طرح رواں دواں ہوگئی ہے... عجیب چیز ہے یہ زندگی بھی، دوب کی طرح دب دب کر نکلتی ہے، انکرتی ہے، اُبھرتی ہے، سر اُٹھاتی ہے، نکھرتی ہے... زندگی انجمن آرا و نگہبانِ خود است... جسے زندگی کا خون ایک مرتبہ منھ لگ جاتا ہے، وہ اِس شرابِ ناب سے پھر تو بہہ کہاں کر پاتا ہے!

اسمٰعیل کے اندر کا پندار جھٹپٹایا۔

''ماں باپ، بیوی بچے سب ختم ہوگئے، اب اگر وہ بھی مرگیا تو اس کا خاندان؟ نہیں میں زندہ رہوں گا۔

اسمٰعیل نے جینے کی خواہش کی، جینے کی خواہش پہ اُسے دنیا کا خیال آیا، دنیا یاد آئی تو اپنا گھر یاد آیا، گھر یاد آیا تو یہ بھی یاد آیا کہ موجودہ علاقے میں تو وہ صرف چالیس پچاس برسوں سے رہ رہا تھا ...دادا آئے تھے!

''مگر میں تو بہر حال یہیں کی مٹی سے جنما ہوں۔'' زمین نے کھینچا۔

پھوپھی اسمٰعیل کی مٹی اُس پر سخت ہوچکی تھی، وہ اس مٹی سے پرے کی مہک نہ سونگھتا تو کیا کرتا؟ آدمی ماضی تو تب بھولتا ہے جب حال اور مستقبل ماضی سے بہتر ہو... یہاں تو حال بے حال تھا اور مستقبل بے نشان... پس وہ پلٹا تو پیچھے ہی پیچھے چلتا گیا... بہت دور تک... ایسا لگا جیسے اُس کا باپ اُس کے سامنے مجسم آن کھڑا ہوا ہو... اور پھر یوں ہوا کہ جانے کب کب کی صبحیں اور شامیں اُس پر ٹوٹ ٹوٹ کر برسیں، کبھی رِم جھم، کبھی دھواں دھار۔

کئی دنوں تک یہ عالم رہا کہ اسمٰعیل تھا بھی اور نہیں بھی تھا... کبھی اُسے وہ مٹی پکارتی جس سے وہ جنما تھا، کبھی وہ علاقے اُسے آواز دیتے جہاں سے اُس کا باپ یا شاید دادا اِس علاقے میں آیا تھا... اُس کے باپ نے اپنے خاندان کے بارے میں بھی جب نہ تب تھوڑا تھوڑا کرکے اسمٰعیل کو بہت کچھ بتا دیا تھا۔

آپ اپنا گھر اور علاقہ چھوڑ کر ادھر ہی کیوں بس گئے؟

''بیٹا، جی ٹوٹ گیا۔ تمھارے سوتیلے چچا نے مکروفریب اور زور زبردستی سے مجھے ساری جائیداد سے بے دخل کر دیا... کبھی موقع ملے تو میری صندوقچی میں ایک کاپی ہے، اُسے دیکھنا۔

مگر وقت نے اِس کا موقع کہاں دیا؟ وہ تو پیسہ کمانے کے چکر میں ایسا پھنسا کہ پلٹ کر کچھ دیکھنے کا موقع ہی نہیں ملا۔

اور جب موقع ملا تو؟... تو اَب دیکھنے کو کچھ باقی نہیں رہا!

ملنگ کئی دنوں سے اسمٰعیل کا رنگ ڈھنگ دیکھ رہا تھا... اپنے آپ میں گم صم اسمٰعیل... کبھی اُداس اسمٰعیل... کبھی آپ ہی آپ مسکراتا اسمٰعیل...''

''اسمٰعیل کس دھن میں گم ہو؟'' آخر ایک رات ملنگ نے دُکھتی رَگ پر انگلی رکھ دی۔

''ابا اماں کا گھر پکار رہا ہے؟''

''مطلب؟''

''میرے ابا میاں اس علاقے میں آ کر بس گئے تھے۔ اُن کا اصل گھر یہاں نہیں تھا۔''

''کہاں تھا؟''

''ابا مشرقی بہار کے کسی گاؤں کے تھے اور اماں پٹنہ کی۔''

''ارے واہ! تب پھر تمھارے اور رشتہ دار؟''

''دادیہال کی خبر نہیں ماموں زندہ ہیں۔''

''کہاں ہیں؟''

''شاید پٹنہ میں رہتے ہیں۔''

''پیارے! تب یہاں کیوں ہو؟ یہاں سے نکلو!''

''نکلنا تو ہے مگر سوال یہ ہے کہ جاؤں کہاں؟''

''اپنے باپ دادا کے صوبے میں چلے جاؤ۔''

''کیوں؟ وہاں کیوں؟''

''لوگ بتاتے ہیں کہ فرقہ وارانہ لحاظ سے، سب سے پُرسکون علاقہ وہی ہے۔''

''اور پڑوس والا... بنگال؟''

''وہ بھی ہے... مگر وہاں زبان کا مسئلہ تمھارے لیے دشواری پیدا کر سکتا ہے۔''

''ہاں، یہ تو ہے!''

اسمٰعیل اور نوجوان ملنگ کی باتوں میں کافی وقت گزر گیا، سارے ملنگ اور فقرا، سو چکے تھے

...درگاہ کی دیواروں سے سمندر کا پانی ٹکرا ٹکرا کر آرہا تھا اور جارہا تھا، درگاہ کے رہائشی علاقے اور درگاہ کے درمیان کی سڑک ہمیشہ کی طرح اُس رات بھی سمندر میں غرقاب تھی، رات کسی پراسرار ہیولے کی طرح اس کے سامنے آدھی کھلی آدھی چھپی پتہ نہیں کھڑی تھی یا پڑی تھی ...مگر تھی ...اور اسمٰعیل وقت کی مکر چال سے مبہوت تھا...گزشتہ چند مہینوں میں اس نے شاید زندگی کی کئی صدیاں گزار لی تھیں۔

مبشر رِجائی اور میاں میر والا پھر یاد آئے۔

اسمٰعیل بہت دیر تک اُن دونوں کے بارے میں سوچتا رہا۔

اُسے ایک بات کا شدت سے احساس ہوا کہ نسبتاً مبشر رجائی زیادہ صحیح ہے، میاں میر والا تو ایک کیفیت کا نام ہے، صرف ایک اضطراری احساس جو کبھی کبھی بے اختیارانہ عمل میں بھی ڈھل جاتا ہے۔

جینے کے لیے مبشر رجائی ہی قابلِ قبول ہے۔

''مگر وہ تو بھاگتا رہتا ہے؟'' ایک سوال نے سر اُٹھایا۔

''تو ٹھہرا ہوا کیا ہے؟'' آپ ہی آپ جواب کی کلی کِھلی۔

آخرکار، رات کے آخری حصے میں، آنکھ بند ہوتے ہوتے، اسمٰعیل نے فیصلہ کرلیا۔

''ایک سفر اور!''

5

ٹرین اپنی پوری رفتار کے ساتھ آگے کی طرف بھاگ رہی تھی اور اسمٰعیل شاید اس سے بھی زیادہ تیز رفتار سے پیچھے کی طرف بھاگ رہا تھا—

اُس کی پیدائش تو ۱۹۴۸ء کی تھی، مگر باپ نے اُس کا نام لکھواتے وقت اُس کا سنِ پیدائش ۱۹۵۱ء لکھوایا۔ باپ کو شاید اُس وقت یہ اُمید نہ رہی ہوگی کہ اسمٰعیل ساری کلاسیں سال بہ سال پاس کرتا چلا جائے گا۔ اُن دنوں وہاں کا ماحول بھی تو کچھ عجیب سا تھا۔ اُسے یاد آیا، باپ بتایا کرتے تھے کہ ۱۹۴۷ء کے بعد مسلمانوں پر ایک شدید قسم کا خوف اور شاید اِسی خوف کے سبب بے عملی طاری ہوگئی تھی۔ اُس کے دادا ۱۹۴۷ء سے قبل اِدھر آئے اور کسی لوم میں معمولی کاریگر کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ زندگی ٹین کا خالی ڈبّہ تھی۔ پھر دادا بہار آئے اور یہیں مر گئے۔ باپ کو پڑھنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ پھر بھی اسمٰعیل کو حیرت ہوتی۔ اسمٰعیل کے باپ نے اپنے چاروں سمت پھیلی کائنات کو آپ ہی آپ پڑھا۔ یا شاید وقت اُن کا استاد بنا۔ اسمٰعیل نے جب ہوش سنبھالا تو اُس نے باپ کو ہمت اور صبر کے ساتھ ایک سخت محنت کرنے والے مزدور کی حیثیت سے دیکھا جو بولتا کم تھا مگر جس کا ہر قدم سوچا سمجھا ہوتا۔

اسمٰعیل پر اُس نے بہت محنت کی اور خود اسمٰعیل بھی شاید دو نسلوں کا تاوان بنا کر بھیجا گیا تھا۔ اُس کے پڑھنے کا شوق دیکھ کر ماں نے باپ سے سفارش کی اور چوتھے سال میں وہ پہلے درجے کا طالب علم بن گیا۔ چودہ سال میں میٹرک کر گیا۔ میٹرک کے بعد وہ باپ کے ساتھ زندگی کے میدان میں کود پڑا، مگر تعلیم کی سبز پری اُسے ہمیشہ اشارے کرتی رہی تھی، شاید اسی لیے لوم پر کام کرتے ہوئے بھی وہ پڑھتا رہا، اور اکیس بائیس سال میں اُس نے بی.اے. کر ہی ڈالا۔ اسکول رجسٹر کے مطابق اُس وقت اُس کی عمر اٹھارہ یا انیس برس تھی۔

گاڑی کسی اسٹیشن پر رُکی تھی، چائے اور خونچے والوں کی چیخ و پکار سے اسمٰعیل گڑبڑا گیا۔ اس

نے اپنی برتھ پر لیٹے لیٹے ڈبے پر ایک سرسری نگاہ ڈالی۔ اِندرا گاندھی کے قتل کے بعد گاڑی میں سکھوں کا نظر آنا بہت کم ہو گیا تھا۔

''یہ آگے آنے والی کس صورت حال کا اشاریہ ہے۔'' اسمٰعیل کے من میں اچانک ایک سوال نے سر اُٹھایا۔

''پتہ نہیں۔'' دل ٹالنے کے موڈ میں تھا۔

''اقلیت کا ردّعمل اکثریت کی غنڈہ گردی کا سبب بن رہا ہے۔''

''اس کا مطلب کیا ہے؟'' دل راہِ فرار بھی اختیار کر رہا تھا اور بے چین بھی تھا۔

''اکثریت یا اقتدار جو چاہے کرے، اقلیت کے کسی فرد کو جواب دینے کا حق نہیں ہے۔''

ایسا لگا کہ اسمٰعیل کا دم گھٹ جائے گا۔ صورت حال کی سنگینی پر اس پہلو سے تو اُس نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔

مگر ٹھیک ہی ہے۔ اب کم از کم سکھوں اور ہندوؤں میں تو دوستی نہیں ہوگی۔ ان سکھوں نے مسلمانوں کو کیا کم پریشان کیا ہے؟

مگر وہ جو پاکستانی پنجاب میں سکھوں کے ساتھ ہوا؟ (سوچ شاید ایک ڈھلان پر لڑھک گئی تھی۔)

اب کیا پتہ؟ کس کا عمل، عمل تھا اور کس کا عمل ردّعمل!

''اسمٰعیلا...'' رات کے سنّاٹے اور ٹرین کی گھڑگھڑاہٹ کے درمیان ایک پھنکار سنائی دی اور اسمٰعیل کانپ سا گیا۔

اس نے آواز کی سمت نگاہ کی، آواز کھڑکی کے باہر سے بے دھڑک اندر گھستی چلی آ رہی تھی اور کھڑکی کے باہر وسطی راتوں کے چاند کے مدھم اُجالے اور کم کم اندھیرے میں ...میاں میر والا ٹرین کے ساتھ دوڑتا نظر آیا۔

''اسمٰعیلا! تیرا ڈائیلاگ ابھی تک ختم نہیں ہوا؟ پھر وہی عمل اور ردّعمل کا چکر؟

''ارے نہیں یار...وہ تو بس یونہی...''

''اسمٰعیلا!'' میاں میر والا اژدھے کی طرح پھنکار مار رہا تھا۔ ''ہوش میں آ ہوش میں...اب یونہی کچھ بھی نہیں۔''

پھر پرچھائیں کھڑکی کے پاس سے ہٹ گئی۔ مگر صبح ہونے تک آواز اُس سے لپا چھپی کا کھیل کھیلتی رہی۔

''اب یونہی کچھ بھی نہیں...اب یونہی کچھ بھی نہیں...''

وہ ساری رات انگاروں کے بستر پر لیٹا رہا، گرمی اب بڑھنے لگی تھی مگر ہوا کبھی کبھی معتدل ہو جاتی تھی، علاقے کا اثر اسمٰعیل کو بار بار متاثر کر رہا تھا۔ اُس پر عام ڈبّے کی بھیڑ، اُس نے اپنے اردگرد نگاہ کی، بھانت بھانت کے لوگ بھانت بھانت کی اداؤں کے ساتھ۔ وہ ٹرین میں کم بولنے کا عادی تھا، اس لیے خود تو لوگوں سے ہل مل نہ سکا۔ لیکن اِس کا اتنا فائدہ تو ضرور ہوا کہ وہ چین سے لوگوں کو سن سکتا تھا۔ مہاراشٹر، مدھیہ پردیش، یو۔ پی۔، بہار، بنگال، اُسے تو لگا پورا ہندوستان جمع ہے۔ لوگ کبھی اپنے گروپ میں بات کرتے کبھی دوسرے گروپ والوں کی گفتگو میں شریک ہو جاتے، پھر ٹرین کسی اسٹیشن پر رُکتی تو باتوں کا سلسلہ ٹوٹ جاتا، کچھ لوگ کھانے کی چیزیں یا پانی لینے کے لیے باہر دوڑتے، باہر کے لوگ اندر آتے، چائے پان والوں کی آمد کا سلسلہ بھی لگا تار رہتا—

پٹنہ ریلوے اسٹیشن پر وہ بھونچکّا سا رہ گیا، اسٹیشن کے باہر ذرا سی دوری پر مسجد اور مندر دونوں اپنی پوری شان و شوکت کے ساتھ موجود تھے۔ وہ آگے بڑھا تو مسلمانوں اور ہندوؤں کی دوکانیں بھی پاس پاس نظر آئیں۔ اسمٰعیل کا جی خوش ہو گیا، اُسے اپنا علاقہ یاد آ گیا، علاقے کی یاد کے ساتھ جے رام چاچا، ست نرائن بھائی، اُس کا یار جانی اکشے...کون کون نہ یاد آ گیا...سب چھوٹ گئے۔

دُکھ کا ایک بونڈر سا اُسے چاروں سمت سے اپنی طرف بڑھتا دکھائی دیا، کیسی ٹیڑھی میڑھی ہے جیون کی یہ پگڈنڈی، ایک سرا چھوٹتا ہے تو دوسرا ہاتھ آتا ہے، پر جو سرا چھوٹا اُس سے اُس کا کتنا یارانہ تھا، جس سرے سے اب وہ جڑنے جا رہا ہے، اُس کا کیا ٹھکانہ ہے۔ اسمٰعیل نے خود کو ایک پل کے لیے اندر سے بالکل تھونسا ہوا محسوس کیا۔ یہ کس دھند اور جھٹپٹے کا سامنا ہے پروردگار!

اُس نے رکشے پر سوار ہوتے ہوئے سوچا اور جیب سے پتہ نکال کر دیکھا: ''مقصود علی! قطب الدین لین، نزد دریا پور مسجد، سبزی باغ، پٹنہ — پتہ اُسے صحیح یاد تھا۔ وہ سبزی باغ کی دریا پور والی مسجد کے پاس سے قطب الدین لین میں داخل ہو گیا اور اُس کے بعد گڑبڑا گیا۔ اتنی لمبی گلی اور اُس کے دائیں بائیں اتنی چھوٹی چھوٹی اور گندہ گلیاں، نالیوں میں غلاظت بجبجا رہی تھی، بعض جگہ چھوٹے بچے نالیوں کے کنارے فراغت کرتے نظر آئے، آنے جانے کے راستے پر کوڑا کرکٹ۔

''ہر جگہ مسلمانوں کے علاقے گندے کیوں رہتے ہیں؟'' فوراً ایک سوال نے سر اُٹھایا۔

''اس لیے کہ مسلمانوں نے صفائی اور پاکیزگی (طہارت) کو الگ الگ خانوں میں بانٹ دیا ہے۔'' شاعر دوست گوہر مالیگانوی کا جواب آیا۔

اس نے سر جھٹکا اور آگے بڑھتا گیا، سوال یہ تھا کہ اتنی پیچ دار گلیوں میں وہ اپنے ماموں مقصود علی کو کیسے ڈھونڈے؟ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا، کئی لوگوں سے پوچھا مگر سبھی نے لاعلمی ظاہر کی، اچانک اُس کے ذہن میں ایک جھما کا سا ہوا...کبھی کا سنا ہوا ایک جملہ...یہی بہار کی اور پرانے رشتہ داروں کی بات نکلی ہوئی تھی، سب کا ذکر کرتے کرتے اماں کی یاد کی رو ماموں کی طرف مڑ گئی تھی، وہ کچھ بتا رہی تھیں جس پہ ابا نے ہنس کر کہا تھا: ''سالے کو سکریٹریٹ کی نوکری بھی راس نہیں آئی۔ رہ گیا مولوی کا مولوی!''

''بھائی، مقصود علی صاحب، جو سکریٹریٹ میں کام کرتے ہیں، اُن کا مکان کہاں ہے؟ حجّام کی دوکان میں حجّام سے پوچھا۔

''اچھا اچھا، مقصود صاحب...وہ جو سکریٹریٹ میں کام کرتے ہیں، داڑھی رکھتے ہیں، بیٹے کی کتاب کی دوکان...''

''جی...جی!'' اسمٰعیل نے بے سوچے سمجھے سر ہلایا۔

''یہاں سے سیدھے جایئے۔ بائیں طرف پہلی گلی چھوڑ کے دوسری گلی میں مڑیئے، چھ سات مکان کے بعد دائیں طرف ایک گلی گئی ہے، اُس گلی میں نالہ پار کر کے تیسرا مکان۔

اسمٰعیل اتنی دیر میں کاغذ پر بھی لکھ چکا تھا۔

اسمٰعیل نے دروازے پر پہنچ کر دستک دی، دروازہ کھلا، ایک باریش بزرگ سامنے تھے، اسمٰعیل نے سلام کیا، اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ ماموں ہی ہیں۔ بزرگ نے وعلیکم السلام کہا، مگر آنکھیں سوال کر رہی تھیں۔

''میں اسمٰعیل ہوں۔'' اُس نے مؤدبانہ جواب دیا۔

''اسمٰعیل؟'' سامنے والے بزرگ نے ذہن پر زور دینے کے انداز میں سوال کیا۔

''اکبری خاتون کا بیٹا۔'' اس وقت ماں کا حوالہ ہی زیادہ مناسب معلوم ہوا۔

نام سنتے ہی مقصود صاحب نے لپک کر اُسے گلے لگا لیا۔ اسمٰعیل نے محسوس کیا، اُن کی آواز

گلوگیر ہو گئی تھی۔ اُنھوں نے وہیں سے زور سے پکار کر کہا، ''اجی سنتی ہو؟ اسمٰعیل آیا ہے... باجی کا بیٹا...'' یہ کہتے کہتے مقصود علی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے... پردیس میں بے یار و مددگار فساد میں شہید ہونے والی بہن یاد آگئی تھیں۔

آواز سنتے ہی کئی لوگ گھر کے اندر سے باہر برآمدے میں چلے آئے۔ اُنہی میں ایک سن رسیدہ خاتون بھی تھیں، اسمٰعیل نے سوچا، ''شاید یہ ممانی ہیں۔'' وہ خاتون اُس کے قریب آئیں۔ اُس کے سر پر ہاتھ رکھا، تسلّی اور تعزیت کے کچھ جملے کہے، پھر شوہر کی بانہہ پکڑی: ''چلیے اندر چلیے۔'' پھر اسمٰعیل کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر کہا، ''آؤ بیٹا...اندر آجاؤ!''

سب اندر آگئے۔ کچھ دیر تک ماحول خاصا غم زدہ رہا۔ سبھی چپ تھے، ممانی کی آنکھیں نم تھیں، ماموں ابھی تک رہ رہ کر سسکیاں لے رہے تھے، شاید وہ یادوں کے حصار سے باہر نہیں نکل پا رہے تھے۔ اسمٰعیل کیا روتا، وہ تو روتے روتے تھک گیا تھا، اس نے تھکی تھکی نظریں گھر پر ڈالیں۔

ایک اوسط درجے کا گھر، برآمدے کے بعد شاید وہ ڈرائنگ روم تھا، جس سے گزرتے ہوئے وہ دالان میں آئے تھے، اوسط سائز کی دالان، اس کے دو طرف کمرے، تیسری طرف باورچی خانہ...سامنے آنگن، آنگن کے ایک کنارے، دو دروازے نظر آئے، ''غسل خانہ اور لیٹرین ہوگا۔'' اسمٰعیل نے سوچا۔ گھر سے امیری نہیں ٹپک رہی تھی مگر مکان بتا رہا تھا کہ رہنے والے تنگ دست بھی نہیں ہیں۔

''بیٹا! تم کہاں تھے؟ تمھارے ماموں نے تمھارا بہت پتہ چلایا، کوئی خبر نہیں ملی۔'' ممانی نے دھیرے سے پوچھا۔

''جی۔ وہاں جب سب ختم ہو گیا تو میں کسی طرح بھاگتا چھپتا بمبئی پہنچ گیا، مدتوں وہیں رہا، مگر جس حال میں تھا، اس میں ممکن نہیں تھا کہ آپ لوگوں سے کوئی رابطہ بنا سکوں۔

ماحول کی غمگینی آہستہ آہستہ کم ہوتی گئی جذبات کا اُبال بھی مدھم ہوا، تب تک گھر میں موجود غالبًا چھوٹے لڑکے نے غسل خانے میں پانی رکھ دیا، دیکھنے میں جو بڑا الگ رہا تھا، اُس نے آہستہ سے کہا، ''جایئے، نہا لیجیے۔''

''سعود ہے، تمھارا بھائی۔'' اسمٰعیل نے اُسے دیکھا تو ماموں بولے۔

بے ساختہ اسمٰعیل کی نگاہ اُس کی طرف گئی جو باتھ روم میں پانی رکھ کر ابھی اُس کے پاس آیا تھا۔

''یہ وددو ہے،سعود سے چھوٹا۔''

اُسی وقت باہر سے ایک شخص اندر داخل ہوا، آنے والا وددو اور سعود دونوں سے بڑا لگ رہا تھا۔ ماموں اُس کی طرف مخاطب ہو کر بولے:''اسمٰعیل ہے، تمھاری مرحومہ پھوپھی جان کا بیٹا...اور یہ بیٹا۔'' ماموں نے اسمٰعیل کی طرف رُخ کرتے ہوئے کہا: ''یہ خوشنود ہیں...تمھارے بھیا۔'' اسمٰعیل کھڑا ہو گیا اور آداب کیا۔ خوشنود نے اُسے گلے لگا لیا اور بھرائی آواز میں بولا۔''کہاں کھو گئے تھے بھائی؟ ابا تمھارے لیے کتنا پریشان رہتے تھے۔'' اسمٰعیل کیا کہتا، چپ رہا اور سوچا:''شاید اِنھی کی کتاب کی دوکان ہے۔''

''جاؤ بیٹا۔ پہلے نہا لو، بہت دور کا سفر کر کے آ رہے ہو، تھکے ہوئے ہو، کچھ تھکان دور کر لو۔ باتیں تو ہوتی ہی رہیں گی۔''

ممانی نے اتنے اپنائیت بھرے لہجے میں کہا کہ اندر سے اُس کا دل بھر آیا۔ مہینوں بعد اُسے گھر کا ماحول میسر ہوا تھا۔

اُس نے اپنا بیگ کھولنا چاہا جو اُس کے ملنگ دوست نے دیا تھا، اُسی وقت وددو بولا:

غسل خانے میں تولیہ لنگی ہے۔ میں نے اپنا کرتا پیجامہ بھی رکھ دیا تھا۔ آپ کو فٹ ہو گا۔

اسمٰعیل کچھ نہیں بولا، ہلکے سے مسکرایا، ایسی مسکراہٹ جس میں دکھ اور شکر یہ دونوں شامل تھا، اور غسل خانے کی طرف بڑھ گیا۔ نہا کر باہر نکلا تو دسترخوان چن دیا گیا تھا...''آ ؤ بیٹا، کھانا کھا لیا جائے۔'' ماموں کہتے ہوئے چوکی پر بچھے دسترخوان کی طرف بڑھے۔ تینوں بھائی بھی دسترخوان پر آ گئے۔ اسمٰعیل کو آج مہینوں بعد گھر کا کھانا نصیب ہوا تھا، اماں یاد آ گئیں، ساری زندگی بمبئی، بھیونڈی اور مالیگاؤں کے اِرد گرد گزری، بیوی بھی اُدھر ہی کی تھی مگر اماں اپنا بہار اپنا گھر کبھی نہیں بھول پائیں، ہفتے میں ایک دن خاص طور پر بہاری کھانا بنتا تھا۔ اسمٰعیل اس مزے سے آشنا تھا، اماں ہر قدم پر یاد آ رہی تھیں۔ اُس کی آنکھیں بھیگ گئیں، وہ آہستہ سے آنکھ صاف کرنے لگا۔

بڑے بھائی نے شاید دیکھ لیا، بغل میں بیٹھا ہوا تھا، جلدی سے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور بہت بھاری لہجے میں بولا۔'' کربلا والوں کا غم یاد کرو، جو ہوا اُس پر ہمارا تمھارا کوئی بس نہیں مگر اب تم اکیلے نہیں ہو، یقین کرو، ہم سب بھائی ایک ساتھ ایک نئی زندگی شروع کریں گے۔''

اسمٰعیل اور بے قابو ہو گیا، پھپھک پھپھک کر رو پڑا، جو کچھ اُس پر بیتی اُسے برداشت کرنے

کے لمحات میں یہ پہلا لمحہ تھا، جب اُسے رونے کے لیے ایک کاندھا ملا تھا، وہ بے قابو ہو گیا اور ایسا پھوٹ پھوٹ کے رویا کہ گھر کا ہر فرد بے چین ہو اُٹھا، ماموں نے اُسے بالکل لپٹا لیا۔''بیٹا! میں ہوں، میں تمھارا بھرا پرا گھر تو تمھیں نہیں لوٹا سکتا مگر میں خود کو تمھارے حوالے کرتا ہوں۔'' پھر ممانی بھی آ گئیں، پورا ماحول غم زدہ ہو گیا۔ اِسی درمیان اُس نے دیکھا، ایک نوجوان خوب صورت سی لڑکی بھی وہیں پر کھڑی نظر آئی۔ اُسے یاد آیا۔''ماموں کی بیٹی...غالباً شہوار۔''

پٹنہ پہنچ کر دو تین دن تو اُس پر بھرپور کسل مندی کا عالم طاری رہا، وہ زیادہ تر سوتا رہا، دن میں ماموں سکریٹریٹ چلے جاتے، بڑا بھائی دوکان چلا جاتا، اُس کے بعد والا ایم۔ بی۔اے۔ کر رہا تھا وہ یونیورسٹی چلا جاتا، چھوٹا والا بارہواں درجہ پاس کر چکا تھا اور انجینئرنگ کے مقابلہ جاتی امتحانات کی تیاری میں جٹا ہوا تھا، بہن شہوار بھی بی۔اے۔ کے آخری سال میں تھی۔ سب سہ پہر کے آس پاس واپس آتے، بس بڑا بھائی دوپہر کے کھانے میں اُس کا ساتھ دیتا، ویسے سبھی بھائی حتی الامکان اُسے سنگت دینے کی کوشش کرتے رہتے۔ شہوار سے بھی کوئی پردہ نہیں تھا، مگر اتنے دنوں دور رہنے کی وجہ سے حجاب کا پیدا ہونا فطری تھا، پھر بھی ماموں ممانی بھائی سبھی یہ کوشش کر رہے تھے کہ وہ گھر کے ہر فرد سے بے تکلّف ہو جائے۔

ہفتہ دس دن بعد آہستہ آہستہ دھند چھٹنے لگی۔ پندرہ دن گزرتے گزرتے اُس کے ذہن نے پوری طرح کام کرنا شروع کر دیا۔ بیس پچیس دنوں بعد وہ شدت سے سوچنے لگا کہ اب کیا کرنا ہے، ایک ماہ بعد ایک اتوار کو ناشتے کے وقت اُس نے خود ہی پہل کی۔

''ماموں! میں اس طرح کب تک بیٹھا رہوں گا؟''

''میں یہ بات تمھاری زبان سے سننا چاہتا تھا، اچھا ہوا کہ تم نے خود یہ سوچا۔'' ماموں ہلکے سے مسکراتے ہوئے بولے۔

''اب تو آپ ہی باپ بھی ہیں اور گارجین بھی۔ آپ کیوں ہچکچا گئے؟''

''تاکہ تم یہ نہ سوچو کہ ہم تمھیں بوجھ سمجھ رہے ہیں۔''

''ماموں! میں یہ سمجھتا تو یہاں آتا ہی کیوں؟''

''ہاں اسمٰعیل، یہ تمھاری محبت ہے۔'' بڑے بھائی خوشنود نے گفتگو آگے بڑھائی۔''یقیناً یہ تمھارا گھر ہے، مگر تم جن حالات سے گزرے ہو اُس میں آدمی کا حساس بلکہ زود رنج ہو جانا بھی

فطری بات ہے۔ تمھیں اب کوئی دُکھ نہ پہنچے، بس ہم سب یہی سوچ کر چپ تھے ورنہ میں نے اورابا نے کئی مرتبہ تمھارے بارے میں باتیں کی ہیں۔''

''بیٹا! بی.اے. تو تم کیے ہوئے ہو، اب تم ایم.اے. کرلو۔''

''ماموں! میں نے بہار سے بی.اے. نہیں کیا ہے۔''

''تو کیا ہوا؟ وہاں سے مائیگریشن آجائے گا۔''

''میں اب وہاں نہیں جاؤں گا۔''

''مت جانا۔ بمبئی میں کئی جاننے والے ہیں، میں اُن لوگوں کے ساتھ جا کر لے آؤں گا۔'' خوشنود نے اطمینان دلایا۔

''میری عمر اب پڑھنے کی ہے؟ مجھے کسی کام میں لگا دیجیے۔''

''سنو! اسمٰعیل! پڑھے لکھے اور محنتی آدمی کے لیے کام کوئی مسئلہ نہیں ہے، مگر تم پہلے تعلیم مکمل کرو۔''

''بھیا، اب اس عمر میں پڑھنے جاؤں؟''

''کیوں؟ تمھاری عمر کو کیا ہوا؟ تیس برس کا آدمی ایم.اے. نہیں کرسکتا؟''

''میں تینتیس برس کا ہوں۔''

''جو سرٹیفکیٹ کی عمر ہے، اس کی بات کرو، اصل عمر یہیں گھر میں رہنے دو۔''

اسمٰعیل، ماموں اور اُن کے گھر پر بوجھ نہیں بننا چاہتا تھا، مگر ماموں ممانی اور بھائیوں کے آگے اُس کی ایک نہ چلی، پٹنہ یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ میں اُس کا داخلہ ہو ہی گیا۔

زندگی کا ایک بالکل نیا چہرہ، اُس کے سامنے تھا، کبھی کبھی وہ اپنے آپ سے سوال کرتا: ''اسمٰعیل! تم کیا کر رہے ہو؟'' اندر اندر دوسرا سوال سر اُٹھاتا: ''تم اور کیا کر سکتے ہو؟''

گزرا ہوا کل اُسے جب نہ تب بہت پریشان کرتا... بہت پیار کرنے والی بیوی، ماں باپ، ننھی منی سی بیٹی، بھرا پرا کنبہ، اُس کی تو پوری کائنات مالیگاؤں بھیونڈی اور بمبئی میں دفن تھی، وہاں کی صبحیں اور شامیں، دوست اور ملنے والے، کن کن کو وہ بھلا پائے گا؟ مانا کہ اُس کے باپ دادا یہیں کے تھے، اُس کے باپ اپنی ماں کی اکلوتی اولاد تھے لیکن اُس کی بہن تو بھیونڈی میں بیاہی گئی، اُس کی شادی تو بھیونڈی میں ہوئی۔ قسمت کی ماری بہن بیچاری تو فسادات شروع ہونے کے

چار دن پہلے مائکے آئی تھی، میری اور اُس کی سسرال والے پتہ نہیں کس حال میں ہیں؟ اُسے لگتا، وہ تو جڑ سے اُکھڑا ہوا درخت ہے۔ بہار کا علاقہ اس کے لیے سارے کا سارا اجنبی تھا، ٹھیک ہے اُس کے دادا کے بھائیوں کا خاندان اور اُس کے باپ کے سوتیلے بھائی کا خاندان یہیں آباد ہے، مگر اُن سب سے تو اُس کا کبھی کا کچھ لینا دینا نہیں رہا۔ ماموں کے علاوہ تو کسی سے کوئی تعلق ہی نہیں رہا، اور ماموں بھی اپنے مسائل میں ایسا گھرے رہے کہ کبھی بہار سے باہر نہیں نکل سکے، ہم لوگ بھی کہاں آپائے؟ آزادی کے بعد تو جو جہاں تھا وہیں جھوجھ رہا تھا، کسی طرح اپنے کو بچا لینے کی کوشش میں مصروف... اور اِس کوشش میں کیسی کیسی مکاریوں اور ناانصافیوں کو لوگوں نے اپنے لیے جائز ٹھہرایا۔ اس کا ایک چھوٹا سا نمونہ اسمٰعیل کے سوتیلے چچا تھے، جنھوں نے بڑے بھائی کے مہاراشٹر کی طرف چلے جانے کے بعد ساری جائداد ہڑپ لی، عدالت میں خود کو دادا کی واحد اولاد کہہ کر جو کچھ تھا، اُسے اونے پونے بیچ ڈالا۔ اسمٰعیل کے والد کو خبر ملی تو اُن کا دل ایسا ٹوٹا کہ بہار سے سارا تعلق ختم کر دیا۔ اسمٰعیل اور اُس کی بہن کی شادی بھی بھیونڈی میں کر دی۔

''باپ کا سوتیلا بھائی یعنی میرے چچا۔'' اسمٰعیل کو چچا یاد آ گیا۔ ''پتہ نہیں کہاں ہیں وہ؟''

گزرا ہوا کل اُسے مسلسل پریشان کرتا رہا، دن تو یونیورسٹی کی نئی نئی مشغولیتوں میں گزر جاتا مگر رات اس کے لیے مصیبت بن کے آتی... کبھی میاں میر والا پوچھتا: ''اوئے اسمٰعیلا! کن حالوں جیتا ہے تو؟ کبھی مبشر رِجائی کی آواز آتی۔ ''میرا نام مبشر رجائی ہے... ایسا بشارت دینے والا جو خود بھی اُمید و رِجا کا استعارہ ہے۔'' وہ سنتا اور چپ چاپ رہتا... شاید اُس کے اندر کا آدمی عشق اور رِجا دونوں سے اوب گیا تھا... تب ایسے ہی کسی لمحے میں میاں میر والا پوچھتا: ''تب پھر تیرے جینے کا جواز کیا ہے؟''

وہ سر جھٹکتا اور آنے والی صبح کے بارے میں سوچتا: ''کل پھر یونیورسٹی جانا ہے۔'' یونیورسٹی بھی اُس کے لیے کم مصیبت نہیں تھی۔ اُس نے آنکھ کھولی تو گھر میں تجارت کا ماحول دیکھا، اُس کی پڑھائی تو حساب کتاب کے کھاتے بہی کے سائے میں ہوئی۔ اُسے باضابطہ کالج جانے کا موقع کب ملا، ظاہر ہے یونیورسٹی اُس کے لیے ایک بالکل نئی دنیا تھی، جس کا اُس نے تذکرہ سنا تھا، جسے آتے جاتے دور سے ایک تماشائی کی طرح دیکھا تھا۔ اُس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ دس بارہ برس دھواں دھار تجارت کے بعد اچانک اُسے یونیورسٹی کا باضابطہ طالب علم بننا نصیب

ہوگا۔ شروع میں تو اُس نے خود کو یونیورسٹی میں بالکل مس فٹ محسوس کیا۔ زیادہ تر لڑکے بیس سے پچیس کی عمر کے درمیان ہوں گی۔ اُس کی عمر کے تو کئی لکچرر نظر آئے، وہ تو شکر ہوا کہ اُس کی کاٹھی ایسی تھی کہ وہ اپنے چہرے بشرے اور قد وقامت سے پچیس برس سے زیادہ کا محسوس نہیں ہوتا تھا، مگر پھر بھی اُس کے اندر یہ احساس تو کہیں نہ کہیں موجود تھا کہ وہ اِن سب جیسا نہیں ہے۔ نتیجتاً کلاس میں اُس کی پہچان الگ تھلگ بیٹھنے والے خاموش طالب علم کی حیثیت سے ہوتی گئی جو زیادہ تر آگے نہیں بیٹھتا تھا۔

کلاس شروع ہوئے ہفتہ دس دن ہوئے ہوں گے کہ ایک دن پروفیسر شری واستوا کے لکچر کے دوران اچانک بغل سے کسی نے ٹھوکا دیا۔ اُس نے لکھتے لکھتے نظر اُٹھائی۔ ایک لڑکا اشارے سے پوچھ رہا تھا کہ ''قلم ہے؟''

اتفاق سے اس کے پاس ایک فاضل قلم موجود تھا۔ اس نے لڑکے کو ایک نظر دیکھا، لکھتے لکھتے ہی جیب میں کھسا ہوا دوسرا قلم نکال کر اُس نے لڑکے کو دے دیا اور پھر لکھنے میں مصروف ہوگیا۔

انیل شرما سے یہ اُس کا پہلا سابقہ تھا—

بمبئی اور بھیونڈی کا عذاب جھیلا ہوا، اسمٰعیل مرچنٹ، انیل شرما سے کسی بھی طرح کی قربت کے موڈ میں قطعی نہیں تھا۔

❖

''اسمٰعیل نہیں آیا؟'' مقصود علی نے کھانے کے دسترخوان پر بیوی سے پوچھا۔

''نہیں... ابھی تک تو نہیں آیا۔''

''کیوں دیر ہوئی؟ کلاس تو اَب ختم ہوگیا ہوگا۔'' مقصود علی کے لہجے سے تشویش جھلک رہی تھی۔

''یونیورسٹی سے نکلنے میں دیر ہوگئی ہوگی۔'' ودود نے جواز پیش کیا۔

''نیا شہر ہے، گڑبڑا نہ جائے۔''

''آپ بھی ابّا۔'' ودود ہنس دیا۔ ''وہ بچہ ہیں؟''

''میں ایک بہت دلچسپ بات محسوس کر رہا ہوں۔'' بڑا بیٹا خوشنود مسکرا کر بولا۔ جب تک اسمٰعیل نہیں آیا تھا، تو ہم لوگ اسمٰعیل یا پھوپھی وغیرہ کا تذکرہ آپ کی زبان سے شاذ ونادر سنتے تھے،

مگر اَب آپ اسمٰعیل سے بہت اٹیچڈ محسوس ہوتے ہیں۔''

''بیٹا! باجی جب یہاں تھیں ہی نہیں تو میں اُن کا تذکرہ کیا کرتا؟ میں نے اپنے درد میں تم لوگوں کو شریک کرنے اور خواہ مخواہ تم لوگوں کو پریشان کرنے کی کوشش نہیں کی، وہ دولہا بھائی کے ساتھ اتنی دور چلی گئی تھیں کہ میں نے ایک طرح سے سمجھو کہ صبر کر لیا تھا، پھر اُن لوگوں نے وہیں اپنی ایک دنیا پیدا کر لی، یہاں دولہا بھائی کے رشتہ داروں نے اُن کے ساتھ بے ایمانی کی، وہ بد دِل ہوگئے، گئے تو پھر بہار آئے نہیں، میں بھی سکریٹریٹ کا معمولی ملازم، اتنی دور بار بار جا نہیں سکتا، آہستہ آہستہ رابطہ ٹوٹ گیا، بس یہی سوچ کے اطمینان تھا کہ جہاں ہیں اپنی دال روٹی میں مطمئن ہیں، مگر وہ میری بہت پیاری باجی تھیں۔

''تمھارے ابا ٹھیک کہتے ہیں۔'' ماں نے باپ کی ہاں میں ہاں ملائی۔ شادی کے بعد میری اُن کی صرف تین مرتبہ ملاقات ہوئی۔ مگر جب بھی ملیں ٹوٹ کے ملیں۔ بڑی محبتی عورت تھیں۔

''اب تم لوگوں کو کیا بتاؤں؟'' ابا کہنے لگے، ہم دونوں تو ماں باپ کے اکلوتے بیٹے بیٹی تھے، ہماری تو پوری کائنات چار آدمیوں پر ٹکی ہوئی تھی اور اُن میں بھی دو تو ماں باپ ہی تھے، بچ گئے ہم دونوں تو ہم لوگ صرف بھائی بہن نہیں تھے، دوست تھے، کمپٹیٹر تھے ایک دوسرے کے مددگار تھے۔''

مقصود علی بہت جذباتی ہوگئے۔ بہت دیر تک اپنی باجی کا تذکرہ کرتے رہے۔

دسترخوان پر بیٹھی، کوئی ڈش لانے کے لیے باورچی خانے کی طرف جاتی، پھر دالان میں چوکی کی طرف آتی ...شہوار سب کچھ سنتی رہتی... کہیں کچھ ایسا تھا جو اُسے اسمٰعیل پر ہونے والی گفتگو میں شریک ہونے سے روکتا تھا، کہیں کچھ ایسا بھی تھا جو اُسے اسمٰعیل کے بارے میں کی جانے والی باتوں پر کان لگائے رہنے پر مجبور کرتا تھا... یہ کیا تھا، شہوار کو نہیں معلوم تھا، اور شہوار کو کیا نہیں معلوم ہے، اسمٰعیل کے ذہن کے کسی بھی گوشے میں یہ کوئی مسئلہ نہیں تھا۔

کبھی کبھی شہوار سوچتی، اسمٰعیل پھوپھی کا بیٹا ہے تو کیا ہوا؟ آج ابا اُسے سر پر چڑھائے ہوئے ہیں، مگر کسی نے اُس کے بارے میں اِس کے علاوہ کسی اور ذریعے سے کچھ جاننے کی کوشش کیوں نہیں کی؟ اس کا ماضی کیسا رہا؟ اس کا چال چلن کیسا تھا؟ غیر مرد کو اس طرح گھر کے اندر داخل کر لینا کہاں کی عقل مندی ہے؟ ایک دو مرتبہ تو یہ سانپ بھی اُس کے ذہن میں رینگا کہ یہ میری

پھوپھی کا بیٹا ہےاس کا کیا ثبوت ہے؟ پھر وہ اندر ہی اندر اللہ توبہ، مولا توبہ کرتی، خود کو سمجھاتی، جیسی باتیں وہ کرتے ہیں، پھوپھی کا تذکرہ، اپنے ننھیال کا ذکر، پرانے لوگوں کی یاد، ابّا نے اسمٰعیل کی بہن کی شادی کے موقع پر جو خط لکھا تھا، اُس حوالے سے گفتگو...''

وہ خود کو خود ہی پھٹکارتی۔

تب اسمٰعیل کے بارے میں بھلا بھلا سوچنے کی باری آتی، شریف آدمی ہے، جلدی نظر اُٹھا کر مجھے دیکھتا نہیں ہے، مہذب ہے، کون سی چیز کہاں پہ رکھنی ہے، جانتا ہے۔ اپنی حد بھی پہچانتا ہے، چار ماہ گزر چکے مگر گھر کے معاملات میں خود سے دخل نہیں دیتا۔

پھر اپنے آپ پر ہی جھلّا جاتی: ''اری بخت ماری! وہ جیسا بھی ہو، تجھے اس سے کیا؟''

مگر خود کو برا بھلا کہنے سے، اندر اندر جو کچھ ہوتا رہتا ہے، اس کے ہوتے رہنے پر کوئی فرق تو نہیں پڑتا، شہوار کے آپے سراپے میں تو یہ سارا کچھ آپ ہی آپ ہونے لگا تھا، اسمٰعیل کے موجود ہونے پر ایک جھجک سی، اپنے ہر پل پر ایک توجہ سی، سر پر دوپٹہ ہے کہ نہیں، بدن پورا ڈھکا ہوا ہے کہ نہیں، بال سنورا ہوا ہے کہ نہیں، ہر بیس پچیس منٹ بعد جی چاہتا، ذرا آئینہ دیکھ لے، چہرے پہ کوئی داغ دھبّہ تو نہیں لگ گیا، اسمٰعیل کی طرف جاتی ایک سرسری سی، اُچٹتی ہوئی رواروی میں ایک نظر، پھر جیسے لگتا پسینہ چھوٹ گیا، کسی نے دیکھ تو نہیں لیا... اور اُن سب کے بیچ اپنے آپ کو ڈانٹتی شہوار: ''ارے بخت ماری! وہ جیسا بھی ہو، تجھے اس سے کیا؟''

پھر بھی بخت ماری اندر اندر برپا اِس اُتھل پتھل سے بچتی کیسے؟ اس کے باہر باہر، چاروں طرف، گھر کے اندر سبھی تو اسمٰعیل کے بارے میں سوچتے اور باتیں کرتے، سب سے زیادہ فکر تو ابّا کرتے، خیر اُن کا مسئلہ تو وہ سمجھتی تھی، یوں بھی وہ ہمیشہ بچوں پر توجہ دینے والے بزرگ رہے، اور بچے تو خیر بچے تھے، اعزّا اور اقارب کے لیے بھی اُن کے یہاں اپنائیت اور توجہ کا اک دریاؤ سا بہتا نظر آتا، ایسے میں وہ اگر اپنی بہن کے بے سہارا بیٹے کے لیے بے چین رہتے ہیں تو یہ کوئی حیرت کی بات نہیں، بھائیوں کا معاملہ یہ تھا کہ بہر حال خون کا رشتہ تو تھا ہی...

''مگر اُس کا اصل کمال تو یہ ہے کہ اماں بھی اُس کے لیے پریشان رہتی ہیں۔'' شہوار نے سوچا، ''کمرے میں دیر تک جاگتا یا سوتا رہتا ہے تو بار بار اُس کے کمرے میں جاتی ہیں۔'' بیٹا! اب رات زیادہ ہوگئی ہے، سوجاؤ۔'' صبح میں دیر تک سویا رہتا تو اماں کو فکر ہوجاتی، ''نو دو! دیکھو، بھائی کو اُٹھاؤ،

ابھی تک کیوں سویا ہے؟'' اسمٰعیل اِس پر بھی نہ اُٹھتا تو خود چلی آتیں۔ ''بیٹا! اُٹھ جاؤ، دھوپ نکل آئی۔''

خود اسمٰعیل بھی اندر اندر خود کو ممانی سے قریب محسوس کرتا۔ اُن کی توجہ کا یہ حال تھا کہ اگر بار بار اُٹھانے پر بھی نہ اُٹھتا تو وہ اس کا سر دبانے لگتیں، ''کیا بات ہے، طبیعت ٹھیک ہے نا؟'' اسمٰعیل اس توجہ پر اندر سے جل تھل ہو جاتا، اس کا جی چاہتا، منع کر دے۔ ''نہیں ممّی سر مت دبایئے۔ اماں یاد آجاتی ہیں۔'' پھر خود ہی سوچتا، ممتا کا شاید یہ آخری لمس ہے۔ اسمٰعیل کو کبھی حیرت بھی ہوتی کہ ماموں سے تو خیر خون کا رشتہ ہے، مگر ممانی تو غیر گھر سے آتی ہیں، وہ اس جیسے خانماں برباد کا اتنا خیال کیوں رکھتی ہیں؟ کبھی کبھی شک کا سانپ بھی رینگتا مگر وہ فوراً ہی سر جھٹک دیتا۔ اپنائیت کی اِس آخری چھتر چھایا کو وہ کسی بھی قیمت پر بچا کر رکھنا چاہتا تھا۔

ممانی بیچاری اسمٰعیل کی اس اندرونی کشمکش سے بے خبر جب نہ تب اپنے مرحوم بیٹے کو یاد کرتیں اور اُنہیں ایسا لگتا کہ سامنے سویا ہوا، بیٹھا ہوا، گھر میں داخل ہوتا ہوا، گھر سے باہر نکلتا ہوا، ہزاروں میل دور، قبر کی ٹھنڈی مٹّی میں سونے والی، اُس کی نند کا بیٹا نہیں ہے، اُس کا اپنا بیٹا ہے، جو روپ بدل کے دوبارہ چلا آیا ہے۔

زندگی کی اسی دھوپ چھاؤں کے بیچ، اسمٰعیل آہستہ آہستہ اِس نئے منظر نامے سے جہاں پوری طرح جڑنے لگا وہیں تاجرانہ ہوشیاری کی جگہ طالب علمانہ بے چینی نے بھی دھیرے دھیرے اندر سے انکرنا شروع کیا، اب منظر، پس منظر سب کچھ اُس کے یہاں ایک نئے سرے سے مرتب ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔

بھائیوں کے مشورے پر اُس نے تاریخ ہی میں اسپیشل آنرس کرنے کا فیصلہ کیا۔ آنرس کی تیاری اور ایم۔اے۔ کی کلاسیں ملا جلا کر اُس کے اوقات کافی بندھ گئے تھے۔ یونیورسٹی کے بعد جو وقت بچتا وہ لائبریری کی نذر ہوتا اور پھر گھر لوٹ کر بھی گئی رات وہ مطالعہ میں مصروف رہتا۔

اسمٰعیل کا شوق اور محنت دیکھ کر مقصود علی بہت متاثر ہوئے، اُسے لے کر شعبہ کے سینئر پروفیسر قیام الدین صاحب سے ملے اور اُس کے سلسلے کی ساری تفصیلات اُن کے سامنے بیان کر دیں، قیام الدین صاحب بھی کافی متاثر ہوئے، خاص طور پر اس کا خیال رکھنے لگے۔ قیام صاحب نے کسی قسم کی بھی دشواری محسوس ہونے پر اُسے گھر آنے کی اجازت دے رکھی تھی۔ اس لیے وہ اتوار کو

ایک مرتبہ قیام صاحب کے یہاں چلا جاتا تھا۔ وہیں ایک دن اُس نے ایک ایزی چیئر (آرام کرسی) پر ایک آدمی کو بیٹھے دیکھا۔ اس آدمی کا حلیہ عجیب تھا، کرتا پیجامہ تھا تو دُھلا ہوا، مگر اس پر آئرن کیا گیا ہوگا، ایسا محسوس نہیں ہورہا تھا۔ شیروانی بھی وہ صاحب پہنے ہوئے تھے مگر عجیب وضع سے، شاید برسوں پرانی بٹن ایک دو لگا تھا، باقی پوری شیروانی کھلی ہوئی تھی، سر پر کپڑے کی ٹوپی عجب بے ڈھنگے پن سے رکھی ہوئی تھی، لگتا تھا کہ بس سر پر رکھ لی گئی ہے مگر سر پر رکھنے کے بعد ٹوپی پہننے والے کو یاد ہی نہیں رہا کہ ٹوپی دائیں جارہی ہے کہ بائیں۔ پیروں میں ایک پرانی چپل، چہرے پر داڑھی نہیں تھی، مگر ایسا لگتا جیسے داڑھی بڑھانے کے ارادے سے داڑھی مہینوں سے بنوائی نہیں گئی ہے۔

عجیب غیر موثر آدمی تھے وہ صاحب۔ اور اُن کے سامنے قیام الدین صاحب مؤدبانہ کھڑے تھے، جی سر، جی سر کررہے تھے اور وہ صاحب قیام صاحب کو کچھ بتا رہے تھے۔

وہ کیا بتا رہے تھے، پورے کا پورا تو یاد نہیں رہا، مگر اُن کا ایک جملہ یاد رہ گیا۔ وہ قیام صاحب سے کہہ رہے تھے: ''یحییٰ بلاذری کی کتاب ''فتوح البلدان'' دیکھ لو۔ محمد بن قاسم کے عہد میں بھی ہندوؤں کی عبادت گاہوں کو عیسائیوں اور یہودیوں کی عبادت گاہوں کے مماثل قرار دیا گیا تھا۔''

بعد میں کچھ مسلم دوستوں کے درمیان، صابی قوم پر بات چیت کرتے ہوئے ایک مسئلہ اور بھی سامنے آیا تھا کہ صابیوں کو تو مفسرین نے ستارہ پرست بلکہ اشیاء پرست بھی کہا ہے اور قرآن میں صائبین کی کسی کتاب کا ذکر بھی نہیں ہے، پھر اُن کو اہلِ کتاب کیوں قرار دیا گیا؟ اور اگر وہ اہلِ کتاب ہوسکتے ہیں یہاں تک کہ دوسرے خلیفہ کے زمانے میں اگر آتش پرستوں کو بھی اہلِ کتاب کا درجہ دیا جاسکتا ہے، تو پھر ہندوؤں نے کیا قصور کیا تھا؟

مگر ذہن کا یہ خلجان تو بہت بعد کی بات تھا، اُس وقت تو وہ اُن صاحب کے حلیے اور وضع قطع پر حیران ہونے سے زیادہ ایسے خستہ حال آدمی کے تئیں قیام الدین صاحب کے احترامی رویّے سے حیران تھا۔ وہ چلے گئے تو اسمٰعیل برداشت نہیں کرسکا، پوچھ ہی بیٹھا: ''سر یہ کون صاحب تھے؟''

''ارے تم ہسٹری ڈپارٹمنٹ کے طالب علم ہو اور اِن کو نہیں جانتے؟'' قیام صاحب نے بڑی حیرت سے اُسے دیکھا تھا؟

''سوری سر!''

''ارے میاں! یہ مشہور مورخ حسن عسکری صاحب تھے؟''

''حسن عسکری؟'' اُس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

یہ وہ زمانہ تھا جب بہار سے اسمٰعیل کی ملاقات ہورہی تھی۔ یونیورسٹی اور مطالعے کے علاوہ جو وقت بچتا، وہ مٹر گشتی کی نذر ہوتا۔ اُن دِنوں اُس پہ گویا قیامت کا جنوں طاری تھا، دانا پور سے سملی تک کا علاقہ چھان مارنے کا وہ جیسے تہیہ کیے ہوئے تھا۔ وہ بس یونہی کسی گلی میں گھس جاتا، کوئی موڑ مڑ جاتا، کسی طرف نکل جاتا۔ رمنہ میں گھستا تو گلی گلی ہوتا ہوا لال باغ سے مصلح پور ہاٹ تک چلا جاتا، اور پھر اُدھر ہی سے لور روڈ پکڑ کر مہندرو اور شاہ گنج اُس سے آگے شاہ ارزاں، سلطان گنج، یہاں پروفیسر عطا کاکوی رہتے تھے، صدر شعبہ فارسی، تھک جاتا تو ٹمپو پکڑتا، صدر گلی اُتر جاتا۔ یہیں سید بدرالدین احمد صاحب کا مکان تھا، خان بہادر سیّد ضمیر الدین احمد کے لائق فرزند، کسی نے بتایا تھا کہ یہ لوگ دراصل بہار شریف کے محلّہ میر داد کے رہنے والے تھے۔ بدرالدین صاحب ایم.ایل.اے. بھی ہوئے، شاعری بھی کی، پٹنہ کے حال احوال پر ایک کتاب ''حقیقت بھی کہانی بھی'' تصنیف کی، پھر اُس سے آگے بڑھتا، لودی کٹرہ، فصاحت کا میدان جو عوام الناس میں فساد کا میدان کہا جاتا ہے، پھر منگل تالاب، وہاں خانقاہ عمادیہ تھی، شاہ صبیح الدین صاحب اس خانقاہ کے سجادہ تھے، اُس سے آگے گروگوبند سنگھ جی کے نام پر بنا گرودوارہ اور کالج اور پھر اُس کے آگے سملی کا علاقہ، خانقاہ فیاضیہ، بہت ہی گورے نارے خوب صورت اور محتاط بزرگ حضرت شاہ فیاض صاحب کا یہاں مزار ہے۔

یونیورسٹی کے سلسلے میں بھی اب اُس کا موڈ بوہیمین زیادہ ہوگیا تھا، شروع شروع چپ رہنے والا، اور لوگوں سے بہت کم ملنے والا اسمٰعیل اب آہستہ آہستہ کھلنے لگا تھا، لوگوں سے ملنے جلنے لگا تھا۔ ایک تو اُس کا پہلا ملاقاتی انیل شرما تھا ہی جو قلم لینے کے بہانے اُس سے قریب ہوا تو پھر قریب ہوتا ہی چلا گیا۔ پہلے تو اسمٰعیل بہت بِدکا۔ ''یہ کافر کیوں میرے پیچھے پڑا ہوا ہے؟'' لیکن وہ کافر بھی پیچھا چھوڑنے کے موڈ میں نظر نہیں آرہا تھا۔ اسمٰعیل جہاں بیٹھتا شرما وہیں چلا آتا... ''ہیلو اسمٰعیل!'' ...اسمٰعیل آخر کہاں تک بھاگتا، وہ اندر اندر شرما سے ہار مان چکا تھا، مگر اس کے باوجود وہ ابھی تک شرما پر پوری طرح کھلا نہیں تھا۔

کچھ ایسا ہی معاملہ فیضان رسول میرانی کے ساتھ بھی ہوا، مگر یہ صاحب تو جیسے اسمٰعیل سے

دوستی کا تہیہ کر کے بیٹھے تھے۔ داخلے کے ہفتہ دس دن بعد، اُنھوں نے اسمٰعیل کے بغل والی سیٹ جو سنبھالی، پھر تو لے خدا اور دے خدا، اسمٰعیل ہاں ہاں، نہ نہ کرتا رہ گیا، بار بار جھپٹ کر اپنے دل کا دروازہ بند کرتا، اپنا آپ سمیٹتا، فیضانِ رسول کے چار سوال کا ایک جواب دیتا، مگر اُس بندۂ خدا نے بھی دم نہ لیا، آہستہ آہستہ بہلا پھسلا کر چمکار کے، حیلے بہانے سے، بے حیا بن کر، زور زبردستی سے، غرض یہ کہ اسمٰعیل کے نہ چاہنے کے باوجود، بھیونڈی، بمبئی، پٹنہ، ساری رام کتھا...'' مہینوں بعد اسمٰعیل کو محسوس ہوا کہ شاید یہ سارا کچھ فیضانِ رسول کو بتا دینے پر، وہ مجبور بھی تھا اور اندر سے خواہش مند بھی—

مگر اُس دن تو غضب ہی ہو گیا۔ اسمٰعیل کلاس کر کے کلاس سے باہر نکل رہا تھا کہ اچانک پیچھے سے ایک ہاتھ اُس کے کاندھے پر ٹِکا، پلٹ کر دیکھا...انیل شرما تھا!

اسمٰعیل نے سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔

''اسمٰعیل...آؤ، گنگا کی طرف چلتے ہیں۔''

''نہیں! ابھی کچھ کام ہے، پھر کبھی۔'' اسمٰعیل نے حسبِ عادت اُسے ٹالنا چاہا۔

''پلیز اسمٰعیل...بس پندرہ منٹ!'' انیل کے لہجے میں کچھ عجب سی بات تھی، وہ اپنے انکار پر ٹکا نہ رہ سکا۔

گنگا کنارے پہنچ کر اسمٰعیل اور انیل دونوں کنارے بنے بالا ریز پر بیٹھ گئے۔

''کیا بات ہے؟'' جب انیل کچھ دیر تک کچھ نہ بولا تو اسمٰعیل نے بہت خشک لہجے میں سوال کیا۔

تِس پر بھی انیل کچھ نہ بولا، وہ اسمٰعیل کی طرف دیکھ بھی نہیں رہا تھا، اس کی نگاہیں سامنے گنگا پر ٹکی تھیں، گنگا اپنی دُھن میں گنگناتی اور بہتی چلی جا رہی تھی، دور پرُ دھند میں کھوئی گنگا کے سینے پر تیرتی کشتیاں، اور کچھ زیادہ دور پر بالکل ہی دھند میں کھویا گنگا کا وہ کنارا جس کے ہونے کا شبہہ ہو رہا تھا، مگر نظر نہیں آ رہا تھا، اور اس سے بھی پرے، پچھّم کی طرف بالکل انتہائی سرے پر گنگا کی طرف جھکا چلا آ رہا آسمان، ایسا لگ رہا تھا جیسے آسمان گنگا کا بوسہ لینا چاہ رہا ہے، یا اُس میں مل جانا چاہ رہا ہے، کون کس میں مدغم ہو رہا تھا، گنگا آسمان میں یا آسمان گنگا میں، یہ کہنا کل بھی مشکل تھا اور آج بھی!

انیل پاس پڑی کنکریاں اور چھوٹے چھوٹے پتھر اُٹھا اُٹھا کر گنگا کے سینے پر مار رہا تھا، لہروں میں ہل چل پیدا ہوتی، لگتا گنگا بے چین ہوئی جا رہی ہے، پھر آہستہ آہستہ شانت ہونے لگتی تو کسی جانب سے کوئی اور پتھر...''

''انیل! کیا بات ہے؟ کیا کہنا ہے؟ کہتے کیوں نہیں؟'' اسمٰعیل نے جھنجھلا کر، ذرا تیز لہجے میں اپنا سوال دہرایا۔

اور پھر عجب سی بات ہوئی۔ انیل شرما نے اسمٰعیل کا پیر پکڑ لیا۔ ''اسمٰعیل! مجھے معاف کر دو۔''

''ارے، ارے! یہ کیا پاگل پن ہے؟ کس بات کی معافی؟'' اسمٰعیل نے اچنبھے کے عالم میں بہت تیزی سے اپنا پیر چھڑایا۔

''اسمٰعیل!'' انیل نے پھر پیر پکڑ لیے۔ ''مجھے فیضان نے سب بتا دیا، جو کچھ تم پر بیتا، مجھے لگتا ہے یہ سب میں نے کیا، میں اَپرادھی ہوں، مجھے چھما کر دو، مگر مجھ سے ڈسٹینس مینٹین مت کرو... I آئی مِس یو!''

انیل کی آواز بھرّا گئی تھی، اب اُس کا ایک ہاتھ اسمٰعیل کے کندھے پر تھا۔

مدتوں بعد اسمٰعیل کو اُس کا یار جانی، اکشے یاد آ گیا۔

''جانتے ہو انیل؟ میرا سب سے اچھا دوست اکشے تھے، وہ بھی مارا گیا، ہر شریف آدمی مار دیا جاتا ہے۔'' اتنا کہتے کہتے اسمٰعیل کی آواز آنسوؤں میں ڈوب گئی۔

گنگا پر شام جھک آئی تھی۔

❖

کس بات پر معاملہ اتنا طول کھینچ گیا، اس کا اندازہ اسمٰعیل کو نہ ہو سکا، وہ جب یونیورسٹی کیمپس میں داخل ہوا تو اُس نے صرف اتنا دیکھا کہ انیل سے اور کلاس کے ایک دوسرے لڑکے سے بحثا بحثی ہو رہی ہے اور پھر دیکھتے دیکھتے بات گالی گلوج تک پہنچ گئی، اسمٰعیل ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ کسی طرح انیل کو وہاں سے کنارے ہٹا لے کہ اچانک اُس دوسرے لڑکے نے انیل پر ہاتھ چلا دیا، لاشعوری طور پر جواب میں انیل کا بھی ہاتھ چلا مگر شاید اُس دوسرے لڑکے کے ساتھ جو لڑکے وہاں موجود تھے، وہ یہی بہانہ ڈھونڈھ رہے تھے کیونکہ انیل کا جواب میں اُٹھا ہوا ہاتھ شاید اُس لڑکے تک ابھی پہنچا بھی نہ ہو گا کہ وہاں پر کھڑے کئی اور لڑکے انیل پر ٹوٹ پڑے، یہ بالکل غیر متوقع

صورتِ حال تھی۔ اسمٰعیل ایک منٹ کے لیے گڑبڑا بھی گیا، اور گھبرا بھی گیا۔ اُدھر انیل کو کئی لڑکوں نے چھاپ لیا تھا اور لگاتار مار رہے تھے۔

اچانک اسمٰعیل ٹوٹ پڑا اور اپنی پوری طاقت کے ساتھ انیل شرما کو حملے سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کرنے لگا۔ شور وغل سن کر کلرک اور چپراسی کے علاوہ ایک دو ٹیچر بھی پہنچ گئے۔ پھر کچھ لڑکے انیل کی حمایت میں بھی آگے بڑھے، اب دوسری طرف والوں کے لیے بھاگنے کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں تھا۔

مگر بھاگتے بھاگتے بھی انیل پر سب سے پہلے ہاتھ اُٹھانے والا گالی بک رہا تھا، انیل کو دھمکی دے رہا تھا اور اِسی کے ساتھ ساتھ اسمٰعیل کی طرف اشارہ کر کے چیخ رہا تھا۔

''اِس سالے کو دیکھو، یہ میاں ہے سالا؟ یہ بھومیہار کا ساتھ دیتا ہے؟ سالا بھومیہار کا ساتھ دیتا ہے!''

فیضان اُس وقت وہاں نہیں تھا، بعد میں پہنچا، اسمٰعیل نے تفصیل بتائی تو وہ ہنسنے لگا۔ اسمٰعیل پر ذرا جھنجھلاہٹ طاری ہوگئی۔ ''اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟''

''ارے یار! وہ سالا عشق کا معاملہ ہے، اس میں تم بلاوجہ کود گئے۔''

''مگر وہ لڑکا بھومیہار، بھومیہار کیا کر رہا تھا؟''

''وہ لڑکا گوالا ہے، بہار میں مسلمان گوالوں کے ساتھ ہیں اور گوالا بھومیہار کے خلاف ہے۔ اب تم گوالے کے خلاف جا کر اور بھومیہار کے ساتھ ہو کے لڑنے لگے تو اُس پر جھلاّہٹ طاری ہونی تو ضروری تھی۔

یہ ایک نیا منظر نامہ تھا اور اسمٰعیل کو جگہ جگہ اس کا سامنا کرنا پڑا۔

بہار کا موسم جا چکا تھا، پت جھڑ کا سامنا تھا۔ پرانے پتّے جھڑ رہے تھے، نئی کونپلیں نکل رہی تھیں۔ اسمٰعیل جب تاریخ میں گم ہوتا تو صدیاں اس کے سامنے اپنا روپ انوپ جھل جھل جھلکانے لگتیں، اسمٰعیل اتنا کچھ دیکھ چکا تھا کہ اب کچھ بھی نیا نہیں لگتا۔ اتنا کچھ جھیل چکا تھا کہ اب وقت کی کوئی بھٹّی اُس کا اپنا آپ نہیں تپا پاتی، اتنا بدلاؤ اُس کی اپنی زندگی میں تھپیڑے مارتا آیا اور گیا کہ اُسے کوئی بدلاؤ، انوکھا اور اَنچھوا نہیں محسوس ہوتا۔ اتنا کچھ وہ کھو چکا تھا کہ اب شاید اُس کے پاس کھونے کو کچھ باقی نہیں بچا تھا۔

کبھی کبھی ایسا لگتا کہ وہ اس سارے ڈرامے کا کوئی پاتر، کوئی کردار نہیں ہے۔ وہ تو ایک جوکر ہے، ایسے ہی ایک لمحے میں ایک سوال نے سر اُٹھایا کہ بہار میں مسلمانوں کی حیثیت بھی تاش کے ایک جوکر کی ہے کیا؟

اُس دن جی بھر کر اُداسی کے گھیرے میں آیا۔

میرے وطن، پیارے وطن! تجھ پہ دل قرباں، پر تیرا کسی کو خیال نہیں، سب کو اپنے جتھے کی فکر ہے۔

''اوئے اسمٰعیلا! تو خود کیا کر رہا ہے یار؟'' اچانک پھنکار گونجی اور وہ رات کے اندھیرے میں چھٹپٹا کر اُٹھ بیٹھا، کھڑکی پر کوئی پرچھائیں جھپٹا مار رہی تھی اور کمرے میں آواز کی بازگشت جاری تھی... ''مسلمان جوکر بنے یا غلام، تو کیوں پریشان ہے؟ تو کیوں پریشان ہے؟''

میاں میر والا پھر ایک تیر چھوڑ کر چلا گیا۔

وہ زمانہ ہی کچھ عجب تھا، مسلمان نشے میں جھوم رہے تھے، اقتدار میں حصہ مل گیا تھا، کیبنٹ میں ایک دو نہیں، پورے پورے سات منسٹر، وزیر اعلیٰ مسلمانوں کے ہر دُکھ درد میں شریک تھے، مزار پر قوالی ہو تو وزیر اعلیٰ موجود، خانقاہ میں عرس ہو تو وزیر اعلیٰ چلے آرہے ہیں، کباب کے بڑے شوقین تھے، ایک کباب بنانے والے کو اسمبلی میں لے آئے، مسلمان غنڈوں تک کو عزت دیتے تھے، مشاعرے میں بھی شریک ہوتے تھے، اور بہت سے قبرستانوں کو بھی چمکا دیا تھا، بھارتیہ جنتا پارٹی کو تو ایسی کھری کھری سناتے تھے کہ کیا مسلمان سنائے گا۔

❖

ایم۔اے۔ کا رزلٹ آگیا تھا، اسمٰعیل نے فرسٹ کلاس حاصل کیا تھا، ٹاپ کیا تھا ایک گوالے نے۔ اُس سال کلاس کا سب سے اچھا طالب علم انیل شرما تھا، مگر ٹاپ کیا ایک گوالے نے۔

اسمٰعیل کی اس بات پر اُس کا اپنا ماموں زاد بھائی بدک گیا تھا، ''آپ بھی بھیا کیا بات کرتے ہیں، جب تک برہمنوں، بھومیہاروں اور راجپوتوں کی چلی، مگدھ، پٹنہ، بھاگلپور، دربھنگہ، کہیں کوئی گوالا ٹاپ کر پایا؟ اب اُن کا وقت آیا ہے تو بھی وہ ٹاپ نہ کریں؟''

''تو پھر بدلاؤ کیسا آیا؟'' مگر اسمٰعیل نے یہ سوال نہیں کیا۔

اُس کے ایم.اے. پاس کر لینے پر ماموں سب سے زیادہ خوش تھے، کہنے لگے: ''ایم.اے. کر کے پروفیسر ہونے کی خود میری بڑی خواہش تھی، مگر قسمت کے لکھے کو کون ٹال سکتا ہے؟ بی.اے. کرتے کرتے ابّا کا انتقال ہو گیا اور ہم کو نوکری کرنی پڑی، بیٹوں کو پروفیسر بنانے کا خواب دیکھا تھا، تو بڑے میاں تجارت پر تُل گئے۔ منجھلے کو ایم.بی.اے. (M.B.A.) بھا گیا، چھوٹے کو انجینئرنگ کا شوق چرّا گیا۔ ارے پروفیسری آج بھی بڑی چیز ہے، کریم جاب ہے، اچھی تنخواہ، سوسائٹی میں عزت... بیٹا اسمٰعیل! تم تو لکچرشپ ہی میں جاؤ۔''

اسمٰعیل کو ماموں پر ہنسی آ گئی۔ بے چارے ماموں اپنا خواب میری آنکھ سے دیکھنا چاہ رہے ہیں۔

مگر وہ ماموں کا دل بھی تو نہیں توڑ سکتا تھا، اس کو دوبارہ خواب دیکھنے کے لائق بھی تو اُنہی نے بنایا، ایسے وقت میں پناہ دی جب خود پناہ خواب بن گئی تھی۔

''ماموں! لکچرشپ بھی اب آسان نہیں رہی۔ کونسٹی چیونٹ کالج میں اب بحالی کہاں ہو رہی ہے اور افلیٹڈ کالجوں کا حال بہت ہی خراب ہے۔'' اسمٰعیل نے اس انداز میں جواب دیا کہ ماموں کی بات بھی نہ اُٹھے اور اِس وقت یہ بات ٹل بھی جائے۔

''ارے نہیں بیٹا! ایک راستہ ہے۔'' ماموں بھی ایک دم تُلے بیٹھے تھے۔ ''ابھی کالج کانسٹی چیونٹ ہونے والے ہیں۔ اُن کالجوں کی اسکریننگ چل رہی ہے اور اسکریننگ کرنے والے صدر سکریٹری سے مل کے بیک ڈیٹ میں کچھ تقرریاں بھی کر رہے ہیں۔ ہم نے تو ایک کالج کا پتہ بھی چلا لیا ہے۔ اورنگ آباد میں ہے۔ رام لکشمن کالج، اس کے شعبہ تاریخ میں ایک سینکشنڈ پوسٹ خالی ہے، تم جا کے اُس کے سکریٹری سے بات تو کرو۔''

''ماموں! اُس میں تقرری کے لیے انتظامیہ پیسہ لیتی ہے۔''

''ہاں بیٹا! معلوم ہے۔ اسی لیے تو کہہ رہے ہیں، پیسہ دیا جائے گا۔''

''نہیں ماموں! یہ غلط بات ہے، پہلے ہی اتنا پیسہ پڑھائی پر خرچ ہو چکا۔''

''تم اب بنیے کی طرح بیٹھ کے جوڑ گھٹاؤ مت کرو، جو ماموں کہہ رہے ہیں وہ سنو۔'' مامی نے بڑے پیار سے اسمٰعیل کو ڈانٹا۔ اور اسمٰعیل کا ایک مرتبہ پھر اندر سے جی بھر آیا۔

''جو آپ لوگ کہیے.. دیکھیں گے۔'' اسمٰعیل نے آہستہ سے کہا اور اُٹھ گیا۔ طبیعت اندر سے

بوجھل تھی، اُسے رونا آ رہا تھا۔

کمرے میں داخل ہوا تو شہوار اُس کے بستر کی چادر بدل رہی تھی۔

شہوار نے چادر بدلتے بدلتے مڑ کر اسمٰعیل کو دیکھا، دونوں کی نظریں چار ہوئیں، اور اسمٰعیل گڑبڑا گیا۔

دل کا چور اسمٰعیل کی آنکھوں سے کھلواڑ کر رہا تھا۔

ڈھائی برس سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا تھا۔ اسمٰعیل اور شہوار دونوں ایک ہی چھت کے نیچے رہ رہے تھے، برس چھ مہینے کے بعد ہی اسمٰعیل نے شہوار کی توجہ کو محسوس کرنا شروع کر دیا تھا۔ مگر ہچکچاہٹ کا ایک پہاڑ سا اسمٰعیل کے سامنے تھا۔ اس نے اپنے آپ پر جبر کر کے شہوار پر توجہ نہ دینے کا لگاتار پوز دیا تھا مگر اس لمحے میں... جب شہوار نے چادر بدلتے بدلتے مڑ کر اسمٰعیل کو دیکھا... تو اچانک ہچکچاہٹ کا وہ پہاڑ دھنکی ہوئی روئی کے گالے کی طرح فضاؤں میں بکھر گیا، سامنے شہوار کی آنکھوں میں اپنائیت کا ایسا سمندر ہچکولے کھا رہا تھا جس کے مقابل آنے والا اُب چبھ کرتا ہے، مگر ڈوبتا نہیں... اسمٰعیل نے حتی الامکان کوشش کی کہ اس سمندر سے وہ باہر نکل آئے، لیکن اس سے پہلے کہ اسمٰعیل اپنی کوشش میں کامیاب ہوتا، شہوار مسہری کے پاس سے اُس کے نزدیک آ گئی، بالکل نزدیک، اتنا نزدیک کہ وہ شہوار کی سانسیں اپنے چہرے پر محسوس کر رہا تھا، اور سمندروں کا سینہ چیر کر شاید وجود کے اَن دیکھے بھنور سے لڑتی شہوار کی آواز اُسے سنائی دی۔ ''مبارک ہو۔''

بھنور سے اُبھرتی آواز مدھم تھی اور ہونٹوں پر برستی تھرتھراہٹ کی بارش سے شرابور!

پھر کمرے کے در و دیوار نے ایک منظر اپنے وجود میں محفوظ کیا۔ اسمٰعیل نے کپکپاتے ہاتھوں سے شہوار کے دونوں کاندھوں کو پکڑ لیا، شہوار اسمٰعیل کی طرف جھک آئی۔ اسمٰعیل نے اپنے لب شہوار کی پیشانی پر ثبت کر دیئے۔ شہوار کی آنکھیں بند تھیں اور اسمٰعیل کے آنسو شہوار کا چہرہ بھگو رہے تھے۔

ہوا کے ایک نرم اور رحیم جھونکے کی طرح یہ لمحہ آیا اور گزر گیا۔

شہوار نے بہت آہستگی اور نرمی کے ساتھ اسمٰعیل کے ہاتھ اپنے شانوں پر سے ہٹائے، اور نظر جھکائے کمرے سے نکل گئی۔

اُس رات بہت دنوں بعد، ایک گھمسان کی جنگ ہوئی، بے تلوار کی جنگ مگر ہر وار اسمٰعیل پر

تھا، اور لہولہان ہونے والا بھی صرف اسمٰعیل ہی تھا۔ برسہا برس بعد تمکنت کی پرچھائیں نظر آئی، اور
اُس کا وہی ایک پرانا الزام... بزدل، کائر۔ ابا ڈانٹ رہے تھے، یہ بہت غیر اخلاقی حرکت ہے،
بچے منھ پھلائے بیٹھے تھے۔ امّی کے ساتھ ہم لوگ بے ایمانی برداشت نہیں کریں گے، جائیے آپ
سے بات نہیں کرتے۔ سب سے زیادہ خفا تو بیوی تھی۔ ''آپ نے کچھ نیا تو نہیں کیا ہے، مرد کے
لچھن تو ہمیشہ سے ایسے ہی رہے ہیں، کہاوت بلاوجہ تو نہیں مشہور ہے کہ، کہنی کی چوٹ اور بیوی کی
موت محسوس تو ہوتی ہے انتہائی شدت کے ساتھ مگر پھر جلد ہی مٹ بھی جاتی ہے۔ آپ ہمارا کاہے
کو خیال رکھئے گا، ہمارا آپ کا رشتہ ہی کیا تھا، بس دو بول کا اور دو جسم کا۔ بہن بھی بھابھی کی حمایت
میں کھڑی ہوگئی۔ آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا، یہ تو کھلی بے وفائی ہے۔

اسمٰعیل تو اتنے تابڑ توڑ حملوں سے پاگل ہو گیا ہوتا، وہ تو کہیے کہ ماں اُس کے پیچھے ایک آہنی
ڈھال بن کے کھڑی ہوگئیں۔ بڑے مضبوط لہجے میں ماں نے سب کو ڈانٹا تھا۔ پاگل ہو گئے ہو تم
لوگ؟ وہ کیا اکیلے مر جائے؟ جینے کے لیے بہت کچھ جھیلنا پڑتا ہے، میرا بچہ تن تنہا سب کچھ جھیل رہا
ہے۔ تم لوگوں کو ذرا بھی رحم نہیں آتا؟

پھر اسمٰعیل کو اپنے سینے میں چھپا کر بولی تھیں۔ نہ میرے لعل، بہت ہو چکا، اب جی بوجھل مت
کر، تو جُگ جُگ جیے، جو بیت گئے سو بیت گئے۔ تجھے جینا ہے۔ جو رات بیت گئی، اُس کے
اندھیروں کو یاد کر کے صبح سے بگاڑ مت کر، دیکھ بیٹا صبح ہو رہی ہے۔

اُس سبھا کی سب سے خاص بات یہ تھی کہ مدتوں بعد وہ بھی آئی تھیں—
سب دیکھتی تھیں، مسکراتی تھیں اور ہمیشہ کی طرح چپ تھیں—
اُس رات اسمٰعیل پھپھک پھپھک کے رویا اور تڑپ تڑپ کے جاگا۔

❖

بابری مسجد کا تالا بھی کھل چکا تھا اور منھ بھرائی کے طور پر شاہ بانو کیس کے بہانے کلیسا ریاست
پر حاوی ہو چکا تھا۔ ''معروف'' کے مختلف معانی موجود تھے مگر کچھ لوگوں نے کاٹھ کے گھوڑے میں
ایسی چابی بھری کہ گھوڑا اُچھل اُچھل کے پیچھے بھی چلنے لگا اور دولتّی بھی مارنے لگا۔ کچھ لوگ بہت

خوش تھے کہ وہ جیت گئے، مگر اُن کو پتہ ہی نہیں تھا کہ وہ ہانکے پر ہیں، دکھانے والوں نے دِکھا دیا کہ
اگر ایک آستھا کے لیے پارلیمنٹ کا قانون بدلا جاسکتا ہے تو دوسری آستھا کے لیے پوری عمارت
گرائی جاسکتی ہے۔ عقل بڑی یا بھینس، لالو پرشاد یادو سمجھے کہ رتھ روک کے تیر مار لیا مگر کسی کو بھی
پتہ نہیں چلا کہ ''برہمن زادہ اودھ'' ۵ر ستمبر کو لکھنؤ میں زمین برابر کرنے کی بات کہہ کے کیا ہدایت
دے رہا تھا... بے چارہ شرنارتھی سندھی... اصل ہانکے پر تو وہ آیا... دھوبی کا کتّا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا!

سارا منظر نامہ ایک ملٹنگ پوٹ بن گیا تھا، سمجھ ہی میں نہیں آتا بھٹے کا کون دانا لاوا بنے گا،
کون جل کے راکھ بن جائے گا اور کون اُچھل کر برتن میں سے نکل بھاگے گا، جے پی تحریک کے
وقت دوسرا سماں تھا، نشانہ صرف کانگریس تھی، اُس وقت ذات پات کی سیاست کی ضرورت نہیں
پڑی، مگر جب جنتا دَل ٹوٹا اور اقتدار، اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کے ہاتھ سے نکل گیا تو جتھا بندی کا
عمل کافی تیز اور نمایاں ہو گیا۔

انیل شرما کے ساتھ جو ہنگامہ ہوا، اُس ایک دن کے ہنگامے تک پہنچ کر ختم نہیں ہو گیا، اُس
وقت تو اسمٰعیل اور فیضان کے سمجھانے سے انیل بھی خموش ہو گیا، پھر چوں کہ سالانہ امتحانات کو چھ
سات ماہ باقی تھے، اس لیے سبھی تیاری میں جٹ گئے۔ آخر کے تین چار مہینے یک گونہ بے خودی میں
گزر گئے۔ ویسے بھی سنٹ اَپ ہو جانے کے بعد یونیورسٹی سے عملی تعلق ذرا کم ہی ہو جاتا ہے۔ مگر
امتحان کا نتیجہ نکلنے کے بعد جب پی ایچ. ڈی وغیرہ کے سلسلے میں یونیورسٹی آنا جانا ہوا تو اندازہ ہوا
کہ کاسٹ لائن تو آہستہ آہستہ چوڑی ہوتی جا رہی ہے۔ دراصل انیل کے ساتھ ہونے والے
حادثے نے کاسٹ فیلنگ کی اس آگ پر تیل چھڑکنے کا کام کیا تھا۔

مگہی اور بھوجپوری علاقہ فارورڈ ہندوؤں کا گڑھ تھا۔ بھوجپور میں بکسر کا علاقہ تو پورے بہار
میں تہذیب کا پہلا مرکز مانا جاتا تھا۔ یہاں پچھّم کی طرف گنگا کے کنارے جو مندر ہے وہ تمام ہندوؤں
کے نزدیک بہت متبرک اور مقدس ہے۔ کہتے ہیں کہ شری رام چندر جی نے اِسی مقام پر بہت دِنوں
تک شیو جی کی عبادت کی، وِشوامتر رِشی اور وِشنو متر جی کے علاوہ بھی بہت سے رِشی مُنی بکسر اور اُس
کے آس پاس کے علاقے میں موجود تھے مگر تاڑیکا راکشش اِن بھلے لوگوں کو اکثر ستایا کرتا تھا۔ آخر
شری رام چندر جی نے اِن راکششوں کو مار کر ختم کیا جن میں سب سے بڑے راکشش کا قد
چالیس کوس چوڑا اور چار سو کوس اونچا تھا۔ اور اِس کارنامے کو سر کرنے کی خوشی میں اُس مقام پر ایک

شیومندر بنایا، شیومندر کے علاوہ خود شری رام کے لیے جو مندر بنایا گیا اُسے رمیشور جی (رام ایشور جی) کا مندر کہتے ہیں۔ [فلسطین میں ایک جگہ ہے رملّہ (Ramallah) اور یہاں رمیشور (رام ایشور) پتہ نہیں دونوں میں کیا تعلق ہے؟] اُدھر مگدھ کو بھی فخر ہے کہ اُس کے راجہ سہدیو بھی مہابھارت کی لڑائی میں شریک تھے۔ مگدھ پر تو اٹھائیس بادشاہوں نے حکومت کی تھی، جن میں چندرگپت سے اشوک تک سبھی نامی گرامی تھے۔ گوتم بدھ کو جو خود راجہ کے بیٹا تھے، اِسی مگدھ نے علم و عرفان اور نجات (موکش) سے نوازا، بعد کے دِنوں میں بھی ریاست ڈمراؤں اور ریاست ٹکاری بڑی ریاستیں تھیں۔ ان دو بڑی ریاستوں کے علاوہ ۱۸۵۷ء میں کنور سنگھ راجہ جگدیش پور کے علاوہ بھی بہت سے بہادر راجپوتوں اور ذی علم برہمنوں، بھومیہاروں اور کایستھوں کے قصّے اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کو زبانی یاد تھے۔

ظاہر ہے کہ ایسے میں بیک ورڈ ہندوؤں کی طرح طرح کی سیناؤں سے اُن میں ردِّعمل کا پیدا ہونا فطری تھا اور یہی ہوا بھی کہ پوری نکسلی تحریک اور گوالا گردی کا جواب دینے کے لیے بالآخر گولڈن آرمی اور سن لائٹ سینا جیسی سینائیں بھی وجود میں آ ہی گئیں۔

انیل کو جس طرح ذرا سی بات پر یادووں نے پیٹا تھا، اس کا ردِّعمل بھی بس ہوتے ہوتے رہ گیا، خود انیل اِس معاملے کو ابھی زیادہ آگے نہیں بڑھانا چاہ رہا تھا۔ ایم.اے. کا امتحان ابھی ختم ہوا تھا اور پی ایچ.ڈی. وغیرہ کے سلسلے میں انیل کے ساتھ دوسرے فارورڈ لڑکوں کو بھی فری موومنٹ اور پُرسکون ماحول کی ضرورت تھی۔ اس ماحول کو برقرار رکھنے کے لیے فیضان اور اسمٰعیل بھی انیل کا ساتھ دے رہے تھے۔

اُسی زمانے میں ایک دن انیل شرما اور اسمٰعیل کی ملاقات ہوگئی، دونوں ٹہلتے ہوئے گنگا کے کنارے پہنچ گئے، اور آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے۔ ریزلٹ کے بعد دونوں دوسری مرتبہ ملے تھے۔

''کیا کر رہے ہو؟'' انیل نے پوچھا۔

''عیش!'' اسمٰعیل کا جواب بہت مختصر تھا۔

''بھگوان ایسا ماما سب کو دے۔''

''ہاں یار! سو تو ہے۔''

''پی ایچ.ڈی. کے لیے کوئی ٹاپک چنا؟''

''ایک ٹاپک بار بار دماغ میں گونج رہا ہے، اس پر ابھی تک کام نہیں ہوا ہے۔''

''کون سا؟''

"Muslim's Contribution in Anciant India" (عہدِ قدیم میں مسلمانوں کی حصہ داری)

انیل شرما ہڑبڑا کر ایک دم کھڑا ہوگیا۔

''ابے او مسلمنٹے! یہ کون سا کھڑاگ پھیلانے کی بات تو سوچ رہا ہے؟ پراچین بھارت میں مسلمان کہاں؟''

انیل کو کھڑا ہوتے دیکھ کر اسمٰعیل گنگا کنارے، ٹھنڈے ٹھنڈے بالو پر لیٹ گیا اور مسکراتے ہوئے بولا:

''گرو! بھاگو مت، کتنا اسکیپ کرو گے؟ غلام وَنش سے بات شروع ہوتی ہے مگر محمد بن قاسم ہندوستان کب آیا، لاہور کے بابا ہجویری لاہور کب آئے؟ وہ پورا پیریڈ جو سوداگروں اور فقیروں کا پیریڈ ہے، اُس کو صرف اِس لیے اَن چھوا چھوڑ دیا جائے گا کہ اُس زمانے میں ستا مسلمانوں کے پاس نہیں تھی۔'' اسمٰعیل نے انیل کے منھ پر ہاتھ نچایا۔

''ارے بھائی۔'' انیل اب سنجیدہ ہوگیا تھا۔ ''ہسٹری میں جب بات ہوئی ہے ہیڈ آف اسٹیٹ کے ریفرنس ہی سے بات ہوئی ہے۔ ساری ایکٹیویٹی کا کیندر بندو تو وہی رہتا ہے۔''

انیل بھی بیٹھ گیا اور اسمٰعیل بھی۔ پھر اسمٰعیل نے انیل کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا:

''یار! فلاسفی آف ہسٹری پر نئے سرے سے سوچ وِچار کیا جا رہا ہے، تو ایسا نہیں سوچا جا سکتا کہ جس پوائنٹ کو سنٹرل پوائنٹ بنایا گیا ہے، سچ مچ وہ سنٹرل پوائنٹ نہیں!''

''ایسا کیسے کہہ سکتے ہو؟''

''جنتا جناردھن کو دیکھو، عام آدمی کو پڑھو، تم دیکھو گے کہ عام آدمی کی جو ہیومن ایکٹیوٹی ہے، جاگرُکتا ہے، وہ سرکاروں سے اتفاق اور سہمتی کا سمبل، علامت نہیں بن پاتی۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ جتنی اینٹی پیپل ایکٹیویٹی ہے، عام آدمی کا ایک خاص وَرگ، چاہے کسی بھی کارن ہو، اُسی میں سرکار کا ساتھ دیتا ہے، کربلا سے بنگلہ دیش بلکہ پنجاب کے پورے اپی سوڈ کو ذہن میں رکھو۔''

''یار! بات تو تم کچھ کچھ ٹھیک کہہ رہے ہو، مگر پھر بھی پراچین بھارت میں مسلمانوں کی حصہ

داری کیسے ڈھونڈو گے؟''

''یہاں جب مسلمان شروع شروع میں آئے تو، یا تو بزنس کرنے والے یا پھر صوفی سنت لوگ، دونوں کا رشتہ عام آدمی سے سیدھا رہتا ہے۔ ریسرچ کا بنیادی تصور، بیسک کنسپٹ یہی ہوگا، آنے والوں کا جو طور طریقہ تھا، اُن کا جو کلچر تھا، جو بولی تھی، اُن کے جو وِچار تھے، اِن سب کا کچھ نہ کچھ آدان پردان یہاں والوں سے تو ہوا ہی ہوگا، دیکھنے کی بات یہ ہے کہ محمد بن قاسم کے آنے سے پہلے یہاں کا کلچر، بولی اور وِچار کیا تھے اور محمد بن قاسم یا بابا ہجویری کے آنے کے بعد دونوں جگہوں کی تہذیبوں، بولیوں اور وِچاروں میں انٹریکشن ہوا یا نہیں، ہوا تو کیسے ہوا، کس نے کس کو کیا دیا، کس نے کس سے کیا لیا، کیا یہ سب کچھ ریسرچ کا ٹوپک نہیں ہوسکتا؟''

''ہاں پیارے، ٹوپک تو فرٹائل (fertile) ہے، مگر بیٹے خان، محنت بہت کرنی پڑے گی؟''

''سوتو ہے، دیکھا جائے گا۔ ویسے اِس ایک پر ٹِکا ہوا نہیں ہوں، اور موضوعات پر بھی سوچ رہا ہوں۔''

پھر آہستہ آہستہ دونوں کی باتوں کا موڈ بدل گیا، دونوں محسوس کررہے تھے کہ آگے کچھ ایسا ہے جو دونوں کو دو سمتوں میں لے جانے والا ہے، بیتے ہوئے دو تین سال دونوں کے سامنے کبھی لیا گیا سانس، کبھی محسوس کی ہوئی خوشبو، یا کبھی انتہائی پیاسے پل میں ٹھنڈے ٹھنڈے پانی کا پہلا گھونٹ بن گئے تھے۔

دونوں بے تکان بول رہے تھے، دنیا جہان کی باتیں کررہے تھے، نیلما اب نظر نہیں آتی، آسوتوش سنا کہ دہلی میں ہے، ربّانی گھر لوٹ گیا، نزہت کی شادی ہوگئی...اور وہ...اور وہ...''

بیچ میں کئی مرتبہ اسمٰعیل کا جی چاہا کہ وہ شہوار والا اپی سوڈ بیان کردے۔

مگر ہر مرتبہ اندر اندر کوئی بہت ہی طاقت ور، رُکاوٹ آن کھڑی ہوتی۔

اچانک اسمٰعیل نے محسوس کیا کہ انیل کی آنکھیں لَو دینے لگیں، وہ پہلے تو سمجھ نہیں پایا، دراصل وہ صرف انیل کی آنکھوں کی طرف متوجہ تھا، وہاں رنگوں اور روشنیوں کی بارش سی ہوتی محسوس ہو رہی تھی، پھر اسمٰعیل نے انیل کی آنکھوں کا تعاقب کیا، تو عقدہ کھلا...دیکھا کہ شوبھا چلی آرہی ہے۔

اُسے یاد آیا کہ شوبھا کی وجہ سے ہی انیل پر اُس لڑکے نے حملہ کیا تھا اور بعد میں فیضان رسول نے بتایا تھا کہ معاملہ دل کا ہے—

اسمٰعیل نے انیل سے جب بھی پوچھا تو انیل مُکر گیا۔ مگر آج تو چور رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا۔

شوبھا قریب آتی جارہی تھی اور انیل اُسے ایک ٹک دیکھے جارہا تھا۔

''میں تم کو کہاں کہاں ڈھونڈ چکی اور تم یہاں بیٹھے ہو؟''

''کیا بات ہے؟ تم یہاں کیسے پہنچ گئیں؟'' انیل جیسے اپنے کو سنبھالتے ہوئے آہستہ سے بولا۔

''تم نے ایک مرتبہ بتایا تھا کہ تم اور اسمٰعیل گنگا کنارے بیٹھتے ہو، یہی سوچ کر اِدھر چلی آئی۔''

''آیئے...آپ بھی بیٹھئے نا! گنگا میّا کے چرنوں میں بیٹھ کر بڑی شانتی ملتی ہے۔'' اسمٰعیل نے ذرا مسکرا کر کہا۔

''ابھی نہیں اسمٰعیل بھائی۔ دعا کیجیے کہ بھگوان ایسا اَوسر دے...انیل! تم ذرا میرے ساتھ چلو۔'' شوبھا کا لہجہ بہت گمبھیر تھا۔

''بات کیا ہے؟ بتاؤ تو!'' انیل شاید کسی کشمکش کا شکار تھا۔

شوبھا چپ رہی، اُس کے انداز سے ہچکچاہٹ جھلک رہی تھی۔ وہ شاید انیل سے اکیلے میں کچھ بات کرنا چاہتی تھی۔ وہ کھڑی رہی اور اُس کے چہرے سے بے چینی جھلکتی تھی۔

''شوبھا!'' انیل نے بہت ہڑبڑا کر کہا۔ ''ہمارے تمھارے لیے سب سے اچھا دوست اسمٰعیل ہی ہوسکتا ہے۔ بیٹھ جاؤ اور بتاؤ کیا بات ہے؟''

شوبھا بیٹھ گئی۔ بہت دیر تک چپ بیٹھی رہی، پھر بہت بوجھل لہجے میں نظریں جھکائے بولی۔

''میرے تمھارے بارے میں اَب بات کھل گئی ہے، شیلیش، جس سے تمھارا جھگڑا ہوا تھا، پرسوں گھر آیا تھا۔ پتا جی سے بہت دیر تک بات کرتا رہا، اور اُس کے جانے کے بعد سے گھر والوں کا انداز بدل گیا ہے۔''

اس خبر پر انیل بالکل سکتے میں آ گیا۔ بہت دیر تک تینوں کے درمیان ایک تکلیف دِہ چپ تانڈو نرت کرتی رہی۔ انیل اور شوبھا کے مسئلے سے وہ کچھ کچھ آگاہ تھا، مگر یہ معاملہ اتنی دور جاچکا ہے؟ اسمٰعیل کو اس کا اندازہ نہیں تھا۔ اُسے تمکنت یاد آئی، پڑھنے کے زمانہ کی جذباتیت کو تو خود وہ جھیل چکا تھا، لیکن ایم۔اے۔ کرنے کے تقریباً سال بھر بعد بھی انیل اور شوبھا ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے، یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ دونوں ایک دوسرے کے اندر اندر بہت دور تک اُتر گئے ہیں، مگر اسمٰعیل یہ بھی جانتا تھا کہ شوبھا چندرونشی (یادو) ہے اور انیل بھومیہار۔ ہندوؤں کے

یہاں ذات پات کا جو نظام ہے وہ ان دونوں کے لیے کتنے مسائل پیدا کرے گا، اِس کا کچھ کچھ اندازہ تو اسمٰعیل کو تھا۔ تمکنت کے ساتھ تو یہ مسئلہ نہیں تھا، تس پر بھی وہ کیا کر سکا؟ یہاں تو شیلیش نے ذات پات کے تعصّب کو ہوا دے کر شوبھا کے گھر والوں کو بھی انیل کی مخالفت میں کھڑا کر دیا تھا۔ یہ ایک خطرناک صورتِ حال تھی۔

اچانک انیل ایک جھٹکے سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے اس طرح اچانک کھڑے ہو جانے کے سبب اسمٰعیل گڑبڑا گیا اور شوبھا بھی... وہ دونوں بھی بے سوچے سمجھے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

پھر یوں ہوا کہ جنت کے دَر کھل گئے۔ فرشتوں کے پرے کے پرے گنگا کے ساحل کی طرف رحیم و کریم نگاہ سے دیکھنے لگے۔ گنگا کی لہروں میں ہل چل سی مچی، ایک عجیب سی موسیقی بلکہ سمفنی جیسا کچھ گنگا کے بے قرار پانیوں پر تیرنے لگا اور گونجنے لگا۔ گرمی پھیلاتا سورج ڈوب جانے کے آخری مراحل میں تھا... ساحل پر اور انجان دوریوں اور مسافتوں کی طرف ترل ترل بہتی گنگا کی بے قرار موجوں پر... جتنی دور تک نگاہ جاتی، لگتا جگنوؤں کا ست رنگا میلہ سا لگا ہوا ہے۔ ساری دِشاؤں میں بھادوں اور کنوار کی انترگھٹ تک اُترتی میٹھی میٹھی ٹھنڈک... خوشبو، ہوا اور درد کے لہریے کی طرح محسوس تو ہو رہی تھی مگر دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

اسمٰعیل نے ایک پل کے لیے جنت سے اُترے اُس ایک ''دیو چھنڑ'' (ملکوتی لمحہ) کو دیکھا تھا۔ پھر آپ ہی آپ آنکھیں مُند گئی تھیں۔

انیل اور شوبھا ایک دوسرے کو بے تحاشہ پیار کر رہے تھے۔

وہ دونوں ایک دوسرے کو انگ انگ چوم رہے تھے اور رو رہے تھے۔

اور اسمٰعیل گنگا کنارے، ندی کی ریت پر چت لیٹا تھا اور اُس کی آنکھوں کے پٹ بند تھے۔

اُس دن کے بعد پھر انیل اور شوبھا سے اُس کی ملاقات نہیں ہوئی۔

بعد میں فیضان رسول نے بتایا کہ دونوں نے اپنا اپنا گھر ہی نہیں صوبہ بھی چھوڑ دیا۔ مگر دونوں کے گھروں اور ذات والوں کے درمیان مدتوں خاصا تناؤ کا ماحول بنا رہا۔

• • •

6

انیل اور شوبھا کے صوبہ چھوڑنے (Self Exile) کے بعد!

کچھ دن یا کچھ مہینوں بعد—

اسمٰعیل کو فیضان رسول کے ساتھ، فیضان کے آبائی دیہات ''میران بیگھہ'' میں ایک ہفتہ، یا اُس سے کچھ زیادہ، یا اُس سے کچھ کم... قیام کرنے کا موقع ملا تھا۔

اُن دنوں رات میں بارہ ایک سے پہلے دونوں کو بستر کا دھیان بھی نہ آتا تھا۔ صبح سویرے بالکل جھٹپٹے کے وقت اسمٰعیل باہر نکل جاتا، ساری فضا دھلی دُھلائی ہوتی، رات بھر کھیتوں کھلیانوں اور درختوں پر شبنم گرتی رہتی، صبح سویرے لگتا جیسے پوری فضا نے منھ دھو لیا ہو، اِردگرد دور دور تک تھوڑی تھوڑی دور پر دیہاتوں کا ایک لمبا سلسلہ—

فیضان نے یہ بھی بتایا تھا کہ علاقے پر زیادہ اثر بھومیہاروں کا ہے، اور پھر یہ اطلاع بھی فیضان نے دی تھی کہ بارہ گاؤں کا اصل نام نصرت پور بارہ تھا اور میران بیگھہ کا اصل نام سیّد پور بارہ تھا۔ پھر فیضان نے یہ بھی بتایا کہ نصرت پور (بارہ گاؤں) والے زیادہ تر میران بیگھہ والوں کے اسامی تھے، جو وقت کے ساتھ ساتھ خود زمین دار بن گئے اور نصرت پور بارہ گاؤں بن گیا۔

''مگر یار،'' اسمٰعیل نے پوچھا تھا۔ ''بھومیہاروں کے بارے میں تو بہار میں طرح طرح کی افواہیں ہیں۔''

''یہاں ہر افواہ غلط ثابت ہو چکی۔'' فیضان کا ہمیشہ ایک ہی جواب رہا۔ ان کے اور ہمارے درمیان اتنے اچھے تعلقات ہیں کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔''

ایسی باتیں سن کر حیرت اور مسرت دونوں کا احساس ہوتا اور اسمٰعیل خوش دلی کے ساتھ علاقے میں گھومتا رہتا۔

فیضان رسول صحیح النسب سیّد ہونے کا دعویدار تھا اور اُس کے جدّ اعلیٰ کا مزار بھی اِسی علاقے

میں تھا اور وہ میران جی کے نام سے جانے جاتے تھے اور فیضان حضرت میران جی کی نسبت ہی سے خود کو میرانی لکھتا تھا۔

''کیا اس علاقے میں مسلمان اور بھومیہار کے علاوہ اور کوئی قابل ذکر نہیں ہے؟'' ایک دن اسمٰعیل نے فیضان کے ساتھ ٹہلتے ٹہلتے اچانک سوال کر دیا۔

''ایسا ہی سمجھ لو...دراصل اُن کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔''

''کیوں؟ حیثیت کیوں نہیں ہے۔''

''یہ کیا سوال ہوا؟ بس نہیں ہے، نہ پہلے تھی نہ اب ہے۔''

''فیضان رسول صاحب! ہوش کے ناخن لیجیے۔ زمانہ بدل چکا۔ آج وہ سب کچھ ''موجود'' ہے جو پہلے ''غیر موجود'' تھا۔''

ٹہلتے ٹہلتے دونوں ''ہریجن ٹولے'' کی طرف نکل آئے تھے۔ دونوں ایک چوڑی مینڈھ پر ٹہل رہے تھے جس سے کچھ فاصلے پر سامنے ہریجن ٹولہ آباد تھا۔ اچانک اسمٰعیل ایک جھونپڑی نما مکان یا مکان نما جھونپڑے کی طرف مڑا اور فیضان رسول چونک کر پہلے تو رُک گیا، پھر تیزی اور سختی سے اُس نے اسمٰعیل کے بازو پکڑے... ''اُدھر کہاں جا رہے ہو؟''

''اُس جھونپڑی میں۔''

''کیوں؟''

''ہندوستان کی ۸۵ کروڑ جنتا کا حال جاننے کے لیے۔''

''لوٹ آیئے جناب!'' فیضان نے پیچھے سے اسمٰعیل کی گردن پکڑی۔ ''یہ میران بیگھہ ہے، یہاں چماروں کے جھونپڑوں میں شرفا نہیں جاتے۔''

''جناب سیّد فیضان رسول میرانی۔ مکینہ سجادۂ خانقاہِ میرانیہ۔ حضورؐ کا عمل یاد ہے۔''

''جناب! آپ ہندوستان میں ہیں۔''

''مگر آپ تو اپنا سلسلہ وہیں سے جوڑتے ہیں۔''

''ارے رُک جا یار! مروائے گا کیا؟ ابّا کو خبر ملی تو میری کھاٹ کھڑی ہو جائے گی۔''

''۸۵ کروڑ جنتا کو دیکھنے کی حسرت دل کی دل ہی میں رہ گئی۔'' اسمٰعیل آہستہ سے بدبدایا اور فیضان میرانی کے ساتھ ہولیا۔

وہاں سے دونوں مڑے تو ایک پن گھٹ پر رہٹ سے نکلنے والے پانی کا مزا لیا، ایک جگہ گڑ بن رہا تھا، وہاں گڑ کی دو چار چھوٹی چھوٹی بھیلیاں (گول گول بنی ہوئی) ملیں۔

''لو، کھاؤ۔ شاہ صاحب کی نذر ہے۔'' فیضان رسول مسکرا کر بولا۔

''اور تم لوگ کیا نذر کرتے ہو۔''

''ہم لوگ صرف نذر لیتے ہیں۔''

''یہیں مارا گیا ہندوستان۔ یہ جو پسماندہ طبقے سے دوری کا ماحول ہے۔ اسے تم لوگوں کی طرف سے سنگھ برادران کی نذر کیوں نہ سمجھا جائے؟''

''سالے غصہ مت دلاؤ۔'' فیضان رسول غرّایا۔ ''ہم صحیح النّسب اشراف، ہمارے اجداد خلافت وحکومت کے مستحق تھے، ہم کسی کی وجہ سے اپنا رویہ نہیں بدلا کرتے۔''

''حضرت! آپ کے اس بیان سے بوئے شیعیت می آید۔ یا پھر آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آپ کے اجداد بھی اسی طرح ہمیشہ پسماندہ اقوام وافراد سے کنارے کنارے رہے۔''

''ابے چپ! وکیل کی طرح عدالتی نکتے نہ نکال۔''

پھر بات کا رُخ بدل جاتا مگر بات تو کم وبیش وہی تھی۔ سنگھ برادران کے تعلقات مسلمانوں کے علاوہ اور کسی سے صحیح نہیں تھے اور مسلمانوں میں بھی میرانی خاندان سے شاید اس لیے کہ خود یہ خاندان صاحبِ جائیداد تھا اور جب صاحبِ جائیداد ہوا کرتا تھا تب بارہ گاؤں والے اُس کے اسامی تھے۔

''کل کی پرجا، اپنے کو، کل کے مالک کے سامنے اسامی کے بجائے، آج کے زمیندار کی حیثیت سے روشناس کرا کے شاید خوش ہوتی ہو۔'' اسمٰعیل کے جی میں ایک عجیب سی بات آئی۔

اُنہی دنوں فیضان میرانی کے ایک چچازاد کا انتقال ہو گیا۔ وہ بھی کبھی صاحبِ جائیداد ہوا کرتے تھے، مرا ہاتھی سوا لاکھ، مرتے مرتے بھی تقریباً پچاس ساٹھ بیگھہ زمین چھوڑ گئے۔ مرے تو پورا گاؤں ہی نہیں اِرد گرد کا علاقہ بھی ٹوٹ پڑا معلوم ہوا کہ آدمی با اخلاق تھے اور انگریزوں کے زمانے کے میٹرک پاس۔ بڑے زوروں کا کہرام مچا۔ پھر اُن کی موت کے چوتھے یا پانچویں دن دیوالی پڑی تو بارہ گاؤں کا اندھیرا ویسے کا ویسا ہی رہا، جب کہ دوسرے دیہاتوں میں جلتے چراغوں کی روشنیاں دیوالی کی رات کی خبر دے رہی تھیں۔

''فیضان! بارہ گاؤں میں کوئی خاص بات ہوئی ہے کیا؟''
''نہیں تو۔''
''پھر آج دیوالی کی رات میں اتنا اندھیرا کیوں؟''
''اوہ! تم کو تو بتانا ہی بھول گیا۔ چچا صاحب کا انتقال ہوا ہے نا؟ بارہ گاؤں والے ہمارے دُکھ سکھ دونوں کے شریک ہیں۔ ہم دونوں کے یہاں جب بھی کوئی موت ہوتی ہے تو مرنے والے کے چالیس کے پہلے ہم دونوں کسی بھی تیوہار میں خوشی کا اظہار نہیں کرتے۔''
اسمٰعیل حیرت سے صرف فیضان کو دیکھتا رہ گیا۔ اُسے لگا فیضان کوئی کہانی سنا رہا ہے۔
اسمٰعیل کیا کہتا چپ رہا، پھر وہ لمحہ گزر گیا، بات آئی گئی ہوگئی۔ اسمٰعیل کو یاد آیا وہ میران بیگھہ میں تقریباً پندرہ دن رُکا تھا، پھر گیا میں ایک ننیہالی رشتہ دار سے ملنے چلا آیا تھا۔ برسوں بعد بچھڑے ملے تھے، بودھ گیا گھومنے کی بھی خواہش تھی۔ اسمٰعیل گیا میں بھی کئی دن رُک گیا۔ ایک دن بودھ گیا سے لوٹ رہا تھا تو کچہری کے پاس فیضان رسول سے ملاقات ہوگئی۔ اس کے ساتھ اُس کا وہ چچازاد بھائی بھی تھا جس کے والد کا ابھی کچھ دنوں پہلے انتقال ہوا تھا۔
''ارے تم کہاں؟''
''ذرا کچہری آیا تھا۔'' دریافت حال پر فیضان نے بتایا کہ دونوں چچا صاحب کی کسی زمین کی رجسٹری کرانے آئے ہیں۔
''کون لے رہا ہے؟'' اسمٰعیل روا روی میں پوچھ بیٹھا۔
''بارہ گاؤں کے مہیشور چچا کو دے رہا ہوں۔'' فیضان رسول کا عم زاد بولا۔
''ہم لوگوں کے یہاں کوئی موت ہوتی ہے تو مرحوم کے چہلم کے پہلے بارہ گاؤں والے کوئی خوشی نہیں مناتے۔'' فیضان رسول کا ہفتہ دس دن پہلے کہا ایک جملہ اچانک فضا میں گونج اُٹھا۔
بہر حال! یہ بات بالکل اچانک نکل آئی۔ بات تو دراصل میران بیگھہ کے اُن دنوں کی چل رہی تھی جب اسمٰعیل میران بیگھہ میں ہوا کرتا تھا۔
اُنہی دنوں ایک دن... ایک نوجوان فیضان کے بنگلے میں داخل ہوا۔ فیضان نے اُسے دیکھتے ہی لپک کر گلے لگایا۔
''سالے دِکھاوا کرتے ہو؟'' وہ نوجوان بھی بے تحاشہ فیضان سے لپٹ گیا اور بے تکلّفی سے

بولا۔ ''آٹھ دِنوں سے آئے ہوئے ہو اور گھر آنے کی نہیں سوجھی؟ میں تو ظفر چچا کے انتم سنسکار میں نہ آسکا۔ اگر کل پتا جی ماں سے بات نہ کر رہے ہوتے تو مجھے پتہ بھی نہ چلتا۔ اور اماں الگ بگڑی ہوئی ہیں۔ چلو تم گھر تو ڈانٹ پڑتی ہے۔''
''معاف کرنا یار، تین دنوں سے سوچ رہا ہوں، مگر روز کوئی نہ کوئی جھنجھٹ اُٹھ کھڑا ہوا۔ کل تو چچا صاحب کا سوئم کا فاتحہ ہی تھا۔ تو ہی بتا کیسے آتا؟''
''ہاں سو تو ہے، اچھا چھوڑ، اب چلا چل۔''
ایسا لگا جیسے فیضان بھی جانے کے لیے پَر ہی تول رہا تھا۔ فوراً تیار ہوگیا۔ کھڑے ہوتے ہوئے اُس نے نووارد سے میرا تعارف کرایا۔ ''یہ بھی میرے دوست ہیں... اسمٰعیل!''
''آہاہا۔ تب تو آپ ہمارے بھی دوست ہوئے۔ ہاتھ ملائیے۔ میرا نام نولیش ہے اور آپ بھی تیار ہو جائیے۔ شریمان لوگ تو یاروں کے یار ہوا کرتے ہیں، مگر ہم یاروں کے یاروں کے یار ہیں۔''
''مگر نولیش خدا کے لیے دال کی دال مت پلا دینا۔'' اسمٰعیل نے ہنس کر کہا۔ اس پر تینوں ہنس پڑے، پھر تینوں ہنستے ہنساتے، لطیفے سناتے بارہ گاؤں کی طرف چل پڑے۔
تینوں فیضان کے گھر سے چلے، میران جی کے مزار سے ہوتے ہوئے سڑک پر آگئے۔ سڑک کبھی پختہ رہی ہوگی، مگر اَب تو نہ کچی تھی نہ پکّی۔ پانچ سات منٹ اُس سڑک پر چل کر تینوں نیچے اُتر گئے، پھر ایک چوڑی پنڈ (کیاری) پر چڑھے، پنڈ اتنی چوڑی تھی کہ اُس پر آٹو، رکشہ وغیرہ آسانی سے آجا سکتا تھا۔ وہی پنڈ بارہ گاؤں تک چلی گئی، گاؤں کے اِردگرد تاڑ کے درخت، بانس واڑی، ایک دو نیم کے درخت، گاؤں کے باہر کنواں، نولیش کا گھر گاؤں کے بیچ تھا۔ نہ بہت عالی شان نہ بہت معمولی، ایک گھر جو گھر والوں کی محنت کی کہانی بھی کہہ رہا تھا اور سلیقے کی بھی۔
''ماں جی! دیکھئے میں اس بدمعاش کو لے آیا۔'' نولیش نے گھر میں داخل ہوتے ہوئے پکار کر کہا۔
ماں جی فوراً باہر آگئیں۔ فیضان نے پیر چھوا، ماں جی نے آشیرواد دیا۔ ''جُگ جُگ جیو بیٹا۔'' اسمٰعیل نے ایک ہاتھ اُٹھا کر آداب کیا، اُسے اچانک مولانا عبداللہ سرحدی یاد آگئے تھے۔ اُنہوں نے بتایا تھا کہ پیر چھونے سے شرک ہوجاتا ہے۔ ماں جی نے مسکراتے ہوئے کہا: ''جیتے رہیے،

خوش رہیے۔'' اسمٰعیل کو لگا کسی نے گلاب اور کیوڑے کا ٹھنڈا ٹھنڈا چھڑکاؤ کر دیا۔ ماں جی پھر فیضان کی طرف مڑیں۔

''کیوں لڑکے؟ آٹھ دن سے آیا ہوا ہے، ماسی کو دیکھنے کو دل نہیں چاہا۔

پھر اسمٰعیل کی طرف رُخ کیا۔ ''تم کون ہو بیٹا؟''

نولیش نے تعارف کرایا تو ہلکے سے مسکرائیں اور بولیں: ''بیٹے کا دوست بھی بیٹا ہی ہوتا ہے۔'' پھر فیضان کی طرف مڑیں: ''تجھے یاد نہیں، تیری ماں میری سگی نہیں بہن ہے، تبھی تو اُس نے تیرے پیدا ہونے کے بعد تجھے اپنی ماں جائیوں کو نہیں میری گود میں دیا۔ مرنے کے بعد بھگوان نے پوچھا تو اُس کو کیا جواب دوں گی؟''

''ماں... خالا سے کہہ دیجیے گا کہ لڑکا سدھرنے کا نام نہیں لے رہا ہے۔'' نولیش منمنایا۔

''زیادہ بکر بکر مت کر، تیرا حال پوچھا تو کیا کہوں گی؟ چور چور موسیرے بھائی؟''

''دیکھیے دیکھیے بجّو!'' نولیش کا رُخ اسمٰعیل کی طرف تھا۔ ''یہ فیضان کا بچہ آ گیا اور اِن کی بے ایمانی شروع ہوگئی۔''

پھر ماں جی بہت دیر تک باتیں کرتی رہیں۔ بہت چھوٹی چھوٹی باتیں جو سننے میں بالکل سامنے کی باتیں لگتیں۔ لیکن تھوڑی دیر بعد احساس ہوتا کہ وہ تو ہلکے پھلکے انداز میں وہاں موجود لوگوں کو خوش خوش جینے کا طریقہ بتا رہی ہیں۔ اسمٰعیل کو محسوس ہوا کہ وہ کسی گاتھا یا داستان کی داستانوی فضا میں سانس لے رہا ہے۔ بھلا عام دنوں میں کہیں ایسا ہوتا ہے کہ دو مسلمان بچے ایک ہندو عورت کی ممتا کی بارش میں خود کو پور م پور بھیگتا محسوس کریں۔

اچانک دروازے کا پردہ ہٹا—

دروازے کا پردہ ہٹا اور ایک لمحے کے لیے سب کچھ تھم سا گیا۔

دیہات کا عام مطلب ہوتا ہے کھیت کھلیان، چوپال کنواں، کچی سڑک، گرد و غبار، چھوٹی چھوٹی نالیاں، چھپّے، کیچڑ، کائی زدہ جوہڑ اور تالاب جس میں آدمی اور جانور ایک ساتھ نہاتے، چھوٹے چھوٹے، نیچے نیچے مٹی اور کھپریل والے گھر، گھروں میں برسہا برس پہلے کی سفیدی کے مدھم نشانات، کھپریل یا پائے میں ہُک سے ٹنگی نیلی لالٹین، چھوٹے چھوٹے طاقوں پر رکھے کالے کالے مٹی کے دِیے، اُن دِیوں کی لو سے چاروں جانب پھیلی کالک، سر میں چپڑ چپڑ تیل دیے مرد، ناک سے

نیٹا بہاتے بچّے، میلی چکٹ ساریاں پہنی عورتیں، بجھی بجھی، دبی دبی، پسی پسی بے رنگ و روغن، سپاٹ مردہ چہروں والی بے کشش لڑکیاں۔

یہ سب کچھ ایک طرف اور دوسری طرف... دروازے کا پردہ ہٹا اور ایک لمحے کے لیے سب کچھ تھم سا گیا۔

شعاعوں کا جھپکا، یا روشنی کی چھوٹ، یا تجلّی کا زیر و بم، یا جلوہ فرمائی کا جادو...

اُس پہلے لمحے کے لیے اسمٰعیل کو ساری زندگی کوئی صحیح اور متناسب تشبیہ نہیں مل سکی، لیکن دروازے کا پردہ ہٹا تو اسمٰعیل کو بس یہی محسوس ہوا کہ ایک لمحے کے لیے سب کچھ تھم سا گیا۔

اسمٰعیل نے حسن دیکھا ضرور تھا مگر حسن کا سامنا کرنے کا لمحہ بہت کم آیا تھا۔ اسمٰعیل کو لگا، اِس کا سامنا نہیں کیا جا سکتا... ہلکے سبز رنگ کا جمپر، سفید شلوار، ہاتھوں میں چوڑیاں، کانوں میں چھوٹے چھوٹے بُندے، دو چوٹیاں، گلے میں چھوٹے چھوٹے سچے موتیوں کی مالا، سفید دوپٹہ جو اپنے مالک سے مسلسل بغاوت پر آمادہ تھا۔ لمبا چہرہ مگر گولائی لیے ہوئے، صاف گندمی رنگ چہرہ، جس پر خون کی سرخی کی پھوار پڑ رہی تھی۔ کشش کے خزانے سمیٹے ہوئے، ناک لمبی مگر متناسب، آنکھیں جھکی جھکی، پلکیں بوجھل بوجھل، جیسے جھیلیں بھی ہوں، نرم سائے بھی ہوں، ہونٹ... اچانک میّر کا شعر یاد آ گیا... پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے... آدمی تو وہ شعبۂ تاریخ کا تھا، مگر اُردو شاعری اور ادب سے اُس کی یاد اللہ تھی، افسانے بھی پڑھے تھے اور شاعری بھی... ''کی سی'' کا معنی اِس لمحے سے پہلے اسمٰعیل پر کبھی اتنے واضح طور پر نہیں کھلا تھا۔

اُس ایک لمحے میں... وہ لڑکی اندر سے پردہ ہٹا کر باہر کمرے میں آ چکی تھی۔

''آداب!' اس نے ناشتے کی ٹرے ٹیبل پر رکھتے ہوئے آداب کیا تو لگا کمرے میں جل ترنگ بج اُٹھا۔

''یہ میری چھوٹی بہن ہے... رَما!'' نولیش آہستہ سے بولا۔

نولیش کی آواز کان میں پڑی تو اسمٰعیل اچانک اُس جادو کے حصار سے باہر نکل آیا۔ جب وہ جادو کے حصار سے باہر نکلا تو اُس نے ایک منظر دیکھا۔ اس کا دوست سیّد فیضان رسول میرانی اپنے دوست نولیش کمار کی بہن رَما کماری کو دیکھنے سے پہلے نولیش اور ماں جی کی نگاہوں کا رُخ دیکھتا تھا۔ پھر اُس نے یہ بھی دیکھا کہ رما کماری بات کرتے کرتے اچانک بڑی رَوا روی میں کن انکھیوں

سے فیضان رسول میرانی کو دیکھتی اور پھر فوراً ہی ماں جی، نولیش یا میری طرف متوجہ ہو جاتی۔
یہ بڑا عجیب منظر تھا اور خاص طور پر اسمٰعیل کے لیے بالکل ہی غیر متوقع صورتِ حال تھی کیوں کہ وہ گزشتہ تین چار سالوں سے فیضان کے قریب تھا مگر یونیورسٹی یا یونیورسٹی کے باہر فیضان رسول ہر جگہ اور ہر موقع پر ایک ایسا شخص نظر آیا جس کا ''خانہ قلب'' ڈاکٹروں کی اصطلاح میں صرف خون صاف کرنے کی مشین ہوتا ہے۔

اس مشین میں خوف اور جھجک کا عنصر کیسے شامل ہو گیا؟ اسمٰعیل حیرت زدہ تھا۔

اسمٰعیل کو محسوس ہوا جیسے وہ کسی طلسماتی کائنات میں داخل ہو گیا ہو، جہاں بیٹھے لوگ ایک دودھیا رنگ کی شرابِ طہور کے خمار میں شرابور، ارضِ آدم کی ساری کثافتیں بھلا کر خوشی کی چھوٹی سی چھوٹی کیفیت کو بھی اپنی مٹھی میں جکڑے چلے جا رہے تھے، سب وقت سے پرے تھے، وقت سب سے پرے تھا، ایک انوکھا مکان جس میں زمان تھم سا گیا تھا، پھر بھی لگ رہا تھا ایک ناقابل تفہیم بہاؤ ہے جس میں سب بہتے چلے جا رہے تھے... لہر لہر بہتی دھارا... او مانجھی رے... کہاں ہے کنارہ...''

اچانک ایک بزرگ گھبرائے گھبرائے سے گھر میں داخل ہوئے، فیضان اُنہیں دیکھتے ہی اُٹھ کھڑا ہوا، پھر جھک کر اُن کے پیر چھوئے، نولیش آہستہ سے اسمٰعیل سے بولا... ''پتا جی!''

اس سے پہلے کہ اسمٰعیل اُنہیں آداب کرتا، اچانک مسرت و محبت کا وہ پل کسی شیشے کی طرح گر کر بکھر گیا، ٹوٹ پھوٹ گیا... پتا جی کی گھبرائی گھبرائی آواز سنائی دی، وہ پھنسی پھنسی آواز میں بولے:

''بیٹا فیضان! تم یہاں ہو، جاؤ اپنے گھر جاؤ۔''

''کیا ہوا؟'' ماں جی نے حیرت سے پوچھا۔

''ہوگا کیا؟ شام ہو رہی ہے، گھر جانا چاہیے۔'' وہ اپنی گھبراہٹ چھپاتے ہوئے بولے۔ مگر جھوٹ اُن کے لہجے سے جھلک رہا تھا۔

''کیا بات ہے پتا جی؟ آپ اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہیں؟'' نولیش اپنی پریشانی نہ چھپا سکا۔

''شیو چرن سنگھ کا قتل ہو گیا ہے۔'' اُنھوں نے پاس رکھی کرسی پر تقریباً گرتے ہوئے کہا۔ ایسا لگا اُنھوں نے اچانک ہی فیصلہ کیا کہ سچ بات بتا دینی چاہیے۔

نولیش کے پتا جی کا یہ جملہ وہاں موجود ہر فرد پر ایک بم کی طرح گرا، سب کو جیسے سکتہ مار گیا،

اسمٰعیل نے دیکھا، سب کے چہرے پیلے پڑ گئے تھے۔ پھر چند سیکنڈ بعد ہی فیضان اُٹھ کھڑا ہوا:

''اچھا ماسی! ہم جاتے ہیں۔''

''بیٹا سڑک سے مت جانا، کیاری کیاری جانا۔''

ماں جی کے لہجے کا عجب رنگ و آہنگ تھا۔ جیسے وہ فیضان کو روک بھی لینا چاہتی ہوں اور روک بھی نہ پا رہی ہوں۔

فیضان ماں جی کے پیر چھونے کو جھکا تو اُنہوں نے بے ساختہ اُسے لپٹا لیا۔ اسمٰعیل فیضان دونوں دروازے تک آئے۔ دروازے سے نکلتے ہوئے اسمٰعیل نے دیکھا کہ فیضان مڑ کر دیکھ رہا ہے۔ اُس کی نظروں کے تعاقب میں اسمٰعیل کی نگاہیں رما تک پہنچ گئیں۔ لگا اِن آنکھوں میں تو ماں جی کی آنکھوں سے زیادہ گھبراہٹ ہے۔

دونوں باہر نکل آئے۔ گلیوں سے ہوتے ہوئے، بانس واڑی پار کرتے ہوئے جب گھر سے کچھ دور اور گاؤں کے تقریباً آخری سرے پر پہنچے تو اسمٰعیل نے پھر دیکھا، فیضان رسول مڑ کر دیکھ رہا تھا۔ اسمٰعیل نے پھر اُس کی نظروں کا تعاقب کیا۔ نولیش کے مکان کی دوسری منزل کی ایک کھڑکی پر رما کا چہرہ ٹکا ہوا تھا۔

دل میں عجب سی جلن پیدا ہوئی۔ فیضان کو کریدنے کی خواہش ہوئی مگر اُسی وقت نولیش کے پتا جی کا گھبرایا گھبرایا لہجہ یاد آ گیا۔ 'شیو چرن سنگھ کا قتل ہو گیا ہے؟''

''فیضان! یہ شیو چرن سنگھ کون ہے؟''

فیضان نے ہونٹوں پر انگلی رکھی۔ ''چپ چاپ گھر چلو، گھر چل کر باتیں ہوں گی۔'' اس کے قدم اور تیز ہو گئے۔

راستے میں جگہ جگہ لوگ تیزی سے اپنے گھروں کی طرف تیز قدموں سے لوٹتے دکھائی دیئے۔ اندازہ ہوا کہ پورے علاقے پر دہشت کا عالم طاری ہے۔ ایک دو گھروں کے دروازے پر غالباً آس پاس کے تین چار آدمی دھیمے لہجے میں کچھ بات کر رہے تھے۔ احساس ہوا کہ ساری باتیں شیو چرن سنگھ سے متعلق ہیں۔

نولیش بارہ بجے فیضان کے گھر آیا تھا، تینوں ڈیڑھ بجے کے آس پاس بارہ گاؤں پہنچے تھے۔ نولیش کے گھر سے نکلتے نکلتے پانچ بج گئے تھے۔ آج دوپہر ہی سے موسم کچھ ابر آلود تھا اور لوٹتے

ہوئے تو سورج بالکل ہی دکھائی نہیں دے رہا تھا، ہوا تیز تھی، بنسواڑی سے ہوا کا جھونکا باہر آتا تو خاصی آواز پیدا کرتا، اور پھر اُس کے پڑوسی تاڑ کے درخت...

...ایسا لگا جیسے سارے درخت تالیاں بجا بجا کر ٹھٹھہ کر رہے ہیں اور اس کا مذاق اُڑا رہے ہیں۔

''مسٹر اسمٰعیل مرچنٹ، ساکنِ قدیمی صوبہ مہاراشٹر... بہار کے دیہات میں پک نک منانے آئے تھے... ہاہا... ہاہا...''

فیضان کا ساتھ دینے کی خاطر اسمٰعیل نے اپنے قدم اور تیز کر دیئے۔

گھر پر سبھی لوگ پریشان تھے، دونوں بخیر و خوبی پہنچ گئے تو سبھی نے اطمینان کا سانس لیا۔

اسمٰعیل نے پھر پوچھا: ''یار! یہ شیو چرن سنگھ کون صاحب تھے؟''

''لمبی کہانی ہے، رات میں باتیں کریں گے۔''

مگر آج کی گفتگو کا موضوع ہر جگہ شیو چرن سنگھ ہی تھا۔ مغرب بعد فیضان کے ابا کی محفل جمی تو وہاں بھی گفتگو گھوم پھر کر شیو چرن سنگھ تک ہی پہنچی۔ طرح طرح کے لوگ، بھانت بھانت کی باتیں۔ کسی نے خبر دی کہ شیو چرن سنگھ بچ نکلا تھا مگر بھاگتے ہوئے گولی لگ گئی۔ کسی نے بتایا کہ اُس نے باضابطہ مقابلہ کیا اور جب چاروں طرف سے گھر گیا تو اپنی مشین گن سے فائر کرتا ہوا مجمع میں کود پڑا۔ پانچ لوگ مر گئے اور باقی لوگوں نے اُسے گھیر کر مار ڈالا۔ تیسرے نے پہلے دونوں راویوں کی بات کاٹی۔ ''نہیں نہیں یہ سب افواہ ہے۔ نہ وہ بھاگا اور نہ ہی مجمع نے اُسے گھیرا، مقابلہ تو صرف اُس کا اور راجیش سنگھ کا ہوا۔ پہلے دونوں میں گالی گلوج ہوئی، پھر دونوں ایک دوسرے سے بھڑ پڑے اور یہ تو صرف راجیش سنگھ کی خوش قسمتی تھی کہ اُس کو اپنا ریوالور نکالنے کا موقع پہلے مل گیا، اگر شیو چرن سنگھ نے راجیش سنگھ سے پہلے ریوالور نکال لیا ہوتا تو ہم لوگ راجیش سنگھ کے مرنے کی خبر سنتے۔''

بات کرنے والے طرح طرح کے خدشات کا اظہار کر رہے تھے۔ بیچ بیچ میں ام سی سی (کمیونسٹ کوآرڈینیشن کمیٹی) اور گولڈن آرمی کا تذکرہ بھی ہو رہا تھا۔ ام سی سی کا نام تو اسمٰعیل نے سنا تھا مگر یہ گولڈن آرمی کیا بلا ہے؟ اُس نے سوچا اور چپکا بیٹھا سنتا رہا کہ اب رات میں میاں فیضان رسول ہی سے سب اُگلوا لیا جائے گا۔

''یار! اب شروع ہو جاؤ۔'' بستر پر جاتے ہی اسمٰعیل بول اُٹھا۔

فیضان رسول مسکرایا اور یوں گویا ہوا:

''بیان کیا ہے راویانِ ثقاہت شعار نے کہ گوتم بدھ کے شہر گیا کے ایک دور افتادہ علاقے نصرت پور عرف بارہ گاؤں میں کہ جہاں دراصل رہا کرتے تھے اسامی سیّد پور عرف میران بیگہہ کے۔ مگر ساتھ امتدادِ زمانہ کے، ہوتے گئے آزاد یہ سارے باج گزار بندے۔ اور اِس بیچ پائی آزادی ہمارے ملک ہندوستان جنت نشان نے بھی۔ اور نتیجے میں نصرت پور ہو گیا گم تاریخ کے کوڑے دان میں، اور طلوع ہوا سورج بارہ گاؤں کا۔ جہاں اکثر و بیشتر بھومیہاران اور کچھ قوم راجپوتان کے فرزند دل بند، بنے ہوئے تھے مالک، علاقے کے سیاہ و سفید کے، مگر پھر تاریخ ایک نئی کروٹ لیتی ہے اور ہوتا ہے چلن زمانے میں کمیونزم کا۔ یہ ایک فرقہ ہے، راندہِ بارگاہِ طبقہ اشراف، جس کے پیشوایانِ قوم براجتے تھے دور دیس میں۔ مگر داستانِ عجیب، اثراتِ فرقہ کی یہ ہے کہ لینن گراڈ سے اَبر اُٹھا اور برسا جھوم جھوم کر ہندوستان کی پسماندہ اقوام پر۔ خدا مغفرت کرے ہمارے ہر دلعزیز کامریڈوں کی، جنھوں نے غریبوں کو یہ سبق پڑھایا کہ اُن کے مرض کا علاج انصاف میں نہیں مساوات میں ہے۔ ایک طرف یہ سبق اور دوسری طرف تاریخ کی یہ خبر کہ آزادی کے لیے جہاں گاندھی جی اَہنسا کا گیت گا رہے تھے وہیں سبھاش چندر بوس اور اُن سے پہلے بھگت سنگھ پر تشدد جدوجہد کا ثبوت دے چکے تھے۔ اسی پر تشدد جدجہد کا ایک منفی رُخ ۱۹۴۷ء میں دیکھنے کو ملا۔ جب ہندوستان کے ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کے بڑے جتھے نے یہ یقین کر لیا کہ ہم پر تشدد جدوجہد کے ذریعہ وہ سب کچھ پا لیں گے جو اَب تک نہ پا سکے۔ تو ہمارے عزیز برادر بجان برابر.. یہ سب کچھ اُسی پر تشدد روایت کا اگلا قدم ہے۔''

''کمال کر رہے ہو تم! آزادی کی جدوجہد کو قتل و غارت گری کے ساتھ کھڑا کر رہے ہو؟'' اسمٰعیل نے جھلّا کر فیضان کو کاٹا۔

''میں کچھ نہیں کر رہا ہوں۔ جو ہو رہا ہے وہ سامنے ہے۔ تازہ نمونہ شیو چرن سنگھ کا قتل ہے۔ مرنے والا ایک پر تشدد جماعت گولڈن آرمی کا ممبر تھا، اب جسے چاہو جدوجہد کہہ لو اور جسے چاہو قتل و غارت گری سمجھ لو۔''

''یار! یہ ام سی سی تو سمجھ میں آتی ہے، مگر یہ گولڈن آرمی کیا بلا ہے؟''اسمٰعیل نے بات بدل دی۔

''ایم سی سی کا جواب!''

''مطلب؟''

''مطلب یہ کہ ام سی سی پسماندہ اقوام کی جماعت ہے اور گولڈن آرمی اعلیٰ نسب واقوام کی۔''

''اوہ! اب سمجھا۔''

''نہیں جناب! اب بھی آپ پورا نہیں سمجھ سکے ہیں۔''

فیضان مسکرا کر کہنے لگا: ''اِن ساری تفصیلات کے درمیان ایک گمشدہ کڑی ہے، وہ یہ کہ آزادی کے بعد سے حکمراں جماعت کے لوگ عام آدمی کو مسلسل بے وقوف بنا رہے تھے، یعنی زیادہ تر حکمراں غنڈے پالتے تھے اور یہ غنڈے لیڈروں کو اسمبلی اور پارلیمنٹ میں پہنچواتے تھے، پھر اچانک اُن غنڈوں کو خیال آیا کہ اگر ہم دوسروں کو اسمبلی اور پارلیمنٹ تک پہنچوا سکتے ہیں تو خود کیوں نہیں پہنچ سکتے۔ اور یہاں سے شروع ہوتا ہے سیاست میں غنڈہ عناصر کی شمولیت کا مسئلہ۔

اس مسئلے کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ چوں کہ کچھ جماعتوں پر اعلیٰ ذات والوں کا قبضہ ہے اس لیے پس ماندہ اقوام کو دوسری طرف تو دیکھنا ہی تھا۔ نتیجتاً کمیونسٹ تحریک کو فائدہ ہوا۔

مگر پھر ایک پہلو پیدا ہوتا ہے کہ سی پی آئی اور سی پی ایم جیسی جماعتیں چوں کہ پارلیمانی طرزِ حکومت اور جمہوریت وغیرہ کو قبول کر چکی تھیں، اس لیے عسکریت پسندوں کے ساتھ بہت دور تک چلنا اُن کے لیے ممکن نہ تھا۔ لہٰذا پہلے نکسل تحریک آئی، پھر نکسل تحریک جب نظریئے کے چاک سے الگ ہو کر وقتی اور علاقائی مفاد کے تحت پارٹی جوائن کرنے والوں کی پارٹی بننے لگی تو پھر اُس میں بھی دراڑ پڑی اور یہ جو تم آئی پی ایف مارکسٹ لینینسٹ، مارکسسٹ کوآرڈینیشن کمیٹی اور کسان مزدور سنگرام وغیرہ قسم کی جماعتیں دیکھتے ہو، یہ دراصل آئی پی ایف کے غیر مطمئن افراد کا اجتماع ہے۔

باقی بچا شیو چرن سنگھ اور راجیش سنگھ۔ ان دونوں کا قصہ مختصر یہ ہے کہ یہ دونوں پہلے ''ناپسندیدہ عناصر'' میں سے تھے۔ پھر بعد میں دونوں دو پارٹیوں میں چلے گئے۔ حالاں کہ دونوں کو اعلیٰ نسب ہونے کا دعویٰ ہے مگر چوں کہ راجیش سنگھ گولڈن آرمی میں جا چکے تھے اور چوں کہ شیو چرن سنگھ کے پاس پانچ دس بیگھہ کھیت سے زیادہ نہیں تھا اور چوں کہ شیو چرن نے اِسی میں اپنا بھلا دیکھا کہ جس پارٹی میں راجیش سنگھ ہے اُس پارٹی میں وہ نہ جائے اس لیے اس نے ایم سی سی جوائن کر لیا۔ اور

چوں کہ شیو چرن سنگھ نے ام سی سی جوائن کر لی تھی اس لیے بارہ گاؤں کے بھومیہاروں میں دہشت ہے کہ کہیں ام سی سی والے اِسے اپنے ممبر کا قتل نہ سمجھ لیں۔

پتہ نہیں فیضان رسول اس کے بعد بھی بولتا رہا یا چپ ہو گیا، اسمٰعیل نے اس کے بعد کچھ سنا نہیں، دراصل اُسے ماموں کے ایک دوست یاد آ گئے۔ گیا میں رہتے تھے اور کبھی کبھی مقصود علی صاحب سے ملنے آ جاتے تھے، یہ وہ زمانہ تھا جب اسمٰعیل نے بہار آنے کے بعد اندر کی تنہائی سے گھبرا کر مصروفیت کے کئی بہانے تلاش کیے تھے، اُنہی میں سے ایک بہانہ کمیونسٹ پارٹی بھی تھی۔ پکا سچا مسلمان تو وہ بھیونڈی میں بھی نہیں تھا۔ مگر ابا کی ڈانٹ کے ڈر سے اُس نے مولانا عبداللہ سرحدی سے کبھی بحث نہیں کی تھی۔ پھر بھی بہار آنے کے بعد اور مولانا اسحٰق سنبھلی کی مذہبیت کے بارے میں سننے کے بعد کمیونسٹ پارٹی میں اُسے زیادہ دل کشی محسوس ہونے لگی۔ انیل شرما کے ساتھ اُس نے شہری کمیٹی کی کئی مجلسوں میں شرکت کی، پھر چونیا ممبر بھی بن گیا، لیوی بھی دینے لگا۔ کارڈ ہولڈر بھی ہو گیا مگر پتہ نہیں کیا ہوا کہ جب کامریڈ سورن لتا کی شادی ہو گئی اور وہ اپنے میاں کے ساتھ کینیڈا چلی گئیں تو پارٹی میٹنگ میں اسمٰعیل کی شرکت بھی کم ہونے لگی۔

اُسی زمانے میں ایک مرتبہ وہ کمیونزم کے بارے میں سنی سنائی باتیں ماموں کے دوست افصح صاحب پر پٹخنے لگا تو وہ مسکرا کر بولے تھے کہ ''بھئی دیکھو، موجودہ منظر نامے کو تم صرف کمیونزم کے واسطے سے نہیں سمجھ سکتے۔ ہندوستان میں کچھ اور فکری دھارائیں بھی زیریں لہر کی طرح کام کر رہی ہیں، لوہیا نے سماجی انصاف پر جو تھیوری پیش کی ہے اُس میں انھوں نے بہت صاف صاف لکھا ہے کہ ہندوستان میں طبقاتی جدوجہد کو کاسٹ اورینٹڈ ہونا ہی پڑے گا۔

''آپ تو کھلّم کھلّا ذات پات کی حمایت کر رہے ہیں۔'' اسمٰعیل نے بہت زور سے بدک کر کہا۔

تِس پر وہ ہنسے اور بولے۔ ''گاندھی میدان کے ایک بڑے جلسے میں جے پرکاش نرائن نے کھلے عام کہا تھا۔ ''سوال سماجی انصاف کا ہے، وہ جس راستے سے آ سکے، اُسی راستے سے اُسے لانا چاہیے۔''

اب فیضان رسول بتا رہا تھا کہ شیو چرن سنگھ اور راجیش سنگھ دونوں ایک ذات کے ہیں اور دونوں مجرمانہ ذہنیت کے حامل بھی ہیں۔ پھر بھی ان میں سے ایک ام سی سی کا ممبر ہے اور دوسرا گولڈن

آرمی کا۔ تب ایسے میں سوال سر اُٹھاتا ہے۔ اسمٰعیل نے سوچا، کیا حکمراں جماعت والے ہی بے وقوف بناتے ہیں یا پسماندہ طبقوں کا یہ الزام صحیح ہے کہ اعلیٰ نسب افراد جہاں بھی ہوں وہ عام آدمی اور پچھڑے طبقے کو بے وقوف بناتے ہیں۔

بارہ گاؤں جانا اور پھر بھاگتے ہوئے وہاں سے آنا اور حالات کا اتنا ڈرامائی رُخ اختیار کرنا۔

اسمٰعیل کا سر چکرانے لگا۔

پھر بھی اُسے یاد تھا کہ وہ ساڑھے بارہ، پونے ایک تک جاگتا رہا، فیضان کی باتیں سنتا رہا اور ماموں کے دوست کو یاد کرتا رہا۔ پھر اسی سننے اور یاد کرنے کے بیچ سب کچھ گڈمڈ ہو گیا۔ غالباً نیند آ گئی۔ مگر اس رات اسمٰعیل سو کر بھی سو نہ سکا... خواب... طرح طرح کے خواب...''

ایک بہت طویل خواب، جو بعد میں بہت دنوں تک یاد رہا۔

وہ بھاگ رہا ہے، اور بہت سارے لوگ اُس کا پیچھا کر رہے ہیں۔ بھاگتے بھاگتے وہ اپنے جانتے بہت دور نکل آیا۔ پیچھے بھاگنے والوں کے قدموں کی چاپ بھی مدھم پڑ گئی۔ تب وہ ذرا دم لینے کے لیے رُکتا ہے اور اُسی پل منظر بدل جاتا ہے۔ اُسے کچھ لوگ گھیر چکے ہیں، وہ اُنہیں چپ چاپ دیکھ رہا ہے، وہ لوگ آہستہ آہستہ اُس کے گرد اپنا گھیرا تنگ کرتے جا رہے ہیں۔ اب وہ اُس کے اتنے قریب ہو گئے کہ اگر وہ ہاتھ بڑھاتے تو اُسے چھو لیتے۔ پھر اچانک اسمٰعیل نے خود کو زقند بھرتے دیکھا، وہ کچھ دور اوپر اُٹھتا ہے، پھر دھپ سے زمین پر گر جاتا ہے، اُن گھیرنے والوں کے بیچوں بیچ۔ پھر وہ سب اُس پر چھا جاتے ہیں۔

پھر منظر بدل جاتا ہے۔

ایک مکان بن رہا ہے، اس کے در و دیوار، سقف و بام، منبر و محراب، گنبد، برجیاں اور منارے سب کچھ دیدنی ہے۔ اسمٰعیل محسوس کرتا ہے جیسے یہ گھر اُس کا ہے، پھر ہزار پردوں کے پیچھے سے ایک آواز اُبھرتی ہے... گونجتی ہے... گونجتی ہوئی سارے اطراف پر چھا جاتی ہے... ایک آواز... بس ایک آواز... یہ تمھارا... یہ سب تمھارا ہے... پھر غیب سے ایک ہاتھ نمودار ہوتا ہے۔ پہلے بلند ہوتا ہے، پھر جھکتا ہوا اسمٰعیل کی طرف آتا ہے۔ اُن ہاتھوں میں کنجیاں ہیں۔ اسمٰعیل بے تابانہ اُن ہاتھوں سے کنجیاں اُچک لیتا ہے اور مکان کی طرف بڑھتا ہے۔ مگر جیسے ہی مکان کے صدر دروازے پر پڑے تالے کو کھولنے کے لیے تالے میں کنجی ڈالتا ہے، اچانک وہ سارا مکان ایک خوف ناک آواز کے

ساتھ زمین بوس ہو جاتا ہے۔

مکان گرنے کی خوف ناک آواز سے اسمٰعیل کی آنکھ کھل گئی۔ وہ پسینے پسینے ہو رہا تھا۔ اُس نے گھبراہٹ میں فیضان کو دیکھا۔ وہ گہری نیند سو رہا تھا۔

رات ابھی باقی تھی، سارے گاؤں پر ہُو کا عالم طاری تھا... آہستہ آہستہ اسمٰعیل کو پھر نیند آ گئی۔

صبح سویرے فیضان نے اُسے جھنجھوڑ کر جگایا۔

جھٹپٹے کا عالم، شاید اذاں کے فوراً بعد کا لمحہ، اسمٰعیل نے مندمند آنکھوں سے فیضان کو دیکھا اور جھلائے لہجے میں بولا: ''کیا ہوا یار؟ اتنی اچھی نیند کیوں برباد کی؟''

''میں نے اِک خواب سا دیکھا ہے۔'' فیضان کے لہجے میں کچھ گھبراہٹ بھی تھی اور کچھ پراسراریت بھی۔

''خواب؟''

''ہاں—یار عجیب سا خواب۔''

''کیا دیکھا؟''

''دیکھا میں بھاگ رہا ہوں اور بہت سارے لوگ میرا پیچھا کر رہے ہیں۔ بھاگتے بھاگتے میں اپنے جانتے بہت دور نکل آیا۔ پیچھے بھاگنے والے قدموں کی چاپ بھی مدھم پڑ گئی۔ تب میں ذرا دم لینے کے لیے رُکتا ہوں، اور اُسی پل منظر بدل جاتا ہے۔ مجھے کچھ لوگ گھیر چکے ہیں۔ میں اُنہیں چپ چاپ دیکھ رہا ہوں۔ وہ لوگ آہستہ آہستہ میرے اِرد گرد اپنا گھیرا تنگ کرتے جا رہے ہیں، پھر وہ میرے اتنے قریب ہو گئے کہ اگر وہ ہاتھ بڑھاتے تو مجھے چھو لیتے۔ پھر اچانک میں اپنے آپ کو جمپ کرتے ہوئے دیکھتا ہوں، کچھ دور تک اوپر اُٹھتا ہوں، پر دھڑام سے زمین پر گر جاتا ہوں۔ اُن گھیرنے والوں کے بالکل بیچوں بیچ۔''

اسمٰعیل بالکل مبہوت سا، سامنے بیٹھا تھا اور چپ تھا۔

''یار اسمٰعیل! بتاؤ نا، اِس خواب کی تعبیر کیا ہو سکتی ہے؟''

''اور بتاؤ، اس کے آگے کیا ہوا؟'' اسمٰعیل کی آواز خواب ناک تھی۔

''اس کے بعد تو میری آنکھ کھل گئی۔ میں تو گھبراہٹ کے مارے پسینے پسینے ہو رہا تھا۔''

''اس کے بعد آگے کچھ نہیں دیکھا؟''

''نہیں بھائی! گھبراہٹ کے مارے میری نیند ٹوٹ گئی۔''

''فیضان! اس کی تعبیر تو وقت ہی بتائے گا۔ تم اِسے موجودہ حالات کا داخلی تاثر یا متوقع خوف بھی کہہ سکتے ہو۔''

''نہیں نہیں۔ تم اسے بہت آسان بنا رہے ہو۔ یہ اتنا ہلکا معاملہ نظر نہیں آتا۔ میں مسجد کے امام صاحب سے پوچھوں گا۔ یہاں کے سب لوگ خواب کی تعبیر اُنہی سے پوچھتے ہیں۔''

اسمٰعیل خموش رہا۔ وہ فیضان کو کیا بتاتا۔ وہ تو اِسی اُدھیڑ بن میں گم تھا کہ ایک ہی رات میں ایک ہی خواب، ایک ہی مقام پر دو آدمیوں کو نظر آوے، ایک کی نیند ایک صورتِ حال تک پہنچ کر ٹوٹ جائے اور دوسرا ایک صورتِ حال کے بعد دوسری صورتِ حال سے بھی جڑ جائے۔ اس میں کیا بھید ہے؟''

اسمٰعیل کے اندر اندر آہستہ آہستہ ایسی بے چینی سر اُٹھا رہی تھی جس کا کوئی اور چھور نہیں تھا۔

پھر جگ مگ کرتا دوسرا دن شروع ہوا۔

دوسرے دن ایک نیا تماشہ ہوا۔

گھر کے لوگ ناشتے کے بعد، گھر کے آگے میدان میں بیٹھے ہوئے تھے اور کل کے حادثے پر تبصرہ جاری تھا کہ اچانک کچھ شور و غوغا سنائی دیا۔ آواز نزدیک کی نہیں تھی لیکن آواز کے حجم سے اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ ہنگامہ بہت دور بھی نہیں ہے۔ دودھ کا جلا مٹھا پھونک پھونک کر پیتا ہے۔ کل کے حادثے سے سبھی لوگ سہمے ہوئے تھے، اس لیے شور وغل کی آواز سنتے ہی زیادہ تر لوگ لاٹھی بھالے سے مسلّح ہو کر گھروں سے باہر نکل آئے۔ سبھی کے چہروں پر بھانت بھانت کے رنگوں کی بھرمار تھی مگر اُن میں خوف کا رنگ ہر رنگ پر حاوی تھا۔ عام تصور یہی ہے کہ ہندوستان میں اور خاص طور پر شمالی ہندوستان میں کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ کیا پتہ ہندو مسلمان آپس میں ٹکرا گئے ہوں، یا دو گاؤں والے لڑ گئے ہوں یا ڈاکوؤں نے حملہ کر دیا ہو، یا کسی معاملے کو بہانہ بنا کر پولیس والے گاؤں کی تلاشی لینے آ گئے ہوں، یا کوئی بھی پولیس کی وردی پہن کر گاؤں میں یا کسی گھر میں گھس گیا ہو۔

ہر ہنگامی صورتِ حال میں بزرگوں کا تجربہ ہی کام آتا ہے۔ اس وقت بھی گاؤں کے بزرگ آگے آئے اور سمجھایا کہ جب تک صحیح بات کا پتہ نہ چل جائے اس طرح لاٹھی بھالا لے کر کھلے میں نکل آنا عقل مندی نہیں ہے، لہٰذا طے پایا کہ پانچ دس لوگ ہتھیاروں کے پاس رہیں، باقی لوگ

آواز کی طرف جائیں۔ اگر وہاں کوئی ضرورت محسوس ہو تو ہتھیاروں کا پہنچنا کیا مشکل ہے!

سبھی کو یہ مشورہ صحیح محسوس ہوا۔ نہتّے لوگ آگے بڑھے۔

فیضان کے والد نے اسمٰعیل سے کہا، ''بیٹا! تم گاؤں میں نئے ہو، گھر پر ہی رہو۔'' مگر اسمٰعیل اڑ گیا۔ ''نہیں چچا! یہ میرے لیے شرم کی بات ہوگی۔'' اُسی لمحہ اُس کے جی میں ایک بات آئی، ''جو بھیونڈی کے اتنے بڑے فساد میں نہیں مرا، وہ اب کیا مرے گا؟''

سب لوگ گاؤں سے باہر نکلے تو کچھ دور پر، ایک کھیت کے کنارے کچھ لوگ مرنے مارنے پر آمادہ نظر آئے۔ فیضان نے جائے وقوعہ کے نزدیک پہنچتے پہنچتے اسمٰعیل کو یہ خبر دے دی کہ جس رقبے کے آس پاس یہ ہنگامہ ہے، وہ ہے تو میراں بیگھہ کے قریب لیکن وہ رقبہ اور اُس کے اِرد گرد کی ساری زمینیں بھومیہاروں کی تھیں اور اُن کے اسامی ہریجن ٹولہ کے لوگ تھے۔ ہریجن ٹولے والوں کا کہنا تھا کہ مالک لوگ جس ریٹ پر کٹائی بوائی کراتے تھے، اب اُس ریٹ پر کٹائی بوائی ممکن نہیں ہے۔ اَب اگر ہریجنوں کی پنچایت کا طے کیا ہوا ریٹ نہیں مانا جائے گا تو وہ لوگ زمین نہیں جوتیں گے۔

زمین کے مالکوں یعنی بھومیہاروں نے صاف جواب دیا کہ ''ہم جس ریٹ پر جتائی بوائی کرواتے ہیں اُس سے ایک پیسہ زیادہ نہیں دیں گے۔ تم لوگ کرنا چاہو تو کرو، ورنہ ہم لوگ خود جتائی بوائی کر لیں گے۔''

ہریجن ٹولہ کے لوگوں نے جتائی بوائی کرنے سے انکار کر دیا۔ بھومیہار یعنی مالک لوگ ہل بیل لے کر خود ہی کھیتوں میں کود پڑے۔ جتائی بوائی ہوگئی اور فصل بھی کٹ گئی۔ اس طرح وہ موسم گزر گیا۔

مگر اس کے بعد نیا فساد شروع ہوا۔ اب زمین کے مالکوں کا کہنا تھا کہ کوئی بھی اسامی (یعنی ہریجن) اُن کی زمین سے ہو کر نہیں گزرے گا۔ بھومیہاروں کے اس فیصلے کا سیدھا سادہ مطلب یہی تھا کہ ہریجن ٹولے کے لوگ اپنے گھروں سے نہ نکلیں کیوں کہ ہریجن ٹولی کے اِرد گرد کی تقریباً پچاسی فی صد زمینیں بھومیہاروں اور اِرد گرد اعلیٰ نسب ہندوؤں کی ملکیت تھیں۔ ظاہر ہے یہ صورتِ حال ہریجنوں کے لیے غیر متوقع بھی تھی اور جان لیوا بھی۔

صورتِ حال بہت بگڑ چکی تھی۔ بالکل آمنے سامنے کے ٹکراؤ کی نوبت آ چکی تھی۔ بھیڑ اتنی تھی کہ دونوں طرف کے سورما صاف صاف نظر نہیں آ رہے تھے، مگر مختلف چہرے گاہے گاہے سامنے

آتے پھر متحرک اور بے چین بھیڑ کی آڑ میں چھپ جاتے۔

اِسی دھوپ چھاؤں میں اچانک ایک چہرا چمکا اور اسمٰعیل ہکا بکا رہ گیا۔

وہ اس چہرے کو سیکڑوں کیا ہزاروں کی بھیڑ میں بھی پہچان سکتا تھا۔

فلیش بیک میں جیسے کچھ جھماکا سا ہوا، اس کی آنکھوں کے سامنے تقریباً برس پہلے کی ایک رات جھلملانے لگی۔

ٹی.وی. پر کچھ پروگرام چل رہا تھا، اچانک بہت زوروں کا شور اُٹھا، سب لوگ گھبرا کر گھر سے باہر نکل آئے، لوگ چیخ و پکار کی آواز کی طرف بھاگے، دوڑتے دوڑتے ہی معلوم ہوا کہ محلّے کے ایک گھر میں ڈاکو گھس گئے ہیں۔ تب تک بم بھی چلنے لگا۔ ڈاکو اندر تھے، دروازہ اندر سے بند تھا اور گھر والوں کی چیخ باہر تک پہنچ رہی تھی، مگر باہر بم کون چلا رہا تھا؟ اُس وقت یہ سوچنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ڈاکوؤں کے کچھ ساتھی باہر تھے جو محلّے والوں کو دہشت زدہ کرنے کے لیے بم چلا رہے تھے مگر آفریں ہے محلّے کے افراد اور خصوصاً نوجوانوں پر کہ وہ بموں کی پرواہ کیے بغیر دیوار پر چڑھ کر گھر میں گھس گئے اور گھستے ہی انھوں نے دروازہ کھول دیا۔ ایک ریلا سا گھر میں گھس گیا۔ اس ریلے کا فائدہ اُٹھا کر ایک ڈاکو تو بھاگ نکلا، مگر دوسرا نہ بھاگ سکا۔ پبلک نے اُس کی بھرپور مرمت کی، پھر پولیس آئی اور اُسے پکڑ لے گئی۔

بعد میں لوگوں نے بتایا کہ پکڑا جانے والا، اس سے پہلے ایک مرتبہ پاکٹ ماری کرتے ہوئے پکڑا گیا تھا، ایک مرتبہ کسی رنڈی کے کوٹھے پر رنگے ہاتھوں گرفتار ہوا تھا، اور ایک جگہ اغلام بازی کے الزام میں دھرا گیا تھا، اور اب پھر گرفت میں آ گیا تھا۔

اسمٰعیل کو یاد آیا، اس نے اُس ڈاکو کو بہت قریب سے دیکھا تھا، محلّے کے لوگوں نے اُسے بری طرح مارا تھا۔ اسمٰعیل کو یقین تھا کہ وہ تھانہ جاتے جاتے مر جائے گا، یا اگر فوراً نہیں تو کچھ دن بعد ہی سہی۔ اندر کی چوٹ اُسے دوبارہ کھڑا نہیں ہونے دے گی۔

لیکن غریب، لاچار اور بے بس ہریجنوں کی حمایت میں سب سے زیادہ زوردار نعرہ بلند کرنے والے کا، جب اسمٰعیل نے چہرہ دیکھا تو اُس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ اِس چہرے کو سیکڑوں کیا، ہزاروں کی بھیڑ میں پہچان سکتا تھا۔

''یہ بچ گیا؟ یہ صحیح سلامت ہے؟ یہ جیل سے چھوٹ گیا؟ یہ کیسے چھوٹا؟''

پھر اسمٰعیل نے خود کو خود ہی پھٹکار لگائی۔ احمقانہ باتیں کیوں سوچتے ہو؟ جیسے ہر مرتبہ چھوٹا، ویسے ہی ڈاکے والے کیس میں بھی چھوٹ گیا ہوگا اور اَب تو خیر سے وہ غریبوں کا ہمدرد بن گیا ہے۔ اور کیوں نہ بنے گا؟ ہمارے سیاسی کلچر نے یہی تو کیا ہے۔ پہلے سیاسی سورما ناپسندیدہ عناصر کے سہارے خود کو غریبوں کا نمائندہ بنائے رہتے تھے، اَب وہی ناپسندیدہ غریب عناصر اپنے نمائندہ خود بن گئے ہیں۔

اب یہ ڈاکو ہو یا چور یا شرابی مگر ہے تو غریب ہی!

چلو ٹھیک ہے... غریب ہے... بجا... مگر عوام کا نمائندہ... رہنما؟

اب کیا پتہ۔ عوام نے اُسے اپنا نمائندہ بنایا... یا وہ خود ہی عوام کا نمائندہ بن گیا؟

''جو بڑھ کر اُٹھا لے ہاتھ میں... مینا اُسی کا ہے۔''

اسمٰعیل اپنے آپ سے اُلجھتا رہا اور مجمع آپس میں۔

حالات کو بگڑتا دیکھ کر، کچھ بڑے بوڑھے، ہمت کر کے بیچ میں کود ہی پڑے۔ ہریجنوں کی آنکھ کا پانی ابھی مرا نہیں تھا، بات زبان ہی تک رہی اور معاملہ رفع دفع ہو گیا— بھومیہاروں نے بھی خموش ہو جانے میں ہی عافیت جانی۔

سب لوگ اپنے اپنے ٹھکانوں کی طرف لوٹ آئے مگر اسمٰعیل کی طبیعت بجھ چکی تھی۔

وہ شہر کے ہنگاموں سے اُوب کر یہاں آیا تھا کہ کچھ دن سکون سے گزارے گا۔ مگر آدمی کی قسمت میں شاید سکون ہے ہی نہیں... اسمٰعیل نے بالآخر فیضان کو بہلا پھسلا کر اُس سے واپس ہونے کی اجازت لے ہی لی، بہانہ یہ بنایا کہ گیا میں اُس کے ایک ددنہالی رشتہ دار ہیں، اُن سے بھی ملاقات کرنی ہے۔

''یا اللہ! اس چھوٹی سی بس میں بھی چین سے بیٹھنا نصیب نہیں؟''

اسمٰعیل نے بہت بجھے دل سے سوچا۔ بس میران بیگھہ سے تھوڑا آگے آ کر رُکی تھی۔ شاید کوئی ٹھہراؤ تھا، کچھ لوگ اُترے، کچھ چڑھے، ایک آدمی اُس کے بغل میں آ کر بیٹھا۔ اسمٰعیل نے دیکھا اور بے ساختہ اُسے گھن آ گئی۔

''کل کا ڈاکو، آج کا قائد، میرا ہم نشیں، ہائے ری قسمت!''

طبیعت میں تکدر سا پیدا ہو گیا۔ بس چلتا تو اسمٰعیل اُس کو دوسری سیٹ پر جانے کو کہتا۔ یا جگہ

ہوتی تو کم از کم وہ خود تو اُٹھ ہی جاتا۔

اسمٰعیل مرچنٹ! جگہ ہوتی تب بھی تم اُٹھ پاتے؟ اس کے ذہن میں یہ بات تو آسکتی تھی کہ یہ کیوں اُٹھا؟

اسمٰعیل کو لگا، وہ اندر سے تھونس گیا ہے۔ بس میں اُس کی جو پذیرائی ہو رہی تھی، وہ اسمٰعیل کو اُس کی اوقات بھی بتا رہی تھی۔

''دمودر بھیّا، کل سنا کچھ ہنگامہ ہو گیا؟''

''ارے ہنگامہ کا ہوگا؟ بھومیہار لوگ کہتے ہیں، گھر سے نکلنے نہیں دیں گے۔''

''ہیں؟ ای کا بات ہوئی؟ گھر سے نکلنے نہیں دیں گے؟''

''ہاں — اُو کا مطلب ایہی ہوا۔''

''کا مطلب؟''

''مطلب ای کے اکھوری، گوبردھن، پربھورام اور ڈومن آدی نے کھیت جوتے سے انکار کر دیا تو اَب بدلے میں بارہ گاؤں اور میرا بیگھہ کے پورے ہریجن ٹولے کو دھمکی ملی ہے کہ کوئی ہریجن بھومیہار لوگ کا کھیت پھاند کے نہیں جائے گا، تو اے کا مطلب کا ہوا؟ ارے سارے میں تو انہی لوگ کی جمین کھیت ہے... سب گریبون کے کھون چوس چوس کے اپنا محل بنالیہن، اور اب اِلا کے سے گُجرے سے منا کرے ہیں، تو اے کا مطلب تو ایہی ہوا کہ کوئی ہریجن اپنے گھر سے باہر گوڑ نہ دھرے۔ کا ہے کہ گھر سے نکلیں گے تو گوڑ وا تو اُنہی لوگ کے کھیت میں پڑے گا۔ سب راستہ تو اُن کی جیداد (جائیداد) سے ہو کے جا ہے۔''

''سار بھومیہار بہتے سر چڑھ گئے ہیں۔''

''ارے تو کا اپنے سے چڑھ گئے ہیں۔ ہمے لوگ سر چڑھایا ہے۔'' دامودر نے بڑے رِسان سے جواب دیا۔

'ہم لوگ کا سر چڑھایا؟''

''لو۔ اِن کی سنو۔ ارے بچوا بلی بکری کی چڑھے ہے شیر کی نہیں۔ اُو سب کا ایسا بھئے من میں جم گیا ہے کہ نکلے نہیں نکلے۔ اور جو سیکڑوں بیگھے کے مالک بنے بیٹھے ہیں، تو اُو کا بھگوان کن سے لکھوا کے لائے تھے؟ اپنی چترائی اور بَل پر سب ہتھیا کے بیٹھ گئے ہیں اور ہم لوگ اِتّے کائر ہیں کہ

جان جائے کے ڈر سے اپنی ماں بہن بھی اُن کے پاس بھیج دے ہیں۔''

''گجر گیا جمانہ دمودر بھیا۔ اب نہیں ہوگا۔ اینٹ کا جباب (جواب) پتھر سے ملے گا۔''

اسمٰعیل نے بس پر ایک طائرانہ نگاہ کی، کچھ لوگوں کے چہرے اُترے ہوئے تھے۔ اندازہ ہوا کہ یہ لوگ زمیندار خاندان کے ہیں، مگر دامودر اُن کی پرواہ کیے بغیر بول رہا تھا اور باقی لوگ آگ پر تیل چھڑک رہے تھے۔

وہ چپ چاپ بیٹھا سنتا رہا اور سنتے سنتے ناسٹلجیا کے ٹرانس میں چلا گیا۔ ہمارا بھی زمانہ تھا، ہماری بھی خدائی تھی۔ سنا کہ آباؤ واجداد کرّ وفر کے زمیندار اور رئیس ہوا کرتے تھے اور مالک کا اگلا قدم اُٹھنے سے پہلے کمیا (اسامی یا ہرکارہ) اُس زمین کو صاف کرتے تھے، جہاں مالک کے قدم پڑنے والے ہوتے۔ یہ بھی سنا کہ بڑے بڑے محلات تھے اور اُن میں عیش کا سارا سامان موجود تھا۔ ہاتھی گزرنے والا صدر دروازہ، آگے چار کھٹے میں پھیلا میدان، اُس کے چاروں طرف بیس فٹ لمبی دیواریں، دیواروں پر چاروں طرف کونوں پر برجیاں، اُن پر پہرہ دیتے پہرے دار، پھر باہری بیٹھک جس میں خدا جھوٹ نہ بلوائے تو بیس کمرے ضرر ہوں گے۔ پھر پائیں باغ، پھر اندرونِ حویلی، پھر اندرون حویلی کا پائیں باغ، سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں۔ چلی سمت غیب سے اِک ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا۔ اور نتیجے میں ہندوستاں بٹ گیا، یہ زمیں بٹ گئی آسماں بٹ گیا۔ اَب جو دیکھا تو ہندوستاں اور تھا، یہ زمیں اور تھی، آسماں اور تھا۔ عورتیں سرحدوں کی طرف چل پڑیں، کوئی جھجکی کہیں کوئی روئی کہیں، ناک میں کیل سر پر رِدا بھی نہیں، جوتیاں گھر کی دہلیز پر رہ گئیں۔ راوی میں ہر روایت بہائی گئی، دونوں ہاتھوں سے غیرت لٹائی گئی۔ کچھ لٹیرے بڑے آدمی بن گئے اور ہم گھر میں شرنارتھی بن گئے۔

ہر عہد میں اُس عہد کا لٹیرا بڑا آدمی کیوں بن جاتا ہے؟ سوال نے سر اُٹھایا مگر جواب کون دیتا؟

دامودر ٹکاری میں اُتر گیا۔

مگر تکدر سے نجات کہیں نہیں تھی۔ شہر کا بھی حال یہ تھا کہ گزشتہ ایک ہفتے میں آٹھ آدمی قتل ہو چکے تھے، پانچ گھروں میں ڈاکہ پڑ چکا تھا، تین اسکوٹر چھینے جا چکے تھے۔ ایک آدمی کا اغوا ہو چکا تھا اور تین اساتذہ مار کھا چکے تھے۔

اس صورت حال کے حوالے سے اگر حکومت کے بارے میں کوئی سوال اُٹھتا تو ہر طرف سے

ایک ہی جواب ملتا: بھائی جو کہو، اُس نے کم از کم فرقہ وارانہ فساد تو رُکوا دیا۔

جمہوریت میں رائے عامّہ کے احترام کا مسئلہ، غنڈے اور سیاست داں کی دوستی، وہائٹ کلرڈ سوسائٹی میں وہائٹ کلرڈ کریمنلس کی سازشیں...وغیرہ وغیرہ وغیرہ...''

• • •

7

ماموں اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنا چکے تھے۔

رام لکشمن سنگھ کالج میں اُس کی تقرری ہو چکی تھی۔

''بس اب بسم اللہ کرو، جاکے کالج جوائن کرو۔'' ماموں نے پروانۂ تقرری اُس کے ہاتھوں میں دیتے ہوئے بہت محبت بھرے لہجے میں کہا۔

کالج جوائن کرنے کے کچھ ہی دنوں بعد کالج کے کنسٹی چیونٹ ہونے کی منزل بھی آ ہی گئی۔

دراصل حکومت اور اساتذہ یونین کے درمیان ہوئے سمجھوتے کے مطابق ۱۹۷۰ء سے پہلے قائم ہوئے کالجوں کو کنسٹی چیونٹ ہونا تھا۔ اس بات کی اصل اہمیت یہ تھی کہ اب کالج کا سارا نفع نقصان حکومت اپنے سر لینے والی تھی اور اَب تک تنخواہ کی ادائیگی کے سلسلے میں جو غیر یقینی صورتِ حال تھی وہ ختم ہونے والی تھی۔ سارے کالج اور ہر پروفیسر کے گھر میں خوشی کی نوبت بج رہی تھی۔ یقین ہو چلا تھا کہ پوری تنخواہ ملے گی اور مہینے کی پہلی کو مل جائے گی۔ یہ سارا کچھ انتہائی خوش کرنے والا سلسلہ تھا اور اسمٰعیل بھی اپنی ٹیچر برادری کے ساتھ واقعی اندر سے خوش تھا۔

اب اسمٰعیل کے اندر کچھ اور بھی ہونے لگا تھا...راتوں کی تنہائیوں میں جب نہ تب ایک منظر فلیش بیک میں جھما کے کرنے لگتا...اسمٰعیل کی طرف جھکتی ہوئی شہوار... یہ صحیح ہے کہ ایسے ہر لمحے میں تمکنت، اُس کی بیوی اور وہ، تینوں آس پاس کہیں نہ کہیں دکھائی دیتیں...تمکنت کی زبان پر تو بس ایک ہی جملہ... بزدل... بزدل... بیوی چپ اور وہ مسکراتی ہوئی...مگر ایسی ہر رات میں بالآخر بچ جاتی تھی شہوار—

''ایسا کیوں ہو رہا ہے؟'' اسمٰعیل حیرت زدہ تھا۔

مگر اُسے اِس سے زیادہ حیرت اُس وقت ہوئی جب وہ چھٹیوں میں پٹنہ گیا اور دوسرے دن کھانے کے دسترخوان پر بڑا بھائی خوشنود اپنے والد مقصود صاحب کی طرف مخاطب ہو کر بولا: ''ابا!

اب اسمٰعیل کی شادی کر دیجیے۔‘‘

اسمٰعیل کو جیسے اچھو ہو گیا، نوالہ منھ اور حلق کے بیچ اٹک گیا تھا۔ اُس نے کسی طرح نوالہ حلق کے اندر کیا اور بڑا مسکین سا چہرہ بنا کر بولا،’’بھیا! یہ کیا بات آپ نے کہہ دی؟‘‘‘

’’کیوں؟‘‘ ساری زندگی چھڑا سانڈ بن کر جینا ہے؟‘‘ منجھلا، جو اُس کا ہم عمر تھا، مسکرا کر بولا۔

’’ہاں کر دیجیے۔ باقی لوگوں کے لیے بھی راستہ کھلے گا۔‘‘ چھوٹا ودود آہستہ سے بولا۔

’’بات تو صحیح ہے بیٹا۔ جو بیت گیا سو بیت گیا، اب اُسے بھول جاؤ۔ اب تمھاری نوکری بھی ہو گئی۔ اب کیوں دیر کی جائے؟‘‘ ماموں نے بھی اپنی ہامی بھر دی۔‘‘

’’یہ میرے لیے بڑی مشکل کی گھڑی ہے۔ کیا یہ میرے لیے ممکن ہو سکے گا؟‘‘

جینے کے لیے کچھ سخت فیصلے تو لینے ہی پڑتے ہیں۔‘‘ ماموں آہستہ سے بولے۔’’مرنے والوں کے ساتھ مرا تو نہیں جایا جاتا۔‘‘

’’مگر ہم سے بڑے تو بھیا ہیں۔‘‘ اسمٰعیل نے بڑے بھائی کی طرف اشارہ کیا۔

’’ہاں، ہاں! تم دونوں کی شادی انشاء اللہ ایک ساتھ کروں گا۔‘‘

’’تالیاں.. تالیاں... تالیاں...‘‘ چھوٹا بھائی تالیاں بجاتا ہوا چیخا۔ سب ہنس دیئے، اسمٰعیل بھی سب کی ہنسی میں شریک ہوا، مگر وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اُسے خوش ہونا چاہیے یا نہیں۔

وہ محفل اختتام کو پہنچی، پھر آہستہ آہستہ دن ڈھلا اور رات آ گئی۔ اُسے یاد آیا، آج شہوار نے اُسے ایک بار بھی نظر اُٹھا کر دیکھا نہیں، پھر یہ بھی یاد آیا کہ آج اُس کی ایک آواز نہیں سنائی دی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ شہوار کے پاس جائے اور صرف اتنا پوچھے،’’تم نے سنا! ماموں کیا کہہ رہے تھے؟‘‘

اس کے من میں اِک سوال نے سر اُٹھایا۔’’شہوار کا جواب کیا ہوگا؟‘‘ سوال بار بار سر اُٹھاتا رہا، جواب نہیں ملا مگر شہوار کی پرچھائیں اس کا پیچھا کرتی رہی... شہوار کا اُس کی طرف جھکتا ہوا چہرہ... کانپتی تھرتھراتی آواز...’’مبارک ہو۔‘‘

’’تمکنت؟ میں کیا کروں؟‘‘ اس کے من نے کہیں کسی سے ایک سوال کر ڈالا۔

’’بزدل!‘‘ تمکنت نے پھر طعنہ دیا۔

’’اُوٹ ہٹاؤ۔‘‘ اب کے تمکنت شاید جسم کا اوٹ ہٹانے کا مطالبہ نہیں کر رہی تھی۔

اسمٰعیل ساری رات کشمکش کے بھنور میں اُبھرتا ڈوبتا رہا۔ صورتِ حال یہاں تک آن پہنچے گی ایسا تو کبھی اُس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ بھیونڈی میں جب اُس کا لوم بیٹھ گیا، جب اُس کے سب رشتہ دار مارے جا چکے، پھر یہ آگ بمبئی تک پہنچ گئی، تو وہ اپنی بے پناہی سے گھبرا کر اور ملنگ دوست کے مشورے اور اصرار پر بہار چلا آیا۔ ماموں کے گھر آنے تک وہ حیص بیص میں تھا، کیا ہوگا؟ جب وہ بہت چھوٹا سا تھا تو ماموں آئے تھے، پھر ایک لمبی جدائی، ماموں نے جس طرح اُس کو اپنایا اور سارے گھر والے جس طرح اُس کے قریب آئے، یہ اس کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا، پھر بھی ارادہ یہی تھا کہ کچھ دنوں یہاں رُک کر، سانس برابر کر کے وہ آگے چل پڑے گا، کہیں کوئی چھوٹی موٹی نوکری، کچھ رہنے کھانے کا سامان ہو جائے گا، بقیہ زندگی گزر جائے گی۔

مگر یہاں تو پھر سے صبح ہو گئی... ام اے ہو گیا، لیکچر شپ ہو گئی اور اب سب کہہ رہے ہیں کہ شادی کر لو... کیسے کر لوں؟ کہاں کر لوں؟ اور یہ شہوار؟

صبح میں ناشتے کے بعد جب بڑا بھائی خوشنود دوکان جانے لگا تو اسمٰعیل بھی اُس کے ساتھ ہو گیا۔

’’بھیا! آج ہوٹل میں چائے پی جائے۔‘‘ کچھ دور ساتھ چل کر اسمٰعیل آہستہ سے بولا۔

’’کیوں خیریت تو ہے؟ یہ ہوٹل کی کیا سوجھی؟‘‘

’’بس یونہی!‘‘

’’شہوار نے چائے صحیح نہیں بنائی تھی کیا؟‘‘

’’ارے نہیں... ایسا کچھ نہیں ہے... بس یونہی!‘‘

’’چلو، ٹھیک ہے، چلتے ہیں۔‘‘

دونوں ایک ہوٹل میں داخل ہوئے۔ اسمٰعیل نے دانستہ بالکل کنارے کا ایک ٹیبل پکڑا۔

’’دو چائے لاؤ.. کڑی... پتّی مار کے!‘‘ اسمٰعیل نے خالص بہاری لہجے میں آواز لگائی۔ بھائی ہنس پڑا۔

’’بھیا! آپ سے ایک بات کہنی تھی۔‘‘ اسمٰعیل بھائی کی طرف مخاطب ہوا۔

بھائی نے اُس کی جانب سوالیہ نگاہ کی... شاید وہ کچھ کچھ سمجھ گیا تھا۔

''آپ نے آج جو بات چھیڑی۔کیا یہ بات صحیح ہے؟''

''کیوں؟اس میں غلط کیا ہے؟ جب کسی کے پاس کچھ نہ رہے تو وہ نئی شروعات بھی نہ کرے؟''

''ڈر لگتا ہے۔''

''جو ڈر گیا سو مر گیا۔تم جاہلوں اور وہمیوں کی طرح بات کیوں کرنے لگے؟''

''آپ کو لگتا ہے کہ میں اس قابل ہوں؟''

''کیوں؟تم میں کیا کمی ہے؟ابھی تم چالیس برس کے بھی نہیں ہوئے،کونسٹی چیونٹ کالج کے لکچرر ہو،اور کیا چاہیے؟''

''اب میں آپ لوگوں سے الگ ہو کے نہیں جی سکتا۔''

''اس میں الگ ہونے کی بات کہاں سے آ گئی؟''

''وہ تو ہوگا ہی،نوکری دوسری جگہ، نئے رشتے کہاں بنیں گے خبر نہیں،تو پھر یہ جو میرا آخری گھر ہے،یہ بھی چھوٹ جائے گا۔''

''ارے نہیں بھائی،ایسا کچھ نہیں ہوگا تم ہمارے ہو،ہمارے رہو گے۔''

''نہیں بھیا!عملی طور پر آہستہ آہستہ یہ ہو ہی جائے گا۔یا تو میں جیسے ہوں ویسے ہی رہنے دیجیے یا پھر...''

اتنا کہہ کر اسمٰعیل گڑبڑا کر چپ ہو گیا۔

''ہاں،ہاں،بولو...یا پھر کیا؟''

''چھوڑیئے بھیا،جانے دیجیے،یہ موضوع میرا دماغ خراب کر دے گا۔''اسمٰعیل کرسی سے اُٹھ گیا۔

''اسمٰعیل بیٹھو۔''بڑے بھائی نے حکمیہ لہجے میں کہا،اور اُس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھا دیا۔''بولو کیا کہنا چاہ رہے ہو؟''

اسمٰعیل بہت دیر تک خموش بیٹھا رہا،دونوں خموش تھے اور دونوں پر ایک عجیب قسم کا بوجھل پن طاری تھا...پھر کچھ دیر بعد اسمٰعیل نے جیب سے کاغذ اور قلم نکالا اور کچھ لکھ کر بڑے بھائی کی طرف بڑھا دیا۔

''مجھے میرے اس آخری گھر سے جڑے رہنے کی کچھ سبیل پیدا کیجیے۔''بھائی نے پڑھا۔

''اسمٰعیل!اتنے دنوں میں تم نے کیا محسوس کیا؟ میں تمہیں اپنا بھائی نہیں مانتا؟''

''بھیا!ایسی بات مت کیجیے۔''اسمٰعیل کی آنکھیں بھر آئیں۔

''پھر تم مجھ سے بات کرنے میں جھجک کیوں محسوس کر رہے ہو؟''

اسمٰعیل کچھ دیر تک خموش بیٹھا بھائی کو تکتا رہا،پھر اُسی کاغذ کے ایک کونے پر لکھا...''شہوار!''

اور پھر ایک جھٹکے سے اُٹھا اور تیز قدموں سے چلتا ہوا ہوٹل سے باہر نکل گیا۔

اُس کے قدم ایک مرتبہ پھر دربھنگا ہاؤس کی طرف بڑھ گئے،وہ کچھ سوچ نہیں رہا تھا،بس چلتا رہا جا رہا تھا،شعبہ تاریخ سے شعبہ اُردو کی طرف آیا اور پھر مندر سے گزرتا ہوا سیڑھیاں اُتر کر گنگا تک پہنچ گیا۔اشنان اور پوجا کرنے والے جا چکے تھے،طلبا، زیادہ تر اپنی کلاسوں میں تھے،گنگا کنارے نسبتاً سناٹا تھا،دھوپ چاروں طرف پھیل چکی تھی،گنگا کی لہروں پر دھوپ کی شعاعیں عجب روپہلی کیفیت پیدا کر رہی تھیں۔لہریں حسبِ دستور مضطرب تھیں،لہروں کے اندر اضطراب تھا، چھوٹی بڑی مچھلیاں تیر رہی تھیں،کبھی کبھی کسی دریائی جانور کا سر بھی نظر آ جاتا،ذرا دور پر ایک مردہ بہتا چلا جا رہا تھا،بیچ سینے پر کشتیاں تیر رہی تھیں۔اُسے ایک گانے کے بول یاد آئے...تال ملے ندی کے جل میں/ ندی ملے ساگر میں/ ساگر ملے کون سے جل میں...پھر یاد آیا...سورج کو دھرتی ترسے/ دھرتی کو چندر ماں/ پانی میں سیپ جیسے/ پیاسی ہر آتما۔

پھر اچانک وہ گنگا کے ساحل پر سے غائب ہو گیا۔اب وہ بھیونڈی میں ویترنا کے کنارے کھڑا تھا...تمکنت گنگنا رہی تھی...رہیں نہ رہیں ہم/ مہکا کریں گے/ بن کے کلی/ بن کے صبا/ باغِ وفا میں۔اُسے یاد آیا وہ کئی مرتبہ بیوی بچوں کے ساتھ ویترنا کنارے بہت دیر تک ٹھہرا تھا،بچوں نے خوب انجوائے کیا تھا،بیوی بے چاری گھریلو عورت،اُس کے پاس بیٹھی مونگ پھلی کھاتی رہی تھی۔

وہ گنگا اور ویترنا کے بیچ ڈبکیاں کھاتا رہا،چہروں کی یلغار جاری رہی،وہ کچھ سوچ نہیں رہا تھا لیکن مناظر یکے بعد دیگرے فلیش بیک میں جھماکا کر رہے تھے۔

اچانک اُسے احساس ہوا کہ وہ رو رہا ہے۔

اس نے آہستہ سے آنسو پونچھے اور گھر لوٹ آیا۔

گھر میں سناٹا تھا، ماموں اور سب بھائی باہر نکلے ہوئے تھے، وہ اپنے کمرے میں چلا گیا، اُسے احساس ہوا کہ ممانی صبح کا سب کام نپٹا کر اپنے کمرے میں آرام کر رہی ہیں، پتہ نہیں جاگ رہی تھیں کہ سو گئیں، اُس نے دروازے پر سے جھانک کر دیکھا، شہوار دالان میں بیٹھی کسی کپڑے پر کچھ کڑھائی کر رہی تھی۔

اسمٰعیل کو جھانکتے دیکھ کر شہوار کی نگاہیں اُٹھیں۔

اسمٰعیل نے آہستہ سے شہوار کو آنے کا اشارہ کیا۔

شہوار نے اُسے بہت حیرت سے دیکھا، ایسا کبھی ہوا نہیں تھا، وہ تھوڑی دیر کشمکش میں گرفتار رہی۔ پھر پتہ نہیں کس جذبے کے تحت وہ آہستہ سے چوکی سے اُٹھی اور دبے قدموں اسمٰعیل کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ وہ کمرے میں پہنچنے کو پہنچ تو گئی، مگر اُس کے بعد کمرے میں سناٹا پسر گیا۔

کمرے میں اسمٰعیل اور شہوار دونوں موجود تھے اور دونوں کچھ نہیں کہہ پا رہے تھے۔

کچھ دیر کے بعد شہوار نے اسمٰعیل کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

اسمٰعیل نے محسوس کیا، اُس کے حلق میں کچھ کانٹا سا چبھ رہا ہے... وہ کچھ کہنا چاہ رہا تھا مگر کہہ نہیں پا رہا تھا۔

''صبح ماموں اور بھیا جو بات کر رہے تھے، وہ تم نے سنی؟'' چند ثانیہ بعد اس نے آہستگی سے پوچھا۔

شہوار نے اثبات میں سر ہلایا۔

''تمھاری طرف سے اجازت ہے؟'' اسمٰعیل کی آواز اور مدھم ہو گئی تھی۔

شہوار نے اس کی طرف ایسی حیرت بھری نگاہ سے دیکھا کہ اسمٰعیل کو لگا کہ اُس کی آنکھیں ہنس رہی ہیں۔ پھر اُس نے محسوس کیا کہ اُس کا چہرہ آسمان کا وہ کنارا بن گیا، جس پر ست رنگی دھنک لہراتی ہے، شہوار بالکل بھاگ کھڑے ہونے کی کیفیت میں نظر آئی، مگر اپنی جگہ سے کھسک بھی نہیں رہی تھی، اس کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ تھی، جس کے مسکراہٹ ہونے کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا، اُس کی نظریں زمین پر گڑی ہوئی تھیں، مگر اسمٰعیل نے محسوس کیا کہ وہ کسی نہ کسی طور اُسے دیکھ

رہی ہے۔

وہ کھڑی تھی اور چپ تھی اور در و دیوار ہمہ تن گوش تھے۔

''تمھاری اجازت کے بغیر کچھ نہیں ہوگا، یہ جان لو۔'' اسمٰعیل نے بہت گمبھیر لہجے میں پوچھا۔

شہوار نے سنا اور آہستہ سے مڑی۔ ''کہاں جا رہی ہو؟''

اسمٰعیل کے کہتے کہتے وہ کمرے کے اُس حصے تک پہنچی، جہاں اسمٰعیل کے کچھ گندے کپڑے رکھے ہوئے تھے، اس نے اُنھیں اُٹھایا اور دروازے کا رُخ کیا۔

''تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔'' اسمٰعیل نے آہستہ سے کہا۔

''کتنا گندہ کر دیتے ہیں اپنا کپڑا... آپ!'' وہ ہنستی ہوئی بولی ''وہاں بھی ایسے ہی سب گندہ پڑا رہتا ہوگا اور وہی پہن کے کالج چلے جاتے ہوں گے، لڑکے ہنستے ہوں گے کہ شریمان گندے پروفیسر چلے آ رہے ہیں'' وہ یہ سب کچھ بہت شوخ لہجے میں کہتی ہوئی دروازے تک پہنچی... دروازے پر رُک کر وہ اسمٰعیل کی طرف مڑی اور زبان نکال کر منھ چڑاتی ہوئی بھاگ گئی۔

اس کے آگے کے معاملات میں کچھ بہت زیادہ اینچ پینچ نہیں ہے، کچھ تھوڑی بہت ہاں نہیں، نہ نکر کر کے ماموں ممانی بھائی سبھی تیار ہو گئے۔ مگر اسمٰعیل کی ایک ضد کے آگے کسی کی نہ چلی۔ اُس نے ضد پکڑ لی کہ پہلے بھیّا کے لیے رشتہ تلاش کر لیا جائے، اور دونوں شادیاں ایک ساتھ ہوں۔

ماموں ممانی نے بھی اِس خیال کی حمایت کی، دونوں محسوس کر رہے تھے کہ اکلوتی بیٹی ہے اُس کی شادی کے انتظام کے لیے کچھ وقت چاہیے۔ قدرت اُنھیں خود بخود وقت کی سہولت عطا کر رہی تھی تو وہ انکار کیوں کرتے۔

مگر اس فیصلے کے بعد اسمٰعیل کے لیے ایک عملی دشواری پیدا ہو گئی۔ مقصود صاحب کے مکان میں ایک چھوٹے سے ڈرائنگ روم کے علاوہ تین کمرے تھے، ایک میں ممانی اور شہوار، ایک میں ماموں اور چھوٹا بھائی ودود اور کچھ جو بڑا کمرہ تھا اُس میں اسمٰعیل اور بقیہ دو بھائی۔ اب اتفاق یہ ہے کہ یہ بڑا کمرہ ممانی اور شہوار کے کمرے کی بغل میں تھا۔ اس قسم کے فیصلوں کے بعد جو ایک حجاب یا کم از کم ہچکچاہٹ کی کیفیت ہوتی ہے وہ اَب تقاضہ کرنے لگی تھی کہ شادی تک اسمٰعیل اور شہوار کا سامنا نہ ہو یا کم سے کم ہو۔

نتیجتاً اب اسمٰعیل کا زیادہ وقت اورنگ آباد میں گزرنے لگا جہاں اُس کا کالج تھا۔

مگر قدرت کے فیصلے عجب ہوتے ہیں، اور اُس کا طریقہ کار بھی نہ سمجھ میں آنے والا ہوتا ہے۔

چھ ماہ کے اندر اندر، بڑے بھائی کی منسوب بھی طے ہوگئی اور بالآخر شہوار اُس کی بیوی بن گئی۔ ان چھ مہینوں میں اسمٰعیل کئی مرتبہ بہت جذباتی بھی ہوا، گزرے دنوں، بچھڑے لوگوں اور بیتی پرچھائیوں نے بار بار اس کا پیچھا بھی کیا، لیکن اسمٰعیل بھی محسوس کر رہا تھا کہ جو ہو رہا ہے، یہ ہونا اُس کے حق میں بہتر ہے، اور یہ بھی کہ آخر تو شہوار کی طرف اُس کا دل مائل بھی ہو ہی گیا تھا۔

• • •

8

ایک دن اسمٰعیل کالج کے لیے نکلا تو راستے میں ایک کلیگ مل گیا۔

دونوں گپ شپ کرتے ہوئے کالج کی طرف بڑھ رہے تھے کہ اچانک اُس کلیگ نے سوال کیا: ''اسمٰعیل! تم کس پوسٹ پر ہو؟''

''سیکنڈ پوسٹ پر۔''

''نہیں! تم سیکنڈ پوسٹ پر نہیں ہو۔''

''ارے واہ! کیسے نہیں ہوں؟ میرے پاس لیٹر موجود ہے۔''

''تم اس معاملے کو درست کرلو۔ کرپاشنکر کہہ رہا تھا کہ وہ سیکنڈ پوسٹ پر ہے۔''

''سالا جھوٹ بولتا ہے۔'' اسمٰعیل جھلّا کر بولا۔ ''ارے سامنے کی بات ہے، ڈاکٹر بنسی دھر فرسٹ پوسٹ پر ہیں، اُن کی جوائننگ ۱۹۸۵ء کی ہے۔ میں نے اور کرپاشنکر نے ایک سال، ایک سبجیکٹ میں، ایک یونیورسٹی سے پاس کیا۔ ہم دونوں کا ریزلٹ ۱۷ر فروری ۱۹۸۶ء کو نکلا اور ۲۰ر فروری ۱۹۸۶ء کی تاریخ میں ہم دونوں نے جوائن کیا۔ میرے جوائننگ لیٹر پر صاف صاف لکھا ہوا ہے، Appointed on 20.2.1986, in forenoon۔ تو اَب کرپاشنکر مجھ سے سینئر ہوگا کیسے؟''

''پھر بھی ذرا تم ہوشیار رہو۔'' کلیگ اتنا کہہ کر خموش ہوگیا۔ دونوں کالج میں داخل ہوگئے تھے۔

اسمٰعیل نے ڈیرے پر لوٹ کر اپنا تقرری نامہ نکال کر دیکھا، اُس کو بالکل صحیح یاد تھا، وہ مطمئن ہوگیا اور پھر یہ بات بھی ذہن سے نکل گئی۔

کنسٹی چیونٹ ہونے کے اعلان کے بعد کی کاغذی کارروائی آگے بڑھتی رہی۔

اُسی زمانے میں ایک دن وہ اسٹاف روم میں پہنچا تو فضا کچھ اُٹ پٹی سی محسوس ہوئی۔ زیادہ تر لوگ کسی بڑے چارٹ پر جھکے نظر آئے، کچھ کلیگ الگ الگ ڈھیرے ڈھیرے گفتگو کرتے دکھائی

دیئے۔ایک ہم پیشہ بہت غصّے اور تیز لہجے میں بولتا سنائی دیا:''ٹیک اَوور(Take Over)ہو جانے سے کیا ہوگا؟سکریٹری کو بیک ڈیٹ میں اپوائنٹمنٹ کرنے سے کون روک سکتا ہے؟''

''کیابات ہے؟''اسمٰعیل نے اسٹاف روم میں پہلے سے موجود ایک ہم پیشہ سے پوچھا۔

''روٹین دیکھو!''

''کیوں؟روٹین میں کیا ہوا؟''

''تم روٹین دیکھوتو!''

اسمٰعیل مجبوراً ٹیبل پر پھیلے اُس چارٹ کی طرف جھکا،جس پر اور ہم پیشہ احباب بھی جھکے ہوئے تھے،پہلی نظر ہی میں وہ چونک گیا۔شعبہ تاریخ میں تین ہی لکچرر تھے،بنسی دھر،کرپاشنکر اور اسمٰعیل خود۔پھر یہ دو نام جناردھن مشرا اور جنک یادو کہاں سے آگئے؟اُس نے دوسرے شعبوں پر نگاہ دوڑائی،انگریزی،اکنومکس،اُردو،ہندی...''

اب اُسے اصل بات کا پتہ چل چکا تھا۔

نئ روٹین آئی تھی اور اِس روٹین میں،دوتین نئے ناموں کا اضافہ،ہر شعبے میں تھا۔

وہ سمجھ گیا۔سکریٹری نے پیسہ لے کر یہ ساری نئ تقرریاں کرڈالیں۔

''یار ستیش!یہ سب راتوں رات ہوگیا؟''

''ہاں،تو اور کیا؟''

''یہاں پندرہ سبجیکٹ میں پڑھائی ہوتی ہے۔''پروفیسر اروند،اسمٰعیل اور ستیش کی طرف مخاطب ہوئے۔''اور ہر سبجیکٹ میں پچھلے دروازے سے کم از کم دو لکچرر کی تقرری ضروری ہوئی ہے،اس حساب سے سکریٹری اور گورننگ باڈی نے کم از کم تیس لکچررس تو بہر حال اپوائنٹ کیے ہیں۔اب اگر ہر لکچرر سے کم از کم ۵۰ ہزار بھی لیا گیا ہوگا تو ہر حال میں ۱۵ لاکھ کی کمائی ہوئی ہوگی۔''

''خدا کی پناہ!''اسمٰعیل نے کالج قائم کرنے اور اس کے کنسٹی چیونٹ ہونے کے اس فائدے کے بارے میں تو سوچا ہی نہیں تھا۔

پھر آہستہ آہستہ دوسرے کالجوں کے بارے میں بھی خبریں ملتی گئیں تو اندازہ ہوا کہ یہ معاملہ کسی ایک کالج تک محدود نہیں ہے،جتنے کالجوں کو حکومت نے اپنے دائرۂ اختیار میں لینے کا اعلان کیا،اُن سب کے پرنسپل اور سکریٹری بڑے دھڑلّے سے نوکریاں بانٹ رہے ہیں۔اور پیسے بٹور رہے

ہیں،قیمت تقریباً طے تھی،سیکنڈ پوسٹ کی،تھرڈ پوسٹ کی،لکچرر کی،لیب ٹیکنیشین کی،کلرک کی،چپراسی کی،سب کا الگ الگ تخمینہ تھا۔دوکان کھلی ہوئی تھی،بولی لگ رہی تھی۔عہدے خریدے جارہے تھے،گاہکوں کی بھیڑ تھی،مال بہر حال کم تھا،اس لیے بات صرف منظور شدہ (سینکشنڈ) عہدوں کی ہی نہیں رہی،منظور ہوجانے کی اُمید میں غیر منظور شدہ جگہوں پر بھی لوگوں نے ٹِک جانا غنیمت سمجھا،کسی کی کوئی تخصیص نہیں تھی،شرط صرف اتنی تھی کہ ہاتھ میں ڈگری ہو اور جیب میں پیسہ،جناردھن مشرا اور جنک یادو اِسی طرح گھسے تھے۔

''مگر یہ کرپاشنکر؟یہ اپنے کو سیکنڈ پوسٹ پر کیسے بتا رہا ہے؟''اسمٰعیل کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

کرپاشنکر نے خود اسمٰعیل سے یہ بات نہیں کہی تھی،مگر اسمٰعیل نے محسوس کیا کہ وہ ذرا کٹا کٹا رہنے لگا ہے،اسمٰعیل کے بغل میں نہیں بیٹھتا،ملاقات بھی ہوتی تو بس نمستے کہہ کے آگے بڑھ جاتا۔وہ کرپاشنکر کی صلاحیت سے بھی خوب واقف تھا،کلاس میں وہ ہمیشہ بیک بنچر رہا۔اُس کا داخلہ بھی صرف اِس لیے ہوگیا تھا کہ اُس کا ایک چچا جو اُسی یونیورسٹی میں بطور کلرک بحال ہوا تھا،کرپاشنکر کے وقت ترقی کرتے کرتے اسسٹنٹ رجسٹرار ہوگیا تھا مگر ریزلٹ میں وہ اسمٰعیل سے نیچے ہی تھا،یہاں کالج کے لڑکے بھی اُس کے نہ پڑھانے کی شکایت کرتے تھے،اور وہ پڑھاتا کیا،اُس کا زیادہ وقت تو پرنسپل کی چمچہ گیری میں گزرتا تھا۔اور سکریٹری سے زیادہ اُس کے بیٹے کی خدمت کرنے میں،اصل میں سکریٹری کا بیٹا پٹنہ یونیورسٹی میں پڑھتا تھا اور اُس وقت اس کا چچا ڈپٹی رجسٹرار ہوگیا تھا،تو اب وہ سکریٹری کے بیٹے کو مسکا مارتا رہتا کہ میرے چاچا ڈپٹی رجسٹرار ہیں،جہاں کوئی ضرورت ہو بتاؤ،میں یہ کرادوں گا،میں وہ کرادوں گا،تم گھبراتے کیوں ہو،میں تم کو ٹاپ کرادوں گا،بیٹا!اپنے باپ سے کرپاشنکر کی خوب تعریف کرتا اور باپ کا معاملہ یہ تھا کہ وہ کالج کا سکریٹری تو ضرور تھا،مگر اس کی بنیادی پہچان کولڈ اسٹوریج والے کی تھی،اُس کا اصل ربط ضبط سبزی منڈی والوں سے تھا،یہیں سے پیسہ کما کر بعد میں اُس نے ایک سنیما ہال کھول لیا اور پھر جہان آباد میں ایک مارکیٹ بھی بنالی اور اب کالج کے سکریٹری کی حیثیت سے پیسہ کما رہا تھا۔

اسمٰعیل کے دوستوں نے خبر دی کہ کرپاشنکر نے سیکنڈ پوسٹ پر رہنے کے لیے پورا تیس ہزار روپیہ سکریٹری کو دیا ہے۔

اسمٰعیل کیا کرسکتا تھا؟ماموں نے سیکریٹریٹ کا ملازم ہونے کے ناطے کسی کی پوّا پیروی لگا کے

اُس کی تقرری کرادی مگراتنے سورس پیروی کے بعد بھی ماموں کو بیس ہزار روپیہ دینا ہی پڑا۔ ماموں نے یہ نہیں بتایا پھر بھی اُسے اِس کی خبر مل گئی تھی۔ سکریٹریٹ کی وجہ سے دس ہزار روپیہ کم ہوا تھا۔ اس کا احسان سکریٹری دسیوں مرتبہ اسمٰعیل پر رکھ چکا تھا، اب اگر واقعی کرپاشنکر نے تیس ہزار روپیہ مزید دے دیا ہو، تو گویا اُس نے سکریٹری کو 60 ہزار روپیہ دے دیا ہے۔

اسمٰعیل صرف یہ سوچ کر چپ تھا کہ لیٹر تو اُس کے پاس موجود ہے، آگے کی لڑائی وہ خود لڑے گا۔

''اب تو شادی کی بات بھی ہوچکی۔ ماموں کو پریشان کرنا صحیح نہیں۔'' اسمٰعیل یہی سب سوچ کر چپ ہورہا۔

مگر ایک دن تو حد ہوگئی!

اسمٰعیل جب اسٹاف روم میں پہنچا تو دیکھا کہ علاقے کا مشہور غنڈہ ارون بھاٹیہ بھی لکچررس کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھا ہوا ہے۔ بھاٹیہ اپنے بغل والے سے اپنے خاص انداز میں بات کر رہا تھا۔ بغل والا لکچرر بھاٹیہ کی بات پر بس ہوں ہاں کر رہا تھا، مگر بھاٹیہ اُس لکچرر کی بے دلی سے بے نیاز، خود ہی جتنا بولنا چاہ رہا تھا، بولے چلا جا رہا تھا۔

اسمٰعیل کچھ سمجھ نہ پایا، مزاجاً وہ لوگوں سے ملنے جلنے میں بہت انتخابی بلکہ کم آمیز تھا، غنڈوں بدمعاشوں سے اُس کا کبھی یارانہ نہیں رہا، اُسے نوجوانی کے زمانے کا ایک واقعہ یاد آ گیا، وہ آئی.اے کا امتحان دینے والا تھا، یا بی.اے.کی تیاریوں میں مشغول تھا، اُنہی دنوں ایک دن اُس کے باپ نے بھیونڈی کی سائی نگر کالونی کے آس پاس کے علاقے میں اسمٰعیل کو شہر کے ایک بدنام لڑکے سے باتیں کرتے دیکھ لیا تھا، اُس وقت باپ نے اسمٰعیل کو نظر انداز کیا اور آگے بڑھ گئے، مگر جب وہ گھر پہنچا تو باپ نے بہت سختی سے سرزنش کی: ''جوان ہونے اور انگریزی پڑھنے کا یہ مطلب تو نہیں کہ آدمی لوگوں سے ملنے جلنے میں اپنی حد بھول جائے۔'' یہ حد اسمٰعیل کو ہمیشہ یاد رہتی، یونیورسٹی میں بھی اُس کا بہت کم لڑکوں سے یارانہ تھا، فیضان رسول میرانی تو اُسے ''آدم بیزار'' کا خطاب دے چکا تھا۔ کالج میں بھی وہ بہت زور زور سے بات کرنے والوں یا اسٹاف روم میں خوب قہقہہ لگانے والوں سے کٹا کٹا ہی رہتا۔ تو بھلا اِس ارون بھاٹیہ کو وہ کہاں سے برداشت کر پاتا۔ وہ تو اُس کے ڈیرے کے پاس ہی ایک محلّے میں رہتا تھا۔ لوگوں نے اُس کے بارے میں اُسے پہلے سے بہت

کچھ بتا رکھا تھا، شروع میں بھاٹیہ کو چوری کی عادت پڑی، لڑکیوں کو چھیڑنے کے جرم میں کئی مرتبہ سڑکوں پر لوگوں سے پٹا، پھر شہر کے بڑے غنڈوں کے ساتھ ہوگیا، تاڑی، شراب، جوا، مار پیٹ، زِنا، قتل، اسمگلنگ، آرمس ڈیلنگ، کس جرم میں اُس کا نام نہیں آیا؟ اپنی اِسی دادا گیری کے سہارے میٹرک سے ایم.اے. تک پڑھے بغیر کیا، امتحانات میں شریک ہوئے بغیر پاس ہوتا گیا۔ اب آج یہاں اسٹاف روم میں پتہ نہیں کیا کر رہا ہے؟

اسمٰعیل اسٹاف روم میں ایک کنارے کھڑا، کچھ دیر تک سوچتا رہا، پھر باہر نکل آیا—

اُس کو باہر نکلتے دیکھ کر اُس کا دوست نولیش کمار بھی باہر نکل آیا۔

''کیا بات ہے؟ تم باہر کیوں چلے آئے؟' نولیش نے اُس کے پاس آ کر پوچھا۔

''وہ... بھاٹیہ وہاں بیٹھا ہوا ہے۔ وہ چلا جائے تو آؤں گا۔'' اسمٰعیل نے برا سا منھ بنا کر کہا۔

''وہ جانے کے لیے نہیں آیا ہے۔' نولیش ذرا طنزیہ ہنسی ہنستا ہوا بولا۔

''مطلب؟'' اسمٰعیل نے سوالیہ نظروں سے نولیش کی جانب دیکھا۔

''مطلب یہ شریمان کہ شری شری ارون بھاٹیہ، ہندی وِبھاگ میں، ہندی ویا کھیاتا کے پَد پر نِیکت ہوئے ہیں!''

''کیا کہہ رہے ہو تم؟'' اسمٰعیل سراپا حیرت تھا۔

''میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں... ڈاکٹر اسمٰعیل رضا صاحب!'' نولیش کافی سنجیدگی سے بولا۔

''یہ تو یار اِنتہا ہوگئی۔'' بے ساختہ اُس کے منھ سے نکلا، پھر آسمان کی طرف سر اُٹھا کے بدبدایا:

''منصف ہو تو اَب حشر اُٹھا کیوں نہیں دیتے؟''

اُس رات اسمٰعیل کو بہت دیر تک نیند نہیں آئی۔ پہلی مرتبہ اُس کو اپنے پیشے سے اُکتاہٹ محسوس ہوئی، یہ کیسی نوکری ہے جس میں غنڈہ بدمعاش جاہل لفنگا سب گھس جاتا ہے۔ اگر اسی طرح لکچرر پروفیسر بنا جا سکتا ہے تو اِتنی محنت، اپنے سبجیکٹ کے بارے میں حاصل کی جانے والی مہارت، برسہا برس سے دن کا چین اور رات کا آرام حرام کر کے سارا شوق مار کر، کوڑی کوڑی بچا کر، اپنے سبجیکٹ پر مارکیٹ میں آنے والی نئی نئی کتابیں خریدنے کی اور گئی رات تک جاگ جاگ کر پڑھنے کی کیا ضرورت تھی؟ سب محنت کرنے والے گدھے ہوئے، ارون بھاٹیہ جیسے لوگ ہی عقلمند ہوئے نا، کہ ہلدی لگی نہ پھٹکری رنگ آیا چوکھا۔

جانے کتنی رات تک وہ جاگتا رہا، اور چھت تکتا رہا۔ کہیں کوئی دیکھنے والا نہیں ہے؟ نہ اِس دنیا میں؟ نہ اُس دنیا میں؟ بھاٹیہ لڑکوں کو کیا پڑھائے گا؟ بھاٹیہ کے پڑھائے لڑکے جب اسکول کالجوں میں جائیں گے، تو وہ اپنے شاگردوں کو کیا بتائیں گے؟ ملک کی بدحالی کا اصل سبب کیا ہے؟ کون ہے؟ بھاٹیہ؟ اُس کو نوکری دینے والا اسکریٹری؟ وہ نظام جو ٹھیکیداری اور سنیما ہال کے مالکوں کو تعلیمی اداروں کا سربراہ بننے کی اجازت دیتا ہے؟ وہ سماج جو اِن لوگوں کی ہمت افزائی کرتا ہے؟ سوال ...سوال...سوال...''

سوال سوال کی گردان کرتے کرتے پتہ نہیں اسمٰعیل کو کب نیند آئی؟

❖

اسمٰعیل کو کالج میں ایڈمیشن انچارج بنادیا گیا تھا—

حالاں کہ وہ بنیادی طور پر لکھنے پڑھنے والا آدمی تھا، اس لیے اس قسم کے کاموں سے دور ہی بھاگتا تھا، مگر نوکری ہے، کتنی ذمہ داریوں سے اپنے کو کنارے کیا جاسکتا ہے؟

اس کی کلاس پہلی گھنٹی میں تھی، اس لیے وہ سویرے ہی کالج پہنچا اور کلاس کے بعد اسٹاف روم میں آیا ہی تھا کہ چپراسی نے ہیڈ بنسی دھر شری واستو کی درخواست دی، وہ دو دنوں کی چھٹی پر تھے۔

''یار کرپاشنکر! ہیڈ کا پیریڈ ہے، اور وہ چھٹی پر ہیں، ذرا تم کلاس انگیج کرلو۔'' اُسی وقت اتفاق سے چٹوپادھیائے اور کرپاشنکر آگئے تھے۔

کرپاشنکر اور اسمٰعیل پوسٹ کے سلسلے میں ایک دوسرے سے کتنے ہی کھنچے کھنچے نہ رہتے ہوں مگر دونوں کو یہ یاد رہتا تھا کہ وہ ایک یونیورسٹی کے ایک ہی سال پاس کیے ہوئے ہیں، اور ایک سبجیکٹ میں، ایک دن کالج میں جوائن کیا ہے۔ اس وقت بھی اسمٰعیل کرپاشنکر کو دیکھ کر ذرا تن آسانی کے موڈ میں آگیا۔

''اسمٰعیل صاحب! سنا کل کچھ بحثا بحثی ہوگئی۔'' چٹوپادھیائے نے پوچھا۔

''چھوڑیئے، اب پھر موڈ آف مت کیجئے۔'' اسمٰعیل نے سر جھٹکا۔

''ہاں اسمٰعیل، میں تو بھول ہی گیا تھا، مجھے بھی کچھ سن گن ملی ہے، کل کیا ہوا؟'' کرپاشنکر نے بھی سوال کیا۔

''ارے کیا بتاؤں بھئی؟ پولیٹیکل سائنس والا گپتا پاگل پن کر...''

اچانک اسمٰعیل رُک گیا... سامنے گپتا کھڑا تھا۔

یک بارگی سبھی نے اپنے آپ کو بڑی عجیب سی صورتِ حال میں گھرا محسوس کیا۔

گپتا اب کمرے میں داخل ہو چکا تھا۔ اس کے ساتھ وہ لڑکا تو تھا ہی جس کے داخلے کے لیے گپتا کل سے دلیلیں مہیا کر رہا تھا، اس کے علاوہ تین اور لڑکے تھے... جیکی، کوچرا اور پلائی... اسمٰعیل انھیں اچھی طرح پہچانتا تھا۔ یہ ایک دوسرے کالج کے پرنسپل کے ذریعہ رسٹیکیٹ کئے ہوئے لڑکے تھے۔

'نومشکار.. آیئے آیئے گپتا صاحب... بیٹھئے۔'' چٹوپادھیائے اچانک ہی بہت نروس ہوگیا۔

کرپاشنکر نے اسمٰعیل کی آنکھوں میں جھانکا... اُسے لگا اسمٰعیل کسی طوفان کا رُخ پھیرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

''دیکھتے ہو جیکی!'' گپتا زور سے بیٹھتے ہوئے جیکی کی طرف مڑا اور بولا ''تم کہہ رہے تھے کہ آپ اسمٰعیل صاحب کو پھر سے سمجھایئے، وہ پُستکوں سے زیادہ جڑے رہنے والے آدمی ہیں، ٹیکنیکل معاملہ اُن کی سمجھ میں کم آتا ہوگا... اور یہ کہتے ہیں کہ ''گپتا... پاگل ہوگیا ہے۔'' گپتا کی آواز غصّے سے جیسے پھٹ سی گئی تھی۔

''گپتا جی! ہم سب ٹیچر ہیں، جو معاملہ ہے ہم خود نپٹالیں، بچوں کو بیچ میں کیوں لاتے ہو؟''

''اے پروفیسر صاحب!'' جیکی بالکل چنگھاڑنے کے انداز میں بولا۔ ''ہم آپ کو بچہ نظر آتے ہیں؟ ہم یونیورسٹی میں ہوتے تو اَب تک لکچرر ہو چکے ہوتے؟''

کرپاشنکر بس ایک ٹک اُسے دیکھتا رہا، اس لہجے کی اُسے توقع ہی نہ تھی، اُسے لگا کسی نے اُسے بھرے بازار میں ننگا کردیا۔

''آپ بیٹھئے تو گپتا جی، بتایئے تو کیا معاملہ ہے؟'' چٹوپادھیائے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بہت منمنا کر بولا۔ خود وہ ابھی تک کھڑا تھا۔

''ارے کیا کریں گے بیٹھ کر چٹوپادھیائے جی! کل سے تو بتاتے بتاتے تھک گئے۔ اس لڑکے نے آئی اے فرسٹ ڈویژن سے پاس کیا ہے، بی.اے. میں پرویش چاہتا ہے، پرنتو اسمٰعیل صاحب کہتے ہیں ''ایڈمیشن نہیں ہوگا... کیوں؟''

''کیوں نہیں؟ کیوں نہیں ایڈمیشن ہوگا؟'' چٹو پادھیائے جلدی سے بولا اور اسمٰعیل سے مخاطب ہوا،''اس میں کیا پروبلم ہے؟ جب اُس نے فرسٹ کلاس سے آئی اے پاس کیا ہے تو پھر ایڈمیشن کیوں نہیں لے لیتے؟''

''گپتا اصل معاملہ نہیں بتا رہے ہیں۔''اسمٰعیل بہت ٹھہر ٹھہر کر بولا۔

''مطلب یہ کہ آپ بہت سچے ہیں، اور گپتا سر جھوٹے ہیں۔'' کوچر نے ہوا میں ہاتھ لہرایا اور قدرے بلند آواز میں کہا—

''ارے نہیں بھائی!... کوچر— ایسا کیوں سمجھتے ہو؟ چٹو پادھیائے مسکراتے ہوئے تقریباً عاجزانہ لہجے میں بولا:'' گپتا جی کو کون نہیں جانتا؟ پورے پرانت میں اِن کی یوگتا کا بول بالا ہے... نشٹھا کا چرچا ہے... بیٹھو بیٹھو تم لوگ... ہو جائے گا... ہو جائے گا... اسمٰعیل صاحب پھجول کا لپھڑا کاہے کو پھیلا رہے ہیں... لے لیجیے ایڈمیشن!''

''چٹو پادھیائے! آپ سمجھنے کی کوشش کیجیے، آئی. اے. کی سرٹیفکٹ اصل سمسّیا نہیں ہے۔''

''تو پھر کیا سمسّیا ہے؟'' چٹو پادھیائے بہت جھنجھلا کر بولا۔

''اِن کے پاس میٹرک کی سرٹیفکٹ کی جگہ جس بورڈ کی سرٹیفیکٹ ہے اس کو ہماری یونیورسٹی میں مانیّتا پراپت نہیں ہے۔''

''سن رہے ہو پلائی؟'' گپتا پلائی کی طرف مخاطب ہوا،''ان کو ایڈمیشن لینا ہے، آئی. اے. کی سرٹیفیکٹ پر اور یہ اسکروٹنی کر رہے ہیں میٹرک کی سرٹیفیکٹ کی۔''

''اے پروفیسر صاحب! آپ ایڈیشن لیجیے گا یا نہیں؟'' پلائی کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

''گپتا! تم میرے دوست ہو۔'' اسمٰعیل نے پلائی کو نظر انداز کر کے پھر گپتا کو مخاطب کیا۔

''سینئر ٹیچر ہو، دو چار سال میں پروفیسر میں پرموشن کے یوگیے ہو جاؤ گے۔ معاملے کی گمبھیرتا کو سمجھو، میں آئی. اے. کی سرٹیفیکٹ کو کہاں غلط کہہ رہا ہوں، سمسّیا تو یہ ہے کہ میٹرک کی سرٹیفیکٹ کے ذریعہ ایج سرٹیفائی کی جاتی ہے اور ہماری یونیورسٹی نے سیکنڈری لیول کے جن جن بورڈوں کو مانا ہے اُن میں سے کسی کی بھی سرٹیفیکٹ لڑکے کے پاس نہیں ہے۔''

''سنئے! اتنا سدھانت مت بگھاریئے۔ ہم لوگ بھی جانتے ہیں کہ یونیورسٹی میں کیا کیا ہوتا ہے۔'' جیکی کرسی سے اُٹھ کر ٹیبل کے پاس آیا اور ٹیبل پر آدھا بیٹھ کر اسمٰعیل کی آنکھوں میں آنکھیں

ڈال کر بولا۔''سالا اِس یونیورسٹی میں وائس چانسلر کو تو ہم کچھ سمجھتے ہی نہیں، کالج کے پروفیسر لوگ ہم کو سبک پڑھائیں گے؟''

''گپتا صاحب بھی پروفیسر ہی ہیں جیکی۔'' کرپا شنکر بہت دھیرے اور نرمی سے بولا۔

''آپ چپ رہیے۔ بیچ میں مت بولیے۔ آپ سے کوئی بات نہیں کر رہا ہے۔''

کرپا شنکر کے اندر ایک آگ کا لاوہ سا دھدھک اُٹھا۔ اُس نے اپنے چاروں طرف دیکھا... کرسی پر تنا بیٹھا گپتا، دو کرسیوں پر، پیروں پر پیر چڑھائے تمسخرانہ مسکراتے ہوئے کوچر اور پلائی... ایک کرسی پر مرے چوہے کی طرح گردن جھکائے اور جسم کو ڈھیلا چھوڑے چٹو پادھیائے...

''جب تم پڑھتے تھے، تب بھی ہم یہاں ٹیچر تھے...'' اسمٰعیل کو آخر جیکی سے مخاطب ہونا ہی پڑا۔ گپتا نے تم کو پڑھایا یہ صحیح ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم ہم سے اس انداز میں بات کرو، تم صحیح غلط ہم کو مت بتاؤ، ہم جانتے ہیں کہ کیا صحیح ہے، کیا غلط۔ ہم وہی کریں گے جو ہماری نظر میں صحیح ہوگا۔ سامنے چٹو پادھیائے بیٹھے ہیں، ہم سب کے کلیگ ہیں، مگر اسی کمی کے کارن ان کی بیوی کا ایڈمیشن نہیں ہو سکا۔''

''تو یہ کوئی بہت اچھی بات تو نہیں ہوئی۔'' اچانک چٹو پادھیائے بدک گیا۔

کرپا شنکر نے چٹو پادھیائے کا پیر دبایا اور آہستہ سے بولا...''اس سمئے نہیں... پلیز!''

چٹو پادھیائے پانی میں بتاشے کی طرح بیٹھ گیا۔

''گلط سہی ہم کو مت سکھایئے۔ کوچر پھر چیخا...''بس آپ گپتا سر کے آدمی کا ایڈمیشن لے لیجیے۔''

''لے لیجیے... لے لیجیے۔'' چٹو پادھیائے جلدی سے بولا۔''ارے ہمارا آپ کا کیا جاتا ہے، اگر کسی کا بھلا ہو جائے، کیوں گپتا جی؟''

''چٹو پادھیائے جی! میرا ایک سجیشن (مشورہ) ہے۔'' کرپا شنکر نے کہا۔''اسمٰعیل صاحب ایڈیشن انچارج سے ہٹ جائیں اور اِسے آپ ٹیک اَپ کر لیں اور ایڈمیشن کا کوئی راستہ نکال لیں۔''

''ہاں یہ ٹھیک ہے۔'' اسمٰعیل فوراً بولا۔''میں ایڈمیشن انچارج سے ہٹ جاتا ہوں۔ نکسٹ سینئر تو آپ ہی ہیں۔''

''پرنسپل صاحب آپ ہی کو یہ ذمہ داری دیں گے۔ آپ سوچ لیجیے، اس سمسّیا کا سمادھان

کیسے کریں گے؟''

''کرپاشنکر! اب یہ نیا بکھیڑا مت کھڑا کرو۔'' چٹوپادھیائے کا انداز بالکل رو دینے والا تھا۔

''معاملہ اسمٰعیل جی کا ہے، وہ جانیں کیسے ایڈمیشن لیں گے اور کیوں نہیں لیں گے۔''

''نہیں شریمان! کرپاشنکر نے بات کاٹی۔ معاملہ کیول اسمٰعیل جی کا نہیں، ٹیچر کمیونٹی کا ہے، سارے کالج کا ہے۔''

چٹوپادھیائے کی حالت دیکھنے کی تھی، نہ روتے بن رہا تھا نہ ہنستے...وہ کبھی اسمٰعیل اور کرپاشنکر کو دیکھتا جیسے کوئی نیا تیرنے والا دریا کو دیکھتا ہے...پھر کبھی جیکی، کوچر اور پلائی کو دیکھتا، جیسے سمندر میں تیرتے آدمی کا سامنا اچانک کسی گھڑیال سے ہو جائے۔

کچھ دیر خموشی رہی، پھر یک بارگی جیسے چٹوپادھیائے کو کوئی خزانہ مل گیا...''ٹھیک ہے میں دیکھ لوں گا...'' چٹوپادھیائے مسکراتے ہوا بولا۔'' گپتا، جیکی، کوچر اور پلائی بھی مسکرانے لگے۔

''کیسے دیکھئے گا؟ ذرا ہمیں بھی بتا دیجیے۔'' چٹوپادھیائے نے پوچھا۔

''میں پچھلے برسوں کا ریکارڈ دیکھوں گا، مجھے وِشواس ہے کہ میٹرک کی سرٹیفکٹ ضروری نہیں ہوگی۔''

''ٹھیک ہے، پچھلے سالوں کا ریکارڈ منگا کر دیکھ ہی لیجیے۔'' اسمٰعیل نے بھی جیسے اطمینان کا سانس لیا۔

''جاؤ، کلرک سے مانگ کر لے آؤ۔'' گپتا نے مڑ کر جیکی سے کہا اور تینوں آفس کی طرف دوڑ پڑے۔

''گپتا جی! ٹیچروں کے درمیان اِن بلیک لسٹڈ لڑکوں کو کیوں لاتے ہیں؟'' اسمٰعیل نے تینوں لڑکوں کے جانے کے بعد بڑے ٹھنڈے لہجے میں پوچھا

''میں نہیں لایا...'' گپتا نے ایک جھٹکے سے جواب دیا۔'' یہ لڑکے خود آئے تھے، میرے پاس پیروی لے کر۔''

''گپتا جی! جس لڑکے کے لیے آپ کوشش کر رہے ہیں، وہ آپ کا بھتیجا ہے نا؟'' کرپاشنکر نے پوچھا۔

اس سے پہلے کہ گپتا کچھ جواب دیتا، جیکی اور کوچر وغیرہ فائل لے کر آ گئے۔ ساتھ میں کلرک

بھی تھا۔ چٹوپادھیائے جلدی جلدی فائلیں اُلٹنے لگا...سات سال کی فائل دیکھ لی گئی تھیں، کہیں کوئی ایسا ثبوت نہیں مل پا رہا تھا جس سے اسمٰعیل کا دعویٰ غلط ثابت ہو پاتا۔ آٹھویں سال کی فائل دیکھی جا رہی تھی، گپتا اور چٹوپادھیائے کے چہروں پر مایوسی اور اُمید کے ملے جلے رنگوں کی یلغار تھی۔

''جانتے ہو اسمٰعیل جی ایڈمیشن کیوں نہیں لے رہے ہیں؟'' اچانک گپتا پلائی اور کوچر کی طرف مڑا۔

''کیوں سر، کیوں؟'' تینوں ایک ساتھ بولے۔

''کیول اِس لیے کہ تم لوگ میرے ساتھ آئے ہو۔''

کرپاشنکر نے تڑپ کر گپتا کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا...''پلیز گپتا جی... بات مت بڑھائیے۔''

کرپاشنکر نے گپتا کا عندیہ سمجھ لیا تھا...اسمٰعیل کا چہرہ غصّے کی شدت سے سرخ ہو رہا تھا...اور چٹوپادھیائے چوہے دان میں پھنسے ایسے چوہے کی طرح حرکت میں تھا اور جلدی جلدی فائل اُلٹ رہا تھا، جس کی دُم بلّی کے منھ میں آ گئی ہو۔

''گپتا! میں یہ نہیں سمجھا تھا کہ آپ اس حد تک بھی جا سکتے ہیں۔''

اسمٰعیل کی آواز غصّے اور رنج سے کپکپا رہی تھی، وہ اس سے زیادہ اور کچھ نہ کہہ سکا۔

''ابھی، حد آپ نے دیکھی کہاں ہے، پروفیسر صاحب؟ حد دیکھنی ہو تو نرائن گنج تھانہ کا ریکارڈ دیکھیے۔'' جیکی ٹیبل کے دوسرے سرے سے اُٹھ کر بالکل اسمٰعیل کے پاس پہنچ چکا تھا...''تین قتل میری حد ہے دو کوچر کی اور ایک پلائی کی!''

اچانک اسمٰعیل کھڑا ہو گیا...وہ غصّے سے تھر تھر کانپ رہا تھا...''جیکی! اب تم لوگ باہر جاؤ۔''

آواز نکلی تو تھی اسمٰعیل ہی کے حلق سے مگر یہ اسمٰعیل کی آواز نہیں تھی۔

قصائی کی چھری کے نیچے جانور کی چیخ اس کی اپنی چیخ کہاں ہوتی ہے۔

گپتا کے لیے یہ بالکل غیر متوقع صورتِ حال تھی۔ اُس نے تو صرف اسمٰعیل کو مرعوب کرنے کے لیے ان سبھی کو اپنے ساتھ لے لیا تھا، مگر وہ یہ بھول گیا تھا کہ پاگل کتّے یا آدم خور بھیڑیے کی لگام رِنگ ماسٹر کے ہاتھ میں نہیں ہوتی۔ گپتا اندر سے کپکپا رہا تھا۔ یہ تو اُس نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا...سارا جیون تو ٹیچر کمیونٹی کے ساتھ ہی بتانا ہے..وہ ٹیچنگ گروپ میں کیسا بدنام ہو

جائے گا...اسمٰعیل اگر سنگھ میں چلا گیا تو...آج کل سنگھ کا سکریٹری بھی تو اسمٰعیل کا دوست ہے...''

گپتا نے تیزی سے آگے بڑھ کر جیکی کو پیچھے کھینچا...''جیکی! کیا بدتمیزی ہے، پیچھے ہٹو۔''

''آپ ہٹ جائیے سر! میں سمجھ لیتا ہوں۔'' جیکی نے ایک ہاتھ سے گپتا کو ایسا جھٹکا دیا کہ گپتا گرتے گرتے بچا۔

اسمٰعیل نے اِس ایک پل میں، اپنے آپ کو، ہزاروں لاکھوں من بھاری چٹان کے نیچے دبتا محسوس کیا، پھر اُسے لگا جیسے اُسے لپکتے شعلوں کے درمیان پھینک دیا گیا ہو...اُس نے محسوس کیا کہ اُس کے پیر اُس کے قابو میں نہیں ہیں...ٹیبل کے نیچے تھر تھر کانپتے پیر اور آنکھوں کے آگے تیرتے ستارے اور اندھیرا...پھر وجود کی کسی اَن دیکھی اور اَنجانی سمت سے غصّے کی ایک شدید لہر اُٹھی اور اُس کے پورے وجود پر چھا گئی...وہ سب کچھ بھول چکا تھا...جیکی، کوچر، پلائی...بلیک لسٹڈ لڑکے...قتل...تین قتل...اُسے کچھ یاد نہیں تھا...پورے وجود پر صرف احساس کی رگیں اُبھر آئی تھیں ...آنکھ، ناک، کان سب محسوس کر رہے تھے...صرف ایک احساس...سامنے کھڑے ہوئے لوگوں نے مجھے ذلیل کیا ہے...میری توہین کی ہے...وہ غصّے کی انتہائی شدید لہر میں بہا تو بہتا چلا گیا...''

"I say... you get out!" اسمٰعیل پھٹی پھٹی بھیانک آواز میں چیخا۔

اور اُسی پل کرپا شنکر نے عجیب سحر کے عالم میں یہ سب کچھ دیکھا، اور اُس نے اپنا آپ گم ہوتا ہوا محسوس کیا...اور پل کے پل میں اسمٰعیل پورے کا پورا اُس کے اندر اُتر گیا...کرپا شنکر کو ایسا محسوس ہوا جیسے جیکی کی ہر نگاہ ریوالور کی ایک ایسی گولی ہے، جو نشانہ لے رہی ہے اسمٰعیل کا مگر زخمی ہو رہا ہے، خود کرپا شنکر...جیکی کی ہر حرکت سان رکھے چاقو کی تیز اور زہر پلائی نوک ہے جو چبھ رہی ہے، اسمٰعیل کو مگر ٹیس اُٹھ رہی ہے کرپا شنکر میں...یہ سارا کچھ کرپا شنکر نے ایک پل میں محسوس کیا۔

گپتا، جو جیکی کے ہاتھ سے جھٹکا کھا کر لڑکھڑا گیا تھا...اب سنبھالا لے چکا تھا، اور اُس نے یہ بات اچھی طرح محسوس کر لی تھی کہ جیکی کا اَب کوئی بھی اگلا قدم اُس کے کیریئر اور عزت کا نشانہ لے گا۔

گپتا اور کرپا شنکر دونوں بیک وقت جیکی طرف لپکے۔

دونوں نے دو طرف سے جیکی کو پکڑ کر اسٹاف روم سے دھکّا دے کر باہر کر دیا۔

چٹوپادھیائے اپنی کرسی پر بیٹھا تھر تھر کانپ رہا تھا۔

اسمٰعیل کی چیخ اور جیکی کی بلند آواز سن کر آس پاس سے کئی ٹیچر اور کچھ لڑکے اسٹاف روم کی طرف دوڑے۔

''کیا ہوا؟ کیا ہوا؟ اسمٰعیل جی؟ کیا ہوا سر!''

آوازوں کا ایک اژدہام اسٹاف روم کے اندر تھا، اور اسٹاف روم کے باہر جیکی غضب ناک سور کی طرح جھاگ پھینک رہا تھا...''گپتا جی! آپ نے ہمیں لا کر ذلیل کیا، آپ کو ہم دیکھ لیں گے...'' اور پھر فوراً ہی گپتا کی طرف سے رُخ موڑ کر اُس نے اُن لوگوں کی طرف نگاہ کی جو اسمٰعیل اور کرپا شنکر کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھے اور بار بار پوچھ رہے تھے...''بتائیے نا سر... کیا ہوا؟''

جیکی کو اندازہ ہو گیا کہ معاملہ اُس کے ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ پھر کوچر اور پلائی نے بھی آنکھوں آنکھوں میں جیکی کو اُس مشتعل بھیڑ کا احساس دلایا جو اسٹاف روم میں جمع ہو چکی تھی...اور شاید آہستہ سے کچھ سمجھایا بھی۔

جیکی چیختا رہا اور پلائی کوچر اُس کو اِس طرح کالج کیمپس کے باہر لے گئے، جیسے جیکی کی مرضی کے خلاف اُس کے دوستوں نے اُسے کھینچ کر وہاں سے کنارے کر دیا ہو۔

جیکی کے دوست اُسے کھینچ رہے تھے اور جیکی کی فرمائشی چیخ مسلسل سنائی دے رہی تھی—

''گپتا صاحب! آپ کو ہم دیکھ لیں گے...گپتا صاحب! آپ نے ہم کو ذلیل کیا۔''

اسمٰعیل نے ایک سرد ترین دن میں محسوس کیا کہ پورا کمرہ تیز سورج کی تپش سے دھدھک رہا ہے۔ باہر گرم ہواؤں کے جھکڑ آگ برسا رہے تھے اور صحرا کی جلتی سلگتی ریت پر ایک بے پیکر ہیولا آگ کی لپٹوں میں گھرا جھٹپٹا رہا تھا۔

❖

صحرا کی جلتی سلگتی ریت پر آگ کی لپٹوں میں گھرا ہوا اور جھٹپٹاتا ہوا بے پیکر ہیولا کوئی اور نہیں خود اسمٰعیل تھا۔

زندگی کا یہ نیا چہرا، اُس کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا، چیزیں عجب انداز سے اپنا جون بدل رہی تھیں، کالج جسے اُس کے ماموں نے اُس کے خوابوں کا حصہ بنا دیا تھا۔ اب اُس کے لیے گلے

میں اٹکا مچھلی کا کانٹا بن گیا تھا۔ کالج میں ہر روز کوئی نہ کوئی نیا خدشہ کھڑا رہتا۔ کالج کے ہینڈاَوور اور ٹیک اوور سے آج تک ہر کالج میں منظور شدہ سے زیادہ غیر منظور شدہ جگہوں پر لوگ بحال ہو گئے تھے۔ دوسری طرف جب کالج کونسٹی چیونٹ ہوا تو کالج کے سارے اثاثے کی مالک یونیورسٹی ہوگئی۔ اس کے باوجود امتحان اور داخلہ وغیرہ کے ذریعہ آنے والی رقوم کو یونیورسٹی نے داخلی ذریعہ (Internal Source) مان لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یونیورسٹی سے جو تنخواہ آئی وہ ستّر فی صد ہی آئی۔ باقی تیس فی صد کے بارے میں یونیورسٹی نے یہ ہدایت دی کہ کالج اپنے داخلی ذرائع سے پورا کر لے اور کالج کا حال یہ کہ اگر یونیورسٹی کسی کالج کے چالیس منظور شدہ عہدوں کی تنخواہ بھیجتی تو اس کالج میں ساٹھ ستّر ملازمین ہوتے کیوں کہ ہینڈ اوور اور ٹیک اوور کے بعد بھی پچھلی تاریخوں میں تقرری کرنے کا ڈرامہ چلتا رہتا۔ اب جو یہ بیس سے تیس کے درمیان فاضل ملازمین کالج میں جمع ہو گئے تھے، یہ سب تو پہلے والوں سے بھی زیادہ پیسہ دے کر آئے تھے، اس لیے وہ پرنسپل اور برسر کے سر پر چڑھے رہتے تھے، جائے ماندن نہ پائے رفتن۔ اب یہ بیس تیس فاضل ملازموں کی تنخواہ کہاں سے دی جائے؟ تو بیچ کا راستہ یہی نکلا کہ یونیورسٹی سے آئی ہوئی چالیس ملازمین کی تنخواہ ستّر ملازمین کے درمیان تقسیم کر دی جائے۔

دوسری طرف داخلی ذرائع کے نام پر جو کچھ پیسہ آتا تھا اُس میں بھی آہستہ آہستہ کمی آنے لگی، کیوں کہ پچھلے دس پندرہ سالوں میں لڑکے زیادہ تر سائنس یا نوکری دلانے والے موضوعات کی طرف راغب ہونے لگے، لہٰذا آئی ایس سی کے بعد زیادہ تر لڑکے، انجینئرنگ، میڈیکل سائنس، کامرس اور طرح طرح کے ووکیشنل اور پروفیشنل کورسز کی طرف یعنی ''علم'' سے زیادہ ''ہنر'' کی طرف متوجہ ہونے لگے، تو اَب روایتی کورسوں اور سبجیکٹس میں تو لڑکوں کا داخلہ کم ہونا ہی تھا۔ سوشل سائنس میں بھی اکنومکس، سوشیولوجی، لیبر اینڈ سوشل ڈپارٹمنٹ یا پبلک ایڈمنسٹریشن کی طرف لڑکے زیادہ جا رہے تھے، تاریخ اور سیاسیات وغیرہ کا حال اردو، فارسی، پالی اور سنسکرت وغیرہ جیسا ہو گیا تھا۔

اب ایک اور صورتِ حال پیدا ہوگئی کہ جو لڑکے آئی.ایس.سی یا آئی.کام کے بعد بی.اے.، بی.ایس.سی.، بی.کام.کرنا چاہتے تھے ان کا سامنا ایسے اساتذہ سے ہوا جو پیسے اور پیروی کے بَل پر کالج میں گھس گئے مگر صلاحیت کے نام پر وہ صفر تھے۔ پڑھے نہ لکھے نام محمد فاضل۔ ان کے پاس

ڈگری کے علاوہ کچھ نہیں تھا، لہٰذا ان کے لیے یہی بہتر تھا کہ یہ لڑکوں کا کلاس لیے بغیر حاضری بنا دیں اور پریکٹیکل کروائے بغیر نمبر دے دیں اور حاضری کے بغیر انھیں سالانہ امتحان کی اجازت دے دیں، جب اساتذہ یہ کر رہے تھے تو آخر کار نتیجہ یہ بھی نکلا کہ ایسے لڑکوں نے بھی پاس کیا جنھوں نے تاریخ کے سوالات کے جواب میں فلم کے گانے لکھے، اور وہ بھی نہ صحیح اُردو میں لکھے تھے نہ صحیح ہندی میں۔

اور پھر آخری نتیجہ یہ نکلا کہ کالج کے رجسٹر میں داخلہ سو لڑکوں کا اور حاضری دس لڑکوں کی، پروفیسروں کی موج تھی۔ ارون بھاٹیہ جیسے پروفیسر مہینے میں ایک مرتبہ تنخواہ لینے آتے تھے اور اُن کے صدقے میں بقیہ اساتذہ ہفتے میں ایک دو دن آجاتے تھے۔ کبھی کبھی یونیورسٹی سے اگر جانچ دستہ (Inspection team) کے آنے کی خبر ملتی تو اساتذہ کو فون سے خبر کر دی جاتی اور کلرک، چپراسی لڑکوں کے گھر جا کر اُن کو پکڑ لاتے۔ اُس دن ایک طرح سے سب کی پکنک رہتی۔

اس صورتِ حال سے پرانے اساتذہ نے فائدہ اُٹھایا، اُن میں صلاحیت تو تھی ہی، پڑھانے کی عادت بھی تھی اور داخلہ لینے والے لڑکوں میں بھی کم از کم پچیس تیس فی صد لڑکے تو ایسے ضرور تھے جو پڑھنا بھی چاہتے تھے، لہٰذا پرانے اساتذہ نے مل جل کر ایک کوچنگ سنٹر کھول لیا۔ لڑکوں کو خبر ملی تو پہلے پڑھنے کے خواہش مند لڑکے دوڑے اور پھر اُن کی دیکھا دیکھی کچھ اور لڑکے بھی آ گئے۔

تو یوں ہوا کہ کالج سے زیادہ بھیڑ کوچنگ میں رہنے لگی۔ مگر کالج میں جب سناٹا ہوا تو جائے خالی را دیومی گیرد... جتنے چھنٹے ہوئے نمبر دو لڑکے تھے، سب آہستہ آہستہ کالج پر غالب آنے لگے۔ کالج میں باتوں کا انداز بھی بدلنے لگا تھا، راجیو گاندھی نے بابری مسجد کا دروازہ کھلوایا تھا تو کچھ تھوڑی بہت باتیں اس کونے یا اُس کونے میں سننے کو ملی تھیں مگر راجیو گاندھی کے قتل کے بعد جب نرسمہا راؤ وزیر اعظم ہوئے تو ملک میں بھی اور کالج میں بھی باتوں کا انداز بدل گیا۔ اسمٰعیل یا اُس جیسے لوگوں کو دیکھ کر کچھ لوگ اب بھی چپ ہو جاتے یا اپنی آواز ہلکی کر لیتے مگر زیادہ تر لوگوں پر اب شعبہ تاریخ کے اسمٰعیل یا شعبۂ اردو کے لوگوں کے ہونے سے کچھ خاص اثر نہیں پڑتا۔ یہ صحیح ہے کہ اِن باتوں میں نفرت نہیں تھی مگر مہا بھارت کے سیریل کی وجہ سے قدیم تہذیب کے سلسلے میں جس قسم کی عقیدت کا اظہار کیا جا رہا تھا اُس کا لازمی نتیجہ رام مندر کی حمایت کی صورت میں نکل رہا تھا اور اِس سلسلے کی سب سے عجیب و غریب بات یہ ہے کہ مہا بھارت اتنی خوبصورتی سے بنائی گئی تھی

کہ اُسے ہندو اور مسلمان دونوں بڑی دلچسپی سے دیکھتے تھے۔

بہار میں لالو پرشاد مسلمانوں کی حمایت میں لوہے کی دیوار نظر آرہے تھے اور اڈوانی کے رَتھ کو روکنے کا کارنامہ انجام دے چکے تھے۔ مسلمانوں کو سننے میں یہ بہت اچھا لگتا تھا مگر اس کی وجہ سے ماحول میں جو گرمی اور تناؤ پیدا ہونے لگا تھا اُس سے مسلمانوں پر ایک قسم کی گھبراہٹ بھی طاری تھی۔ اور اِس میں جو کسر باقی تھی اُسے سیّد شہاب الدین کی تقریروں نے پورا کر دیا تھا۔ بے چارے فاروق عبداللہ کہتے رہ گئے کہ ہندوستان میں اَب بھی ہزاروں مسجدوں کی بازیابی باقی ہے، بابری مسجد کو بھی اُسی طرح کی ایک مسجد سمجھئے مگر سیّد شہاب الدین اور اُن کے حمایتی تو پتہ نہیں کس جھونک میں تھے، وہ لگاتار تال ٹھونکتے رہے اور اڈوانی آگے بڑھتے رہے۔

لالو پرشاد نے اڈوانی کا رتھ بہار میں روک لیا تو اُن کی خوب بلّے بلّے ہوئی، مگر یہ ایک طرح سے دیوار سے لگ کے لڑنے کا عمل تھا، اور دوسری طرف مسلمانوں کی خود فریبی تھی۔ مسلمانوں نے اپنے لیے جال کا انتظام خود کیا تھا اور جال میں پھنسنے کا پہلا عمل ''شاہ بانو کیس'' تھا۔ وہ ''جلیل القدر'' اور ''با اثر علماء'' جنھوں نے پارلیمنٹ کو قانون بدلنے پر مجبور کیا وہ ایک بوڑھے اور بوڑھی کو صلح کی میز پر نہ بٹھا سکے۔ سنگھ گھرانے والوں کی اچانک آنکھ کھل گئی، بھیڑ جمع کر کے کچھ بھی کیا جا سکتا ہے۔ ٦ر دسمبر ١٩٩٢ء کو بھیڑ جمع کر کے بابری مسجد شہید کر دی گئی۔

اُس دن بہت زور کا جھٹکا لگا۔

وہ ہو گیا تھا جس کے بارے میں اسمٰعیل نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ایسا ہو سکتا ہے۔ اُس دن وہ گھر ہی میں بند رہا، بس فون سے مختلف لوگوں کی خیریت لیتا رہا اور ٹی.وی. کے ذریعہ حالات کا جائزہ لیتا رہا۔

حالات تو گزشتہ کچھ دنوں سے مسلسل خراب ہوتے چلے جا رہے تھے۔ صورتِ حال کے پیشِ نظر وہ دو تین دن پہلے پٹنہ چلا آیا تھا۔ ٥ر دسمبر کی شام میں لکھنؤ میں تقریر کرتے ہوئے جب زمین ہموار کرنے کی بات کہی گئی اُسی وقت سمجھ میں آ گیا تھا کہ کل کیا ہونے والا ہے، مگر ہندوستان کا عام مزاج اَہنسا اور تشدد کا نہیں ہے، اسی لیے لگتا تھا کہ ایسا نہیں ہوگا— مگر ہو ہی گیا—

کوئی بھی کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں تھا، افسوس سے زیادہ ذلیل ہونے کا احساس حاوی تھا۔

اُس رات اسمٰعیل نے کچھ بے ربط آوازیں سنیں— کہنے والا کہہ رہا تھا:

ایسی فضا کو کیا کہا جائے جس میں نہ حبس ہو نہ کشاد۔

خاص طور پر ایسی صورتِ حال میں جب یہ ثابت ہو جائے کہ کچھ ثابت نہیں ہوا تو پھر کیا کہا جا سکتا ہے؟

میں نے فشار کے سامنے اُسی دن ساری صورتِ حال نمایاں کر دی تھی مگر اُس کی تو گھٹّی میں چیزوں کو مبہم رکھنا اور مبہم سمجھنا ہے۔ وہ ایک لایعنی عنصر ہے۔ جس کے بغیر اِرد گرد کی کوئی صورتِ حال مکمل نہیں ہو پاتی۔ اُس دن بھی وہی ہوا، خبر آ چکی تھی اور ہم سب اس بات کے لیے سخت متفکر تھے کہ آخر ہمیں کب اطلاع دی جائے گی۔ اس انتظار میں منتظر لمبی نیند سو گیا۔ فشار اس بات پر سخت برہم ہوا کہ یہ وقت منتظر کے سونے کا نہیں ہے۔ راوی نے اُس کو ٹھنڈا کرنے کی نیت سے اُس کو یاد دلایا کہ منتظر کی یہ کوئی نئی عادت تو نہیں ہے، اس سے پہلے بھی وہ ہر رات دس بجے سوتا ہے اور پھر دس بجے رات میں اُٹھتا ہے اور پھر دن بھر نہیں سوتا ہے۔ اب اگر بھری دوپہر میں فشار برہم ہو رہا ہے تو اِس میں منتظر کا کیا قصور؟ فشار خموش رہا اور اُس کی آواز چہار اطراف میں گونجتی رہی، میں نے سنا کچھ نہیں مگر راوی کو میں نے یہ بتا دیا کہ یہ وقت کشمکش میں گرفتار ہونے کا نہیں ہے۔ تیرا فرض بنتا ہے کہ تو خموش رہ، اس لیے کہ آگے آنے والے یہ سوال تو بہر حال کریں گے کہ تو نے اپنا فرضِ منصبی بدرجہ اتم انجام دیا کہ نہیں۔

تس پر منتظر کو ہنسی آ گئی، قہقہہ مار کر ہنسا اور بہت مضحکہ خیز انداز میں بولا کہ سراپا بیان کرنے کے مراحل میں سینے کے اُبھار اور کولہو کے ہیجان انگیز ہونے والی بات کیا معنی رکھتی ہے؟ یہاں تو ساری کائنات میں ایک عجیب قسم کی سنسنی پھیلی ہوئی ہے کہ برسوں پہلے سے جو آواز گونج رہی ہے، وہ کسی کو سنائی کیوں نہیں دیتی۔ یہ اور ایسے بہت سے سوالات سڑک کے کنارے مٹر گشتی کرتے کتّے کے سامنے جب آن کھڑے ہوتے ہیں تو اُس کے پاس اس کے سوا چارہ کار کیا بچتا ہے کہ اپنی عادت کے مطابق دونوں پیر زمین پر رکھ کر پیشاب کرتا رہے یا گردن نیچی کر کے بھونکتا رہے۔

قصہ مختصر یہ کہ اشک گیر ہنستا ہے اور پلکوں کے نیچے چِتا جلتی ہے، جس میں لکڑی کا استعمال ہے نہ آدمی کا۔ مگر جب چِتا جلی ہے تو جلنا ہے لہٰذا جلتا ہے۔ کیا جلتا ہے اس پر ایک محفلِ مذاکرہ کا بھی امکان ہے، مگر مشکل یہ ہے کہ زمانہ تو نومبر سے فروری کے درمیان کا ہے اس لیے سارے میں امن چین ہے، کہکشاں بکھری ہوئی ہے، سرسوں پھولی ہوئی ہے...

فشار نے لقمہ دیا: گدھے پالا پڑا ہوا ہے، کھیت اُجڑا ہوا ہے، بات بگڑی ہوئی ہے، کھاٹ کھڑی ہوئی ہے، باٹ تکی ہوئی ہے یا تکا جا رہا ہے...

پھر فشار گانے لگا: کھونٹ کھونٹ پھیرا بیٹھا... پینڈ پینڈ بٹ مار... ہے ودھنا کیسی رچ دینی...؟

وِدھا تا کے رنگ بھی عجیب ہیں کہ آپ ایک سنسار رچتا ہے، پھر اُس کا پاتر بن کر سوانگ بھرتا ہے، پھر کوئی پاتر نائک بن جاتا ہے کوئی کھل نائک!

''ماریئے گولی صاحب۔'' فشار پھر بیچ میں آن دھمکتا ہے۔ ''کتنا دماغ خراب کیا جائے، سب تو ہوتا ہی رہتا ہے؟''

'مگر یار! اُس بدتمیز نالائق کو یہ بھی یاد نہ رہا کہ وہ ایک روشن خیال وراثت کا وارث ہے۔''

''یار اَب کبھی بھی، کہیں بھی، کوئی بھی، کچھ بھی کرسکتا ہے، کچھ بھی کہہ سکتا ہے۔''

'یہ جمہوریت ہے کہ جمورے کا تماشہ؟''

''ایسی صورتِ حال میں کیا کیا جائے جب یہ ثابت ہو جائے کہ کچھ ثابت نہیں ہوسکتا!

اور پھر انسانی زندگی کا یہ تضاد بھی عجیب وغریب ہے کہ ہم جن لوگوں اور چیزوں کے بغیر جینے کا تصور نہیں کر سکتے، اُنہی کے بغیر ہمیں جینا پڑتا ہے، جیون تیرے رنگ ہزار، ہم کون سے رنگوں کی زبان میں گفتگو کریں کہ ترسیل کی ناکامی کا المیہ نہ پیدا ہو، آخر یہ سارا کھڑگ جو پھیلایا گیا ہے یہ صرف اِسی لیے تو کہ ہم اپنا آپا سراپا اندر سے باہر سارا کچھ ایسے لوگوں کی نذر کر دیں جن کے وجود کی دھند اِس پوری کائنات سے ہم رنگ ہو جائے اور رنگوں سے بھری اِس دنیا کا بے چین چہرہ تکنے والے کے لیے دیوارِ چین اور جھیلنے والے کے لیے سائبیریا بن جائے۔

وہ دن بالآخر آن پہنچا اور اب میں ماتم گسار ہوں، اُن صاحبوں کا جن کو بحیثیت رودالی مقرر کیا گیا تھا کہ وہ بیچاری تو جغرافیہ سے تاریخ بنی سو بنی مگر یہ سارے ماتم گسار تو تاریخ کے پنّوں سے بھی غائب ہونے کی منزل پر آ گئے۔

لہٰذا آیئے، ہم سب مل کر ماتم کریں اور اس بات پر بغلیں بجائیں کہ ہم ایک ایسی فضا کے مقابل ہیں جس میں نہ حبس ہے نہ کشاد!

سیّد ضعیف الدین صاحب! سپریم کورٹ ہی میں، آپ پر اقدامِ قتل کا مقدمہ کیوں نہ دائر کر دیا جائے؟

اسمٰعیل ان بے ربط جملوں کو کوئی معنی نہ پہنا سکا، مگر یہ جملے اپنے فل اسٹاپ، کوما اور وقفہ کے ساتھ اُسے یاد تھے۔ مدتوں یہ جملے اُسے یاد آتے رہے اور وہ اندر اندر خود کو ریزہ ریزہ ہوتا محسوس کرتا رہا۔

مگر دوسرے دن وہ کالج جانے کے لیے تیار ہو گیا۔

اُس کے اِس ارادے کی صرف شہوار نے نہیں، سبھی نے مخالفت کی، ماموں بھی کہنے لگے کہ دو چار دن رُک جانا بہتر ہے مگر اسمٰعیل کا ایک ہی جواب تھا...''اگر آج نہیں گیا تو پھر کبھی نہیں جا سکوں گا۔''

جاڑے کا زمانہ، مگر اُس نے پہلی ٹرین پکڑی اور کالج وقت پر پہنچ گیا۔

کالج میں سبھی لوگ موجود تھے، مگر ۷ر دسمبر کو اُس کا کالج پہنچنا بہت غیر متوقع واقعہ تھا، سب نے اُسے حیرت سے دیکھا، نرمی اور محبت سے بات کی اور ۶ر دسمبر کی کوئی گفتگو کالج میں نہیں ہوئی۔

دوپہر میں زیادہ ہم پیشہ احباب جا چکے تھے، وہ اور صدر شعبہ بنسی دھر دونوں تنہا تھے تو بنسی دھر نے اسمٰعیل کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا اور آہستہ سے بولے، ''اسمٰعیل! میرے گھر میں زیادہ لوگ نہیں ہیں، دو چار دن تم میرے ساتھ رہو۔''

''سر!'' اسمٰعیل ہنس دیا اور بنسی دھر کے ہاتھ پر اپنا دوسرا ہاتھ رکھ دیا اور بولا ''سر! آج کی رات اگر میں نے اپنی جگہ بدلی تو پھر میں پاکستان چلا جاؤں گا۔''

بنسی دھر نے جلدی سے اُس کے منہ پر ہاتھ رکھا اور ہنستے ہوئے بولے، ''بہت اموشنل ہو بھائی!''

وہ کالج سے لوٹنے کو تھا کہ پرنسپل صاحب ٹہلتے ہوئے اسٹاف روم میں آ گئے۔ اسمٰعیل سے اِدھر اُدھر بات کرتے رہے پھر لوٹتے ہوئے بولے، ''اسمٰعیل صاحب! اگر ہفتہ دس دن کچھ کٹھنائی ہو تو بال بچوں کے پاس رہیے۔ کالج کے لیے کوئی ٹینشن لینے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''تھینک یو سر!'' اسمٰعیل مسکرا کر بولا۔ ''اگر ایسی کوئی ضرورت پڑی تو آپ کی بات یاد رکھوں گا۔''

کالج سے نکلتے نکلتے اچانک تیز قدموں سے اسمٰعیل نے ارون بھاٹیہ کو اپنی طرف آتا دیکھا۔ اس کی تیز رفتار دیکھ کر اسمٰعیل ایک منٹ کے لیے ٹھٹھک گیا، مخمصے میں پڑا، شک نے دل میں گھر

کیا، اس کا ارادہ کیا ہے؟ مگر پھر جی کڑا کیا: 'دیکھا جائے گا۔'' وہ اپنی چال سے چلتا رہا۔ ارون بھاٹیہ نزدیک آ ہی گیا، اس کا چہرہ ستا ہوا تھا، اُداس اُداس...اسمٰعیل کے پاس آ کر رُکا، دونوں ہاتھ جوڑے، ''اسمٰعیل جی! میں اپنے کمینے سہہ دھرمیوں (ہم مذہبوں) کے کوکرم (برا کام) کے لیے آپ سے چھمایاتنا کرتا ہوں۔''

یہ ایک عجیب صورت حال تھی جس کی اسمٰعیل کو قطعی توقع نہیں تھی۔

اسمٰعیل نے ارون بھاٹیہ کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا، اُسے چوما اور گریہ آمیز لہجے میں بولا:

''میں تمھارے اندر کے اِس میٹھے پن کو سلام کرتا ہوں ارون بھاٹیہ۔''

پھر اُس نے گھر آتے ہوئے ایس ٹی ڈی سے ماموں کو فون کر کے اطمینان دلایا اور وہاں کا حال چال بھی جان لیا۔

اُس کے من کا بوجھل پن بہت حد تک دور ہو چکا تھا۔

برسوں سے اسمٰعیل کا معمول تھا کہ مغرب بعد چند دوستوں کے ساتھ منڈلی جمتی تھی، جس میں اُسی علاقے کے ایک دوسرے کالج کے استاد ڈاکٹر مرتنجے ضرور رہتے تھے، اُن کے علاوہ اورنگ آباد کالج کے پروفیسر کیلاش، ایک اسکول کے ہیڈ ماسٹر ظفر عالم، اردو کے پروفیسر عادل حسن شبیر۔

اُس دن صرف ڈاکٹر مرتنجے اور عادل حسن شبیر ہی شام میں آئے۔

''سناٹے کا انو بھو ہو رہا ہے ڈاکٹر، کیا بات ہے؟ بچے کہاں ہیں؟'' ڈاکٹر مرتنجے نے پہنچتے ہی سوال کر دیا۔

''نانا کے یہاں چلے گئے ہیں۔''

''ہاہاہا...'' مرتنجے بہت زور سے ہنسے۔ ''اُن لچوں کی گیدڑ بھبھکی میں آپ بھی آ گئے؟''

''نہیں ڈاکٹر! نانا ماموں کی ضد کے آگے ہار گیا۔''

''ہاں بھائی۔ نانا کو تو سمجھا دیا جا سکتا ہے مگر ماموں؟ بیوی کا بھائی...ساری خدائی ایک طرف جورو کا بھائی ایک طرف۔''

''مگر اس کا ایک اور پہلو بھی ہے ڈاکٹر صاحب...'' عادل حسن شبیر بولے۔

زردار کے سب ہیں سالے
بے زر کا کوئی بہنوئی نہیں

محفل قہقہہ زار ہو گئی۔

پتہ نہیں، یہ شعوری طور پر ہوا یا غیر شعوری طور پر مگر ایسا ہوا کہ ڈاکٹر مرتنجے اور عادل حسن شبیر نے اُس شام کے بوجھل پن کو ہلکا کرنے کی ایک ذرا سی کوشش تو کی، یہ الگ بات ہے کہ یہ کوشش بہت دیر تک کامیاب نہ رہ سکی۔ خود عادل حسن شبیر، شاعر آدمی اندر سے بہت ٹوٹے ٹوٹے لگ رہے تھے، مرتنجے کسی پارٹی کا رکن نہیں تھا، مگر روشن خیال بلکہ بائیں بازو کے خیالات سے جڑا ہوا آدمی تھا۔ ہر آدمی ۶ر دسمبر کے ذکر سے خود کو بچانے کی کوشش کر رہا تھا مگر اندر اندر کوئی آدمی ۶ر دسمبر سے آگے نہیں بڑھ پا رہا تھا۔

اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔

اسمٰعیل نے اُٹھ کر دیکھا۔ دروازے پر مولانا افتخار الحسن تھے۔ جہان آباد کے ایک مدرسے کے مدرس اعلیٰ!

''السلام علیکم!'' اُنھوں نے زور سے ہانک لگائی۔

''آیئے آیئے مولانا...وعلیکم السلام...آپ اِس وقت...یہاں؟''

''ارے بھائی! یہاں ہمارے ایک رشتہ دار رہتے ہیں۔'' اُنھوں نے دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اُنھی کی خیریت لینے چلا آیا تھا۔ سوچا، آپ کا حال چال بھی لیتا چلوں۔''

''سب اللہ کا شکر ہے بھائی۔''

''ہاں بھائی۔ اللہ کا شکر تو ہر حال میں ادا کرنا ہے مگر کل تو وہ ہوا جس کے بعد دل یہاں سے اُٹھ گیا۔ دن بدن یہاں کے حالات خراب ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ ثابت ہوتا جا رہا ہے کہ ہم کافروں کے ملک میں ہیں اور اُن کے رحم و کرم پر ہیں۔ ایسے ہی حالات میں ہجرت واجب ہو جاتی ہے۔''

''مولانا! آپ نے تو آتے ہی گولی داغ دی۔ ذرا چین سے بیٹھیے تو۔''

''اسمٰعیل صاحب! چائے وائے پلوایئے بھائی۔'' شاعر شبیر حسن نے مولانا کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

''ہاں ہاں ضرور۔'' اسمٰعیل نے گھر میں کام کرنے والے لڑکے کو آواز دی، ''چائے بن گئی بیٹا

تو لے آؤ۔"

"جی سر، لایا۔"

پھر چائے آ گئی۔ چائے کی چسکیوں نے تھوڑا سا وقفہ پیدا کیا۔ مگر مولانا اندر سے بہت بھرے بھرے تھے۔

"سب سے بڑا مجرم نرسمہا راؤ ہے۔" مولانا پھر شروع ہو گئے۔ "کہنے کو اُردو فارسی کا عالم ہے، دہلی کے ایک جلسے میں، میں نے اُس کی تقریر سنی تھی، کیا فصیح اُردو بولتا ہے، مگر اس کے باوجود، اس پورے معاملے میں اس کا رویہ انتہائی مجرمانہ رہا۔"

"اور سیّد شہاب الدین کے بارے میں کیا خیال ہے آپ کا؟" شبیر حسن عادل نے آہستہ سے پوچھا۔

"ماریئے، اُس کا کیا تذکرہ کر رہے ہیں؟ سنا ہے، ہندوؤں نے مندروں میں اُس کی مورتی بھی بٹھا دی ہے۔"

ابھی بات یہیں تک پہنچی تھی کہ راشٹریہ جنتا دل کے ایک مقامی رہنما برجیش یادو بھی آن پہنچے۔

جس وقت برجیش یادو پہنچے، اُسی وقت شبیر حسن عادل نے مولانا افتخار الحسن سے یہ سوال کیا تھا کہ "جو کچھ ہوا، اُس کی وجہ کیا ہے؟"

ڈاکٹر مرتنجے کو شاید مولانا نہیں پہچانتے تھے، مگر برجیش یادو ڈھری سے اورنگ آباد تک جانا پہچانا چہرہ تھے اور ویسے بھی اُنھوں نے دونوں ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا تھا۔ مولانا کا انداز اچانک ہی بدل گیا۔

"دیکھیے بھائی! یہ سب مسلمانوں کی اپنی بدعملی کا نتیجہ ہے، جس کو ایک جملے میں یوں بھی ادا کیا جا سکتا ہے کہ "اللہ سے دوری کا یہ سب نتیجہ ہے۔"

مولانا کے اِس جملے پر ڈاکٹر مرتنجے بے ساختہ ہنس پڑے۔ یوں ہنسے کہ اُن کے بتیسوں دانت نمایاں ہو گئے۔

سبھی نے مرتنجے کو ذرا حیرت سے دیکھا۔

"کیا بات ہے ڈاکٹر!" اسمٰعیل نے ذرا حیرت سے پوچھا۔ "آپ مولانا کی بات پر ہنسے کیوں؟"

"بس یونہی بھائی۔ کوئی خاص بات نہیں۔" مرتنجے کا انداز ٹالنے والا تھا۔

"نہیں جناب! خود یہ ہنسی بھی عام ہنسی نہیں تھی۔ اب ہنسنے کی وجہ تو آپ بتا ہی دیجیے۔"

"آپ لوگوں سے ہاتھ جوڑ کے چھما مانگتا ہوں، آئندہ نہیں ہنسوں گا۔" مولانا نے حیرت سے اُسے دیکھا۔ "اچھا یہ بھی کافر ہی ہے؟"

"نہیں ڈاکٹر صاحب! آپ ہنسیے بھی اور کارن بھی بتائیے۔" برجیش یادو نے شوخی سے کہا۔

"دیکھیے بھائی۔" ڈاکٹر مرتنجے بالآخر بولنے پر مجبور ہو گئے۔ "مجھے ہنسی اس بات پر آئی کہ بابری مسجد کے گرائے جانے کو مولانا اللہ سے دوری کا نتیجہ قرار دے رہے ہیں، جب کہ میرے خیال میں مسجد اس لیے گری کہ "مسلمان مولانا کے اللہ سے زیادہ نزدیک ہو گئے ہیں اور اسمٰعیل اور عادل جی کے اللہ سے دور ہو گئے ہیں۔"

"لو مرتنجے نے بھڑ کے چھتّے میں ہاتھ ڈال دیا۔" اسمٰعیل نے تاسّف بھری کیفیت کے ساتھ سوچا۔

شبیر حسن عادل مسکرا کر چپ ہو رہے... برجیش یادو نے جیب سے کھینی نکالی اور ہتھیلی پر مسلنے لگا۔

"معاف کیجیے گا..." مولانا نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔ "ہمارے یہاں اللہ ایک ہے۔"

"جی ہاں! قرآن نے تو ایک ہی اللہ کی شکچھا (تعلیم) دی ہے، مگر آپ لوگوں نے الگ الگ اللہ بنا لیا ہے۔"

"ایسا ہم سوچ بھی نہیں سکتے۔"

"سچ مچ۔ آپ ایسا سوچتے نہیں ہیں مگر ایسا آپ کرتے ضرور ہیں۔"

"کچھ اکزامپل (مثال) دے کے ثابت کیجیے ڈاکٹر صاحب۔" شبیر حسن مسکرا کر بولے۔

"دیکھو شاعر، تم تو جانتے ہو، میں مشاعرہ شوق سے سنتا ہوں، ایک مرتبہ بشیر بدر کو سنا تھا، اُن کا ایک شعر یاد رہ گیا ؎

خدا ایسے احساس کا نام ہے — جو رہے سامنے اور دکھائی نہ دے

تو یہ خدا جو رگوں اور ناڑیوں میں خون اور احساس بن کر دوڑتا رہتا ہے، وہ مولانا کے یہاں ایک ایسا اللہ بن کر دل دماغ پر چھایا رہتا ہے، جو آدمیوں کو کافر اور مومن میں بانٹ کر رکھتا ہے، مگر

اسی بھارت میں صوفی پرمپرا ابھی رہی جس کو صحیح ماننے والوں میں اسمٰعیل بھی ہیں اور شاعر، تم بھی ہو۔ یہ صوفی پرمپرا پچھلے ایک ہزار سال سے یہاں اپنا کام کرتی رہی۔ اور اِس نے پچھلے پانچ سو برسوں میں اِنہی سارے لوگوں کے بیچ، جنہیں آپ کافر اور مسلمان میں بانٹ کے دونوں کے لیے الگ الگ ماپ دنڈ تیار کرتے ہیں، اِنہی کے بیچ یہ مسجد بچی رہی۔ کبھی آپ نے سوچا ایسا کیوں ہوا؟'' اتنا کہہ کر مرتنجے رُک گئے۔

''ڈاکٹر! اپنی بات پوری کیجیے، آپ کا سوال دلچسپ ہے؟'' شبیر حسن عادل نے مسکرا کر کہا۔

''عادل صاحب! میرے خیال میں اس لیے کہ صوفی پرمپرا نے کافر مسلمان والی بات کو آستھا تک سِمٹ رکھا اور روز مرّہ کی زندگی میں اُس نے اپنے ماننے والوں کو رنگ، نسل اور آستھا کی بنیاد پر بھید بھاؤ کرنے سے منع کیا۔ قرآن شریف کا اَنو وَاد میں نے پڑھا ہے۔ اُس میں اللہ اپنے کو سارے جگ کا کیول اللہ ہی نہیں کہتا، سارے جگ کا پالنہار کہتا ہے اور حضرت محمدؐ کو سارے جگ کے لیے کرونا (رحمت) کا سروت (منبع) بتاتا ہے۔ میں نے اس چھوٹے سے شہر میں اسمٰعیل جی اور عادل جی جیسے ڈھیر سارے لوگوں کو دیکھا، وہ لوگ جس پریم اور شانتی سے جیتے ہیں، صوفی پرمپرا والے اللہ کی یہی تو شکچھا ہے۔ اس لیے مولانا آپ یا ہم نہ کافروں کے دیش میں ہیں اور نہ ہی مسلمانوں کے دیش میں۔ دیش اور دھرتی تو ساری کی ساری بھگوان کی ہے۔ اس میں کچھ اچھے لوگ ہیں کچھ برے لوگ۔ اور یہ ہر جگہ ہیں۔ پریکٹیکل بات بس اتنی ہے، اور وہ جو آپ کافر اور مسلمان کی بات کر رہے ہیں، تو کسی کافر کا بھی تو دل ٹٹول کے دیکھیے وہ آپ کو کافر اور اَدھرمی سمجھتا ہوگا مگر اپنے کو مذہبی اور دھارمِک۔ اس لیے مولانا اس چکر میں مت پڑیئے، جو ہوا وہ کریمنل ایکٹیویٹی (مجرمانہ حرکت) ہے اور اِس کا کچھ لینا دینا ہندو دھرم سے نہیں ہے، کوئی دھرم اس کو اچھا کام نہیں مانتا کہ کسی کا گھر ہو یا پوجا گھر ہو، اُس کو جور جبر دستی سے ڈھا دیجیے اور کوئی دوسرا اُس پر قبضہ کر لے۔''

مولانا اتنی دیر میں پوزیشن سنبھال چکے تھے، بہت تمتمائے لہجے میں بولے:

''آپ ڈاکٹر ہیں، تو آپ کی ڈاکٹری میں ہم دخل دینے آتے ہیں؟ آپ کو، چاہے اسلام ہو چاہے ہندو دھرم، کسی بھی دھرم اور اُس کی تعلیمات کے بارے میں بولنے کا حق نہیں ہے۔ اگر ڈاکٹری کو وہی سمجھ سکتا ہے جو ڈاکٹر ہو تو دھرم کو بھی وہی سمجھ سکتا ہے جس نے دھارمک تعلیم پائی ہو۔

آپ تو اللہ کو بھی ایک کی جگہ دو چار بتا رہے ہیں، اس سے زیادہ غلط بات کیا ہوگی اور ہر جگہ کچھ لوگ دھرم کے ماننے والے ہوتے ہیں کچھ نہیں ماننے والے ہوتے ہیں۔ کفر کا مطلب ہی ''نہیں ماننا ہے'' انکار کرنا ہے۔ ہمارے ہندوستان کے دستور میں یہ لکھا ہے کہ جو اس دستور کو نہیں مانے گا وہ ہندوستان کا باغی سمجھا جائے گا، تو اگر اسلام نے اسلام نہ ماننے والے کو کافر کہا تو کیا غلط کہا۔ یہ سارے نکسلائٹ جو ہندوستان کا دستور نہیں مانتے، اُن کو بھی تو ہم لوگ مجرم ہی سمجھتے ہیں۔ اُن سے لڑتے ہیں اور اگر وہ مارے جاتے ہیں تو اُن کے مارے جانے کو کوئی بھی مرڈر (قتل) تو نہیں کہتا۔ ہمارا بس اِس دنیا تک چلتا ہے۔ اللہ اُس دنیا میں مرنے کے بعد سزا دے گا۔ یہ ماننے میں کیا کٹھنائی ہے؟ رہی بات اِس دنیا کی تو ہم کو یہ بتایا گیا ہے کہ کافروں سے کبھی اچھائی کی اُمید نہ رکھو اور اُن کو اپنے دل کا راز اور بھید مت بتاؤ تو یہ کون سی غلط بات ہے؟ ہر آدمی اُسی کو اپنے دل کی بات بتاتا ہے جو اُس کے دُکھ کو سمجھنے والا ہوتا ہے۔ آپ لوگوں نے تو بابری مسجد ڈھا کے یہ بتا دیا کہ آپ ہمارے دوست نہیں ہیں۔''

محفل بہت گرم ہوگئی تھی، اسمٰعیل، شبیر حسن، برجیش سبھی اندر اندر اس بحث سے ذرا گھبرا گئے تھے۔ ابھی دو چار دن پہلے ملک میں جو کچھ ہوا اس کی وجہ سے تو فضا میں تناؤ تھا ہی، اُس پر ڈاکٹر مرتنجے اور مولانا افتخار الحسن کے درمیان کی یہ بحث؟

''بھئی! اس بحث کو ختم کیجیے۔ اب تو جو ہوا، سو ہوا۔'' اسمٰعیل نے گفتگو کو سمیٹنا چاہا۔

''ہاں بھائی!'' برجیش یادو نے اسمٰعیل کی بات کو آگے بڑھایا۔ ''یہ دیش وبھنّ دھرموں کے ماننے والوں کا دیش ہے اور سب کی اپنی اپنی آستھائیں ہیں اور اس دیش کی بڑائی یہی ہے کہ ہمارے سمودھان کے انوسار سب اپنی اپنی آستھاؤں کے ساتھ جی سکتے ہیں۔''

''آپ لوگ تو اسکیپ کر رہے ہیں۔ بھاگ رہے ہیں۔ شاید آپ لوگ سمواد (مکالمہ) کرنا ہی نہیں چاہتے۔'' شبیر حسن کے چہرے پر اک ذرا مایوسی چھا گئی۔

''میں عادل جی کے وِچار کے ساتھ ہوں۔ بات تو ہونی چاہیے۔'' ڈاکٹر مرتنجے نے پھر مسکرا کر کہا۔

''مگر بھائی!'' ظفر عالم جو اس بحث کے بیچ ہی آئے تھے، سنجیدگی سے بولے۔ ''آپ لوگ بحث ضرور کیجیے لیکن ایک بات من میں بٹھا لیجیے کہ اس کمرے کی بات کمرے سے باہر نہیں جائے گی۔''

''ہاں! ایسا ہونا اس لیے بھی ضروری ہے کہ ہماری باتوں سے کوئی اَن چاہا میسج عام آدمی تک نہ پہنچ جائے۔'' ڈاکٹر مرتنجے نے بھی ظفر عالم کی بات سے اتفاق ظاہر کیا۔

''تب ٹھیک ہے۔'' اسمٰعیل نے محسوس کیا کہ وہ بحث روکنے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔

''کیوں مولانا؟ آپ اس خیال سے متفق ہیں نا؟'' شبیر حسن نے مولانا افتخار الحسن سے پوچھا۔

''آپ سب لوگوں کی یہی رائے ہے تو میں بھی ساتھ ہوں۔'' مولانا کے پاس شاید اتفاق کرنے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں تھا۔

''تو ڈاکٹر مرتنجے!'' شبیر حسن مرتنجے کی طرف مڑا۔ ''مولانا کے خیالوں پر اپنی رائے وِچار رکھیے۔''

''بھائی مجھے کچھ بہت لمبی چوڑی بات نہیں کرنی ہے۔'' مرتنجے کا رُخ مولانا کی طرف تھی اور آنکھ شبیر حسن کی طرف۔

''ایک دو بات سمجھنا چاہتا ہوں، مولانا نے جو ڈاکٹری اور اسلام کو جوڑ کے دیکھنا چاہا ہے۔ یا جو بھی کسی دوسرے سبجیکٹ اور کسی دھرم کو جوڑ کر سمجھنا چاہتا ہے تو اُس میں پہلی سمجھنے کی بات یہ ہے کہ کسی سبجیکٹ یا فیکلٹی والا کسی سے یہ ڈیمانڈ تو نہیں کرتا کہ تم میرے سبجیکٹ یا فیکلٹی کی کتاب پڑھو، پابندی سے پڑھو بلکہ روز پڑھو، یہ ڈیمانڈ تو کیول دھرموں کی طرف سے ہے اور جہاں تک مجھے معلوم ہے سب سے ادِھک اسلام کے دھرم گروؤں کی طرف سے آتا ہے تو یہ بات میں کیول اپنے سمجھنے کے لیے پوچھ رہا ہوں کہ کسی نے بھی کیا سنسار میں یہ چلن دیکھا ہے کہ ایک آدمی کو کوئی کتاب، پنّا یا پیج دیا جائے کہ تو اسے پڑھ مگر دیکھ تو اِس کو اپنے سے سمجھنے کی کوشش مت کر، تو کیول پڑھ، سمجھاؤں گا میں۔ ارے بھائی! آپ ہی کو سمجھانا ہے تو ہم کو پڑھنے کو کاہے کو دیا ہے۔ یہ جو ساری دنیا میں اتنا قرآن شریف اتنی بھاشاؤں میں بانٹا جا رہا ہے، یہ اگر کیول لکھا ہوا پڑھنے کے لیے مطلب Recitation کے لیے ہے تو اتنا اَنوواد بانٹیے ہی مت، اور جب آپ اَنوواد بانٹ رہے ہیں تو پڑھنے والے کو اتنی چھوٹ تو دینی ہوگی کہ اُس ٹرانسلیشن کے سہارے جس ٹرانسلیشن کو آپ نے بھی اس قابل مانا ہے کہ قرآن سمجھنے کے لیے اس کا سہارا لیا جائے، تو اَب اگر اُس ٹرانسلیشن کو پڑھتے ہوئے اس کی سمجھ میں آپ کی سمجھ سے الگ کچھ باتیں سر اُٹھاتی ہیں تو پھر 'شٹ اَپ' تو مت کہیے۔

دوسری بات: یہ کہنا آپ کا سچ ہے کہ دھرم کو وہی سمجھ سکتا ہے جس نے دھارمک تعلیم پائی ہو، لیکن آپ دھارمک تعلیم کا مطلب یہ سمجھاتے ہیں کہ اگر وہ مسلمان ہے تو اس نے عربی پڑھی ہو اور عربی پڑھی ہے تو کہاں پڑھی ہے؟ میں نے دیکھا ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے تھیولوجی ڈپارٹمنٹ کے ٹیچر کو بس پروفیسر کہا جاتا ہے اور سمجھا جاتا ہے اور جو دیوبند، بریلی سے خالی قرآن یاد کر کے چلا آتا ہے اور اب کسی مسجد میں نماز پڑھا رہا ہے وہ بھی دھارِمک معاملوں میں اپنے کو تھیولوجی ڈپارمنٹ کے پروفیسر سے بڑا (Super) سمجھتا ہے اور سماج میں بھی جو حافج (حافظ) جی کرتا پیجامہ اور ٹوپی کے ساتھ نظر آتے ہیں پبلک دھرم کے بارے میں اُن کی بات پر ادِھک دھیان دھرتی ہے اور اُس بیچارے عربی میں ایم.اے.، پی ایچ.ڈی. کرنے والے کو پروفیسر کے کھاتے میں ڈال کے سب پر اپنی بات لادتی ہے اور عام آدمی میں یہ بات پھیلاتی ہے کہ یہ تو کوٹ پینٹ والے پروفیسر صاحب ہیں حالاں کہ اَب یہ بات ثابت ہو چکی کہ حضرت محمدؐ کا ڈریس کوڈ وہ نہیں تھا جو آج کے مولوی صاحب لوگوں کا ہے اور کوٹ پینٹ بھی یورپ کا ڈریس نہیں ہے، یہ تو اصل میں ترکوں کا ڈریس ہے جو کبھی اسلام اور اسلامی شکچھا کا شروت بھی رہ چکے ہیں اور اسلام کے رکچھک بھی۔ اور رہی بات داڑھی کی تو اَب آپ مولانا مانیے یا نہ مانیے۔ ایک پاکستانی فلم 'خدا کے لیے' میں نصیر الدین شاہ کا جو ڈائیلاگ ہے، وہ لاکھ ٹکے کی بات ہے کہ ''اسلام میں داڑھی ہے، داڑھی میں اسلام نہیں۔'' تو آپ کن دھارمک لوگوں کی بات کر رہے ہیں، اور جن کو آپ دھارمک نہیں سمجھ رہے ہیں وہ کیوں دھارِمک نہیں ہیں، یہ آج تک میری سمجھ میں نہیں آیا۔

تیسری بات: مولانا کو میری یہ بات پسند نہیں آئی کہ مولانا کا اللہ الگ ہے اور اسمٰعیل جی جیسے صوفی پر میرا والوں کا اللہ الگ ہے۔ ایک طرح سے اُنھوں نے مجھ کو ڈانٹا ہے کہ میں ایک اللہ کی جگہ دو چار اللہ کی بات کر رہا ہوں۔ مولانا کی ڈانٹ میں اپنے سر پر رکھتا ہوں پرنتو میں اپنی بات سے پیچھے نہیں ہٹوں گا۔ مولانا نے تو دو چار اللہ نہیں دس بارہ اللہ بنا رکھے ہیں۔ اُن کے حساب سے مسلمانوں کا اللہ تو اللہ ہے مگر ہندوؤں کا اللہ ایشور، پربھو، پرماتما، بھگوان کچھ بھی ہو، مولانا کا اس سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ اُن کا اصل زور اِس بات پر ہے کہ اللہ ہندوؤں کا اللہ نہیں ہے، اِسی طرح عیسائیوں کا خدا گوڈ ہو یا فادر مگر عیسائی اپنے خدا کو اللہ نہیں کہہ سکتے، ایسا ہی برا حال مولانا نے سکھوں اور قادیانیوں کا بھی بنا رکھا ہے۔ اب تو آپ لوگ آہستہ آہستہ خدا کو بھی اسلام نکالا دے

رہے ہیں تو اللہ تو آپ ہی نے درجنوں بنا رکھا ہے، پھر ہم نے اگر کہا تو کون سا پاپ کیا؟

مولانا نے کفر کی meaning ''نہیں ماننا'' انکار کرنا بتایا ہے، بالکل ٹھیک ہے، پرنتو قرآن میں کیول اللہ — رسول، نرک — سورگ کے ماننے اور نہیں ماننے کی بات نہیں کی گئی ہے۔ اچھائی کو ماننے کی بات بھی کی گئی۔ ایک ایسے سماج کو سویکار کرنے کی بات بھی کی گئی ہے جس میں ویوہارک جیون (عملی زندگی) میں آستھا کی بنیاد پر کوئی بھید بھاؤ نہ برتا جائے، حضرت محمدؐ کی پوری جیونی یہی بتاتی ہے اور جو ایک امن چین والا سماج قائم کرنے کے خلاف ہیں، اُن سے لڑنے کے لیے کہا گیا ہے۔ اب اس ماپ ڈنڈ پر کون کون انکار کرنے والا ہے، کافر ہے اور کون کون مان لینے والا ہے مومن ہے۔ اس کی پری بھاشا تو آج تک کی ہی نہیں گئی مولانا! اب تو کیول جتھا سچ ہے اور جتھا جھوٹ ہے اور ساری سمسیا یہیں سے پیدا ہوتی ہے۔

اس سنسار اور اُس سنسار کی بات تو ہر دھارمک پُستک میں کی گئی ہے۔ مگر ذرا دھارمک کتابوں کی آتما کو سمجھنے کی کٹھنائی بھی مول لیجیے تو پتہ چلے کہ بدلے کا قانون ہر جگہ چلتا ہے۔ نیکی کا بدلہ نیکی ہے، بدی میں بد کا ساتھ ہے، کیا کھوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے۔ آدمی اس سنسار میں جو کچھ کرتا ہے اُس کا بدلہ تو اُس کو یا اُس کی اگلی پیڑھی کو اسی دنیا میں ملتا ہے کبھی جلدی ملتا ہے کبھی دیر سے۔ بہت سے پیڑ ایسے ہیں جن کو دادا لگاتا ہے تو پوتا اُس کا پھل کھاتا ہے۔ مگر جس کی جو آستھا ہے وہ صحیح ہے یا غلط، ہوسکتا ہے اِس کا حساب اُس دنیا میں ہو۔ ایسا میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ آستھا بھی دکھائی دینے والی وستو نہیں ہے اور وہ سنسار بھی جیتے جی کسی کو دکھائی نہیں دیتا ہے، تو لگتا ہے کہ Subjectivity کو subjectively ہی سے تولا جائے گا۔

آج میں ایک اور بات کہنا چاہتا ہوں، میں جو کہہ رہا ہوں یہ بھی میں اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا ہوں، میں صوفیوں، فقیروں کی سنگت میں بیٹھا ہوں، خواجہ صاحب کے یہاں گیا، وارث پیا کے مزار پر گیا، دہلی میں حضرت محبوب الٰہی کے یہاں گیا۔ وہاں کا رنگ ڈھنگ الگ ہے۔ دیوبند بریلی کا رنگ نہیں ہے، وہاں کا سُر میٹھا ہے۔ میں تو مسلمان ہونے کے بارے میں سوچ رہا تھا مگر صوفی پرمپرا نے بتایا کہ جتھا بنانا اصل کام نہیں ہے، پھر مولانا آزاد کو پڑھا تو وہ بھی یہی کہتے نظر آئے کہ قرآن کی بولی میں اسلام جس کا نام ہے وہ مُنش جاتی سے یہ مانگ نہیں کرتا کہ لوگ کسی ایک جتھے سے کٹ کر کسی دوسرے جتھے سے جڑ جائیں۔ اسلام آدمیوں سے یہ کہتا ہے، تمھارے ویوہار پر،

تمھاری سوچ پر جو دھول گرد پڑ گئی ہے، جم گئی ہے، اُسے ہٹاؤ، دھول گرد ہٹنے کے بعد جو بچے گا اُسی کا نام قرآن کی بولی میں اسلام ہے۔ اور یہ بھی ٹھیک ہے کہ کافروں کو دوست مت بناؤ، بھلا سماج کو توڑنے والے اور سماج کو جوڑنے والے کے بیچ دوستی کیسے ہوسکتی ہے۔ بس کافر اور مومن کا جو ماپ دنڈ آپ بتا رہے ہیں، میری نظر میں یہ قرآن کا ماپ دنڈ نہیں ہے، ہندوؤں کے برہمنوں، عیسائیوں کے پوپ اور یہودیوں کے ربّیوں کی طرح مسلمانوں کے مذہبی ذمّہ داروں نے بھی ایک جتھا اور بہت مضبوط جتھا تیار کر رکھا ہے، جس کی روزی روٹی کم پڑھے لکھے مسلمانوں کے ذریعہ ملتی ہے۔ اور اسی کم پڑھے لکھے لوگوں کی بھیڑ کو اپنے ساتھ لے کر یہ اپنی بات منواتے ہیں۔

''بابری مسجد گرا دینے سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ یہاں کے ہندو مسلمانوں کے دوست نہیں ہیں۔'' اِس وچار میں کوئی دَم نہیں ہے، جب تک سرکاری سطح پر یہ اعلان نہیں ہو جاتا اور جب تک مرتجے، عادل اور اسمٰعیل دوست ہیں، تب تک یہ وِچار غلط ہی مانا جائے گا، جو آپ کہہ رہے ہیں، اگر یہ سچ ہوتا تو پچھلے تین دنوں سے ٹی وی پر جس طرح ڈھیر سارے ہندو ایک سیاسی پارٹی کی اُس گندہ مگر جاہل بھیڑ کے خلاف اپنا غصہ دکھا رہے ہیں، ویسا نہیں ہوتا۔ مولانا! سچ کو سمجھنے کے لیے جو کچھ ہوا اُس کو اُس کے صحیح پری پیکچھ (تناظر) میں سمجھنا ہوگا۔''

''اتنا ہی نہیں۔'' ڈاکٹر مرتجے رُکے تو عادل حسن شبیر نے کہا: ''یہ جو آپ صوفی پرمپرا والی بات کہہ رہے ہیں، یہ صرف مسلمانوں تک رُکی رہنے والی بات نہیں ہے، وسطی ہندوستان کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُس زمانے میں مسلم صوفیوں کی طرح ہندو سنتوں نے بھی پریم مارگ کی اس آواز کو بلند کرنے کے لیے ساتھ ساتھ آواز اُٹھائی۔ ایک طرف تو یہ ہوا کہ ایک خدا کے کنسیپٹ (concept) نے اتنا زور پکڑا کہ شنکراچاریہ سے سوامی وویکانند تک سبھی نراکار کا اعلان کرنے لگے۔ اس بیچ گرونانک، کبیر، رِشی فقیر، بلّھے شاہ سبھی آتے ہیں، اس بھارت ورش میں نراکار اور ادویت واد (تصورِ وحدت) کو آگے بڑھانے والے ڈھیر سارے مت اور مکاتیب فکر سامنے آئے، گروگرنتھ صاحب، فرید بانی، کبیر پوتھی، خان خاناں، ملک محمد جائیسی، پدماوت، کیا کیا محنتیں نہیں کی گئیں، مسلم صوفیوں اور ہندو سنتوں نے ذرّے ذرّے میں خدا، وحدت الوجود کے تصور کے ذریعہ پورے ملک کو ایکتا کی زنجیر میں باندھ دیا۔ بھگتی وِچار دھارا میں سگن یا نرگن جس پر بھی دھیان لگایا گیا ہو، مگر بھگتی تحریک کے زوردار ہونے کا سبب یہی کنٹر کنٹر میں بھگوان کی

وِچاردھاراتھی۔ غیر منقسم ہندوستان میں پھیلی سیکڑوں خانقاہوں اور پورے بھارت ورش میں پریم اورشانتی کی گاتھا گانے والے اِن ہزاروں صوفیوں سنتوں نے مِل جُل کر مذہبی زندگی کے ٹھہراؤ کو توڑ کراُس میں بہاؤ،تحرک، نیاپن اورزندگی کی گرمی پیدا کردی، وہ اسلام اور ہندوازم کے دھاروں کو بالکل ملاتونہیں سکے،لیکن انھوں نے یہ احساس کرادیا کہ اندراندرکہیں نہ کہیں ان دونوں کے سوتے ضرور ملتے ہیں۔ان کی مہربانی سے بھارت میں قوتِ برداشت کا ایسا ماحول بن گیا جیسا اُس وقت دنیا میں کہیں نہیں تھا۔ یہ میں نہیں کہہ رہا ہوں، عابد حسین کی کتاب ''قومی تہذیب کا مسئلہ'' دیکھ لیجیے۔یہی باتیں ملیں گی۔اور اِس ماحول نے دانش وروں اورشعراء پر بھی خوب اثرڈالا۔میؔر نے کہا ؎

هم نہ کہتے تھے کہ مت دیر وحرم کی راہ چل
اب یہ دعویٰ حشر تک شیخ و برہمن میں رہا

سوؔدا نے بھی کچھ اسی طرح کی بات کہی:

ہندو ہیں بت پرست تو مسلماں خدا پرست
پوجوں میں اُس کو جو ہو آشنا پرست

''آپ لوگوں کی باتیں بالکل غلط ہیں۔اور عادل صاحب،آپ بھی کفریہ کلمات بکیں گے، آپ سے ایسی اُمید نہیں تھی۔''مولانا افتخارالحسن اُٹھتے ہوئے بہت ہی غصہ بھری آواز میں بولے۔

عادل خاموش رہے،مولانا کومزید غصہ دلانا مناسب نہیں تھا۔

''ڈاکٹر مرتجے ! اس سمئے مرہم چاہیے، آپریشن نہیں۔'' برجیش ورما نے صورت حال کو سنبھالنا چاہا۔

''ہر مذہب کا ایک code of conduct ہوتا ہے، بات اُسی سرِکل کے اندر رہ کر کرنی چاہیے''ظفرعالم جماعت اسلامی کے ہمدردوں میں تھے،اُن کے سوچنے کا اپنا انداز تھا۔

''ظفرعالم ! آپ باز نہیں آئیں گے۔''اسمٰعیل ہنس کر بولا۔''آپ صوفی ویژن کواسلام کے فقہی ویژن سے بالکل کاٹ کر دیکھ رہے ہیں جب کہ اسلام صرف قانون کا ''حکمی روپ'' نہیں ہے، وہ ہدایت بھی ہےاور بشارت بھی۔''

''بھائیوسنو!'' شبیر حسن نے دونوں ہاتھ اُٹھا کر سب کوشانت کرنے کی کوشش کی اور کہا:

''رات بہت ہوچکی اور بحث بھی بہت ہوچکی۔اب اِس سبھا کا اَنت ہونا چاہیے۔سیاست مذہب تصوف بہت ہوچکا،اب محفل کے اختتام پرایک شعر سن لیجیے۔''

''ضرور،ضرور۔''سب نے ہامی بھری۔

''شعر سنئے۔''شبیر حسن عادل نے کہا ؎

مجھ سے کہا جبریل جنوں نے، یہ بھی وحی الٰہی ہے
مذہب تو بس مذہبِ دل ہے، باقی سب گمراہی ہے

''واہ واہ...واہ واہ!''

اوراس واہ واہ کے بیچ مولانا افتخارالحسن کی آواز سنائی دی...''استغفراللہ!''

❖

سب لوگ جاچکے تھے،کام کرنے والالڑکا بھی اسمٰعیل کوکھانا کھلا کر اپنے گھر چلا گیا تھا۔دسمبر کی ٹھنڈی رات ماحول میں چپ کا مردنگ بجارہی تھی۔اسمٰعیل لیٹا ہوا تھا،مگر سویا نہیں تھا۔گزشتہ تین دنوں میں بھانت بھانت کے رنگوں نے پچکاری کی تھی۔ابھی کچھ دیر پہلے بھی خوب پچکاری چلی، کیسے کیسے رنگ بکھرے، پھر کالج کی پچکاری، ارون بھاٹیہ کی مُرلی، اجودھیا کا تانڈونرت.... سچ کیا ہے؟''

واجد علی شاہ کے زمانے میں ڈرامہ ہوا،انگریزوں کے زمانے میں رگڑا جھگڑا ہوا،۱۹۴۹ء میں منبر کے پاس بھگوان پرکٹ ہوگئے،راجیوگاندھی نے تالہ کھلوادیا،نرسمہاراؤ نے مسجد گروادی۔

سچ کہاں ہے؟

اسمٰعیل بالکل خالی الذہن تھا، کچھ اُس نے پڑھا، کچھ سنا، کچھ دیکھا، کچھ بھوگا،مگر وہ خود کسی رائے تک نہیں پہنچ پایا تھا۔

اِسی خالی پن کی کیفیت کے درمیان کئی سال پہلے، پٹنہ میں بھائیوں کے ساتھ کی ایک محفل اُسے یاد آ گئی۔ننہالی گاؤں میں ''میرغیاث چک'' کا ذکر چلا تھا۔جواَب صرف ''مُر گیا چک'' ہوگیا ہے۔۱۹۴۷ء کے بعد سب ناموراورزمین دار مسلمان وہاں سے ہٹ گئے تھے۔باقی بچ گیا تھا خرم

زماں اور اُس کا بیٹا اکرم زماں—

اکرم زماں نے کچھ پڑھا نہیں، کھیتوں کے سہارے جینا چاہا، گاؤں ہی میں رہا، اکرم زماں بگڑتے بگڑتے کرم جان ہو گیا۔ اُس کرم جان کی ایک زمین تھی جس پر گاؤں کے کچھ لوگوں نے ایک مورتی رکھ دی اور مشہور کر دیا کہ ''یہاں بھگوان پرکٹ ہوئے ہیں۔''

کرم جان ساری کوشش کر کے تھک گیا مگر اپنی وہ زمین واپس نہیں لے سکا۔

سنا کہ اس حادثے پر کسی نے ''کرم جلاّ کرم جان'' نام کا ایک افسانہ بھی لکھا۔

اسمٰعیل نے بہت دکھ اور کراہت کے ساتھ سوچا: کیا سچ یہی ہے کہ اب اِس ہندوستان میں صرف ''جس کی لاٹھی اُس کی بھینس'' کا قانون چلتا رہے گا؟

اور وہ... مقدس دستور... طاقتِ برداشت، برابری، سب کی رائے سب کی بات... کیا یہ سب بس محاورہ ہی بن کر رہ جائیں گے؟

عام آدمی اس گندہ صورتِ حال کو بدلنے کے لیے کچھ نہیں کرے گا؟

عام آدمی پر اس حادثے کا کچھ اثر ہوا بھی یا نہیں ہوا... یہ کہنا بہت مشکل تھا۔

تعلیم گاہوں میں، سڑکوں پر، بازاروں میں، گلیوں کوچوں میں جو خلقِ خدا چاروں طرف بکھری ہوئی ہے۔ وہ اس سلسلے میں کیا سوچتی ہے۔ اسمٰعیل کو اس کا صحیح طور پر اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا۔

کلّو رکشے والا روز کی طرح رکشہ کھینچ رہا تھا، حمدو میاں تالا کنجی والے کی ہتھوڑی ہمیشہ کی طرح کنجی پر کبھی تالے پر ضرب لگا رہی تھی، سنجے سائیکل والا کسی سائیکل میں ہوا بھر رہا تھا۔ محی الدین سے ملاقات ہوئی، وہ کہیں جا رہے تھے، پوچھا کہاں جا رہے ہیں؟ کہنے لگے: ذرا جلدی میں ہوں، بیٹی کی شادی کو بیس پچیس دن رہ گئے ہیں، کام بہت باقی ہے، گھر میں کام کرنے والی سکینہ بوا بہت خوش نظر آ رہی تھیں، خیریت پوچھی تو بولیں: ''ہاں بابو۔ اللہ کی مہربانی، ہم دادی بنے ہیں، پوتا ہوا ہے۔''

پن چکّی چلتی رہتی ہے۔

بابری مسجد کا معاملہ، یا شاہ بانو کا معاملہ، رُشدی کی کتاب ہو یا تسلیمہ کی بکواس... اِن میں سے کسی پر بھی عام آدمی خود سے حرکت میں نہیں آتا، وہ تو اپنی دنیا میں مگن رہتا ہے... اُس کی دنیائیں

بھی عجب ہیں، لطیف سبزی فروش کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ انکروچمنٹ ہٹانے کی کوشش میں پولیس نے اُس جگہ سے اُسے اُکھاڑ پھینکا جہاں وہ سبزی بیچا کرتا تھا۔ سلامت نٹوں (بنجاروں) کی جماعت کا سردار تھا اور وہ صرف اس کوشش میں سرگرداں تھا کہ اپنے قبیلے والوں کے لیے کہیں ڈیرا ڈنڈا جمانے کا بندوبست کر سکے۔ حنیف حجام کی دوکان جس زمین پر تھی اُس کے مالک تنویر صاحب نے وہ دوکان اور اُس سے لگی ساری زمینیں پرشوتم داس کے ہاتھ بیچ دی، اب حنیف میاں پریشان ہیں کہ اپنی دوکان کہاں لے جائیں۔

اِن لوگوں کے پاس بابری مسجد اور شاہ بانو کیس سے شاید زیادہ بڑے مسائل موجود تھے۔ اور وہ اپنے مسئلوں میں اُلجھے ہوئے تھے اور اُلجھے ہوئے ہیں۔ وہ تو جب کبھی کوئی شہاب الدین، کوئی مولانا اعظمی یا کوئی سرور جلیل اپنے کچھ کارندوں کے ذریعہ اُنہیں جمع کرتا، اُنہیں یاد دلاتا، اُنہیں جوش دلاتا تو اُنہیں یاد آتا، وہ کچھ موڈ میں آتے...''

مذہب، زبان، تہذیب... یہ سب پیٹ بھروں کے مشغلے ہیں کیا؟ اسمٰعیل کے جی میں عجب سی بات آئی۔

''اور یہ پیٹ بھرے بھی کون؟ نہ بہت امیر، نہ بہت غریب، متوسط طبقے والا عام آدمی۔''

دوسرا سانپ پھنکارا۔

جو بہت اعلیٰ طبقات کے لوگ ہیں اور جو بہت نچلی سطح کا عام آدمی ہے، دونوں اپنے تصورات اور عمل میں تقریباً یکساں ہیں۔ دونوں کے نزدیک مذہبی اقدار کا کوئی خاص معنیٰ نہیں بنتا، دونوں زبان کے بارے میں بے فکر ہیں، دونوں تہذیب کی قیود سے آزاد ہیں۔ ایک کلبوں میں بیٹھ کر شراب پیتا ہے، ایک سڑک کے کنارے ٹھرّا پیتا ہے اور ٹھمکا لگاتا ہے۔ ایک رَمی کھیلتا ہے دوسرا جوا کھیلتا ہے۔ دونوں جگہ بیویوں کے علاوہ یا شوہروں کے علاوہ بھی معاملات طے ہوتے رہتے ہیں اور کوئی آسمان نہیں ٹوٹتا۔

پن چکّی چلتی رہتی ہے۔

طرح طرح کے تاثرات سننے کو ملے:

کافروں کا ملک ہے، ہم کیا کر سکتے ہیں... قائد ملّت کا دو قومی نظریہ صحیح تھا... سیکولر طاقتوں

کے کمزور ہونے کا نتیجہ ہے...زوالِ روس کا ایک اور آفٹر ایفکٹ...سیاست دانوں کی گندہ سیاست کا نمونہ ہے...اللہ کی مرضی میں کس کا دخل ہے...ہر شہر میں ایک بابری مسجد بنی چاہیے...مسلمانوں کو اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنا ہی ہوگا...اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے پکڑنا چاہیے...

اور پھر اسمٰعیل نے یہ بھی دیکھا کہ تبلیغی جماعت کا گشت تیز ہوگیا...لاؤڈ اسپیکر پر میلاد کی آوازیں روز آنے لگیں...انجان شہید اور بے نام پیر کا عرس بھی زور وشور سے ہونے لگا...خوب مسجدیں بننے لگیں...نئے نئے مدرسے قائم ہونے لگے...بھجن کیرتن کی آوازیں تیز ہوگئیں...سنگھ گھرانے والے پربھات پھیریاں نکالنے لگے تھے...جین دھرم کے مادرزاد برہنہ سادھو سڑکوں پہ گھومنے لگے،اور خلقِ خدا کا ایک جتھا اُن کے تئیں اظہارِ عقیدت بھی کرنے لگا...کمیونسٹ مسلمان اجمیر جانے لگا اور ہندو کمیونسٹ پُشکر...راہی معصوم رضا کو یہ اندازہ ہی نہیں ہوسکا کہ وہ ''مہابھارت'' کا مکالمہ لکھ کر کس پنڈورا بکس کا منھ کھول رہے ہیں،صارفیت کی سفّاکی کی یہ انتہا کہ ''اور انسان مر گیا'' لکھنے والے رامانند ساگر نے 'مہابھارت' بناڈالی۔

شعر یاد آگیا۔

کہیں ٹھہرے نہیں ہم دیکھ آئے رہ گزر ساری
تماشہ ہی تماشہ تھا فسانہ ہی فسانہ تھا

یاد آیا ۔

یہ مقامِ عشق ہے مظہری گزر اِس مقام سے سرسری
جو گزر گئے سو گزر گئے جو ٹھہر گئے سو ٹھہر گئے

اسمٰعیل کی سمجھ میں نہیں آیا،جمیل صاحب نے کیا کیا ہوگا؟ یہ مقامِ عشق ہے مظہری؟ یا یہ مقامِ وہم ہے مظہری۔

فسانے اور وہم میں کیا فرق ہوتا ہے؟اسمٰعیل نے سر جھٹکا...اب میں کوئی ادب کا استاد تو نہیں۔

اسمٰعیل شعر کی ڈھلان سے کنارے ہوا تو ایک طوفان سامنے تھا،جس کا مقابلہ ایک کمزور عمارت نہ کرسکی اور گرگئی۔

میر صاحب کی بنوائی ہوئی عمارت میر صاحب کی پشتینی کرّ وفر کی نشانی تھی۔

لوگ بتاتے تھے کہ جب میر صاحب اس علاقے میں وارد ہوئے تو بالکل اجنبی تھے،مگر آہستہ آہستہ اجنبیت یگانگت میں بدلتی گئی اور پھر فلکِ پیر نے وہ دن بھی دیکھے جب گرد ونواح کے باشندے میر صاحب کی اولاد پر جان نچھاور کرتے۔اُن کے پوتوں پر پوتوں کا تو یہ حال تھا کہ وہ جس راستے سے گزرنے والے ہوتے،اُس راستے کے اِردگرد بسنے والے مکین اپنی پگڑیوں سے وہ راستہ صاف کیا کرتے۔

مگر تب جیسا کہ دنیا کا دستور ہے،یہ کچھ یک طرفہ عمل نہیں تھا،دستاویزات سے پتہ چلتا ہے کہ میؔر صاحب کو علاقے کا علاقہ لاخراج عطا ہوا تھا،یہ کہنا ذرا مشکل ہے کہ وہ معافی دار تھے یا تعلّقہ دار مگر جو بھی تھے،دھواں دھار تھے،اور جیسا کہ بڑپّن کے لچھن اور گن ہوتے ہیں،وہ سارے گن میر صاحب کی اولاد میں بھی پور پور سرایت کیے ہوئے تھے۔یعنی راوی کا عیش لکھنا،دن کا روز عید ہونا اور شب کا شبِ براٗت ہونا۔

دستاویزات میں محال وارث علی کے اصل زمینداروں میں ''قاضی عبدالحکیم یکے از زمینداران محال وارث علی'' کا نام آج بھی دست یاب ہے لیکن ''کاشتکارانِ اصلی'' میں بال گوبند پانڈے، پرمیشور پانڈے اور اشلوک رائے بٹیا کلا رائے اور شیو گوبند رائے بٹیا جگّو رائے ساکنان داراب پور کے ناموں پر بھی نگاہ بہ آسانی ٹھہر جاتی ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ نامی گرامی تعلّقہ داروں یا معافی داروں کی اصل قوتِ بازو تو وہی لوگ تھے جنھیں عام آدمی کہا جاتا ہے البتہ پردے کے پیچھے کا یہی ''عام آدمی'' سارا اسٹیج تیار کرتا ہے،بلکہ سچ تو یہ ہے کہ کھیل بھی یہی کھیلتا ہے۔

تو بھیانک آواز میں جو عمارت گری وہ میر صاحب کی ضرور تھی مگر جس کی دیکھ ریکھ پشتہا پشت سے اُن کے کارندوں اور کاشتکاروں کے سر تھی۔آخر میر صاحب یا اُن کی اولاد یہ کہاں دیکھنے جاتی کہ عمارت کتنی خستہ ہوچکی ہے اور اُس پر کس کس کا نام چڑھ چکا ہے،دور دور تک قریہ قریہ،گاؤں گاؤں،کہاں کہاں،کس کس علاقے میں کتنی زمین قابلِ کاشت ہے،کتنی غیر مزروعہ عام ہے،اور کتنی بنجر ہے۔میر صاحبان بھلا ایسی غیر دانش ورانہ مصروفیتوں میں کیسے گھر جاتے؟ اُن کو کیا کم مسائل درپیش تھے،مذہب،تاریخ،فلسفہ،سیاست،شاعری،عشق اور پھر ساتھ میں شوقِ تصنیف و تالیف،خاندانی روایتوں کے مطابق خود ''میر صاحب اوّل'' کے دستِ خاص سے تحریر کردہ ملفوظ

میں سادات کا احوال بالتفصیل لکھا گیا تھا۔اسی کتاب سے اخذ کردہ روایت سینہ بہ سینہ بعد کی نسلوں تک پہنچی کہ کربلا کے بعد فاطمہؑ کی اولاد کو کبھی چین نہیں ملا، اور یہ آفت زدگانِ روزگار پناہ کی تلاش میں کوفہ، شام اور یرموک سے سندھ اور مالا بار وغیرہ کے ساحلوں تک چلے آئے۔ بعضے ان میں سے دگر اقوامِ عرب کے مماثل تاجر پیشہ بھی ہوئے، مگر زیادہ تر نے لبادہ فقیری کا پہنا کہ اس میں خطرہ جان کے زیاں کا کم تھا۔ یہ سلسلہ ہمایوں اور اکبر تک چلا۔ اسی لیے قدیم تذکرے تاجروں اور فقیروں کی آمد کے ذکر سے مرصع ہیں اور یہ وہی زمانہ ہے جب میر صاحب کی اولادیں علاقے میں اپنی صلاحیت، ہر دل عزیزی، داد و دہش اور بے نیازی کے لئے مشہور ہوئیں۔ اس کے بعد یہ داستان ذرا عجب سا موڑ مڑتی ہے، داد و دہش فضول خرچی میں بدلی اور بے نیازی نے آرام طلبی کا چولا پہنا۔ دراصل میر صاحب کے مقامی اسامیوں اور اہل کاروں نے میر صاحبان کے منھ پر اور غائبانہ اُن کی داد و دہش اور بے نیازی کا اتنا چرچا کر رکھا تھا کہ اُنہیں داد و دہش میں چھپی فضول خرچی اور بے نیازی میں چھپی آرام طلبی کا چہرہ دکھائی ہی نہیں دیا۔ صورتِ حال اُس مقام تک پہنچ چکی تھی کہ اگر میر صاحب چاہتے بھی تو اُس حصار سے باہر نہ نکل پاتے۔ شاید یہ بھی ایک طرح کا چکر وِیوہ تھا جس میں میر وارث علی عرف میر دُشاسن گھر چکے تھے اور باہر نکلنے کی ہر راہ بند تھی۔

پھر چرخِ بدرفتار نے منظر بدل دیا۔ ہوائے وقت نے ایک اور ورق اُلٹا، دارا کو شکست ہوئی، پھر بہادر شاہ ظفر کو ہندوستان چھوڑنا پڑا اور میر وارث علی کے ورثا نے اچانک محسوس کیا کہ تجارت اور فقیری کا ذکر تو گالی یا مذاق بن گیا۔ اس تبدیلی کا ایک نمونہ ''آئنہ اودھ'' میں دستیاب ہے جہاں میر وارث علی اور قاضی عبدالحکیم کے جدّ اعلیٰ میر قطب الدین مدنی کو بحیثیت مجاہد روشناس کرایا گیا ہے۔

دشمنوں کے کان بہرے، اب میر صاحب کے اجداد کی صوفیت ایک کھوٹا سکّہ ہے اور مجاہدین کی خدمات آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل، صوفیوں کا ذکر اب صرف زیبِ داستاں کے طور پر ہوتا ہے یا اقتدار کو خوش کرنے کے کام آتا ہے۔ میر صاحب کے ورثا نے بھی دارا کی شکست کے بعد اپنا انداز بدل دیا۔ دل کی بات دل ہی میں رہی، یا گزرنے والوں میں سے بعضے ناعاقبت اندیشوں نے چپکے سے اپنے پسماندگان کے کان میں یہ زہر گھول دیا—ورنہ مرقومے اور مخطوطے تو

اَب بھی چیخ چیخ کر یہی کہتے ہیں کہ ع

بحرِ ظلمات میں دوڑا دیے گھوڑے ہم نے!

اور جب گھوڑا دوڑتا ہے تو آپ جانتے ہی ہیں، کیا ہوتا ہے؟ نہیں جانتے؟ آدمی ڈر کے گھروں میں چھپ جاتا ہے... پتہ نہیں گھوڑے دوڑے یا نہیں، گھوڑوں کے دوڑنے کا تذکرہ بہت ہوا، اس تذکرے نے راستوں کے اِردگرد بسنے والے مکینوں کو گھروں کے اندر محدود و مقید کر دیا اور میر صاحب کے پڑپوتے گھوڑے دوڑاتے رہے۔

گھوڑے ایک ایسی سڑک پر دوڑتے رہے... جہاں کوئی نہ تھا!

شہر دلّی میں ہے سب پاس نشانی اُس کی، دروغ برگردنِ راوی، سنتے ہیں کہ دلّی کے کھنڈرات پر لکھنؤ کی تعمیر ہوئی... ممّد شاہ رنگیلے...

تجارت گالی اور فقیری مذاق، بقول اربابِ تواریخ وسیر: صالح قیادت سامنے آئی اور پھر گھوڑے دوڑے...

میں کیا عرض کروں؟ اب تو جو بھی گنتی گنتا ہے تو غازی میاں کے جھنڈے سے شروع کرتا ہے اور صالح قیادت والے عَلم تک دوڑتا چلا آتا ہے... اُس کے بعد تو محرم کا عَلم اور بارہ وفات کا عَلم... عَلم ہی عَلم ہے۔

پتہ نہیں عین سے ہے یا الف سے!

قصہ مختصر یہ کہ میر صاحب کی بنوائی عمارت گر گئی۔ کیوں گری، یہ ایک الگ داستان ہے اور اُس کے بیان میں مختلف راویوں کو مختلف گمان ہے۔ اب وہ جو میر صاحب کا ایک وارث عزیزی فلاں ابن فلاں نقلِ مکانی کر کے دور دیس، یورپ کے کسی خطّے میں جا بسا، وہ حسن اتفاق یا سوءِ اتفاق سے عرس کے موقع پر کچھوچھہ شریف آیا، پھر فیض آباد بھی آیا، عمارت کی ویرانی کا ذکر چلا اور یہ بات بھی زیرِ تذکرہ آئی کہ ایسی شاندار عمارت میں برسہا برس سے نہ چراغ جل سکا نہ جھاڑو پڑ سکی، بلکہ موقع غنیمت جان کر مفتریوں نے کچھ اشیاء ''مثلِ نجسِ طبعی'' رکھ دیں!

تِس پر وہ عزیز شکایات کا ایک لمبا چوڑا دفتر کھول بیٹھا، خلاصہ جس کا یہ ہے کہ محال وارث علی کے کاشت کارانِ اصلی کی اولاد در اولاد بہت بدقماش ہو چکی اور دن رات بغی و فساد پر آمادہ رہتی۔

مزید برآں یہ کہ خطرہ جان کا بڑھتا گیا، علاقہ معاش کا محدود ہوتا گیا، اور وہاں رہ جانے والی، مقامی اولاد میر صاحب کی ان کاشت کاروں کی اولاد سے میل جول اور تعلق برابر کا رکھنے کے سبب، سبق تہذیب کا بھلانے لگی، زبان لکھنوی ناپید ہوئی اور اثر ورسوخ دیہی لہجے کا سب پر پڑنے لگا۔ وفا سراب بنی اور خلق جفا شعار ثابت ہوئی۔ اپنوں یگانوں نے آنکھیں پھیر لیں اور بیگانے تو بیگانے ہی ٹھہرے ـــ پس نقلِ مکانی کے علاوہ چارہ کیا تھا؟

وہ عزیز بولتا رہا اور سب عزیز قصباتِ فیض آباد و اودھ کے سکتے میں رہے کہ مالکانِ اصلی علاقہ پرسی ٹپی، داراب پور اور بچھوتر اب اسامی اور اہل کار تھے، کاشتکارانِ اصلی کی اولاد در اولاد کے!

اور اِدھر عالم اس عزیز ولایت پذیر کا یہ تھا کہ قوالوں کو بخشش دینے کے لیے جب جیب میں ہاتھ ڈالتا تو پچاس سے کم کا نوٹ نہیں نکلتا۔

میں بھی حاضر تھا وہاں اور حاضر ہونے کے ناطے سنتا بھی تھا اور سوچتا بھی تھا۔ پس جب حاضرینِ محفل امتدادِ زمانہ کو یاد کر کے آب دیدہ ہوئے تو مجھے وہ ہم زاد یاد آیا جس نے برس ہا برس پہلے کہا تھا:

''ایک بڑی زوردار اور بھیانک آندھی میر صاحب کے گھر کی طرف بڑھ رہی تھی مگر میر صاحب کو خبر نہیں ہے۔ اور خبر کیسے ہو کہ وہ کمرے میں بند ہیں اور کھڑکیوں کے پردے گرے ہوئے ہیں... مگر میں دیکھ رہا ہوں، آسمان کا بھیانک ڈراؤنا رنگ، فضا میں اُڑتے تباہی کے اجزات... اور فضا پہ چھائے بھیانک دھویں کی دھند میں دوڑتا ہوا، ایک غضب ناک ناقہ... اور میرے عزیز ابوالفصاحت میر دُرِّ شہوار علی خاں بہادر جو لمحہ گزراں کے اسیر ہیں... لمحہ آئندہ سے بے خبر تاریخ فیرز شاہی، سیر المتاخرین، فرشتہ اور آئینہ اودھ سینے سے لگائے... اور کڑا مانک پور سے آمڈاری تک صفایا ہو چکا... (باقی) رہے نام اللہ کا! (ربّا ربّا۔ ماخذ: گھنے جنگلوں میں صفحہ 870-886)

مگر اُس غریب کی بات کوئی کیوں سنتا؟ سب پر تو غازی میاں کا جھنڈا سوار تھا۔ چھوٹے سے غازی میاں بڑی سی دُم... عمارت کی ملکیت پر جھگڑا شروع ہوا تو پھر جھگڑا یاد رہ گیا اور عمارت بھلا دی گئی اور اس طرح بھلائی گئی کہ چند ماہ پہلے آئے بھیانک طوفان میں وہ عمارت گر گئی۔

اب گھر گھر ماتم ہے۔ انیس سو ہیں زخم تنِ چاک چاک پر۔ طوفان میں گھری، جڑ سے اکھڑی اس عمارت کو دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ اس زناٹے دار آندھی میں بھی ایک آواز بگولوں کی طرح چکراتی پھر رہی تھی...

''اے مددگار و معین الضعفاء ادرکنی/ اے خبر گیر گروہ غربا ادرکنی/ اے سلیماں کہیں پامال نہ ہو مورِ ضعیف...''

مگر وہ ایک اکیلی ضعیف عمارت ویسے بھیانک طوفان میں کیا کر پاتی؟

لکھتا ہے یہ راوی کہ بپا ہو گیا محشر/ بارہ ستم ایجاد بڑھے کھینچ کے خنجر/ اِک سیّدہ نکلی درِ خیمہ سے کھلے سر/ برقع تھا نہ مقنع تھا موزے تھے نہ چادر...''

کیا آگ لگ گئی تھی جہانِ خراب کو!

اصل میں قصہ یہ ہے کہ مسجد قوت الاسلام ہو یا مٹیا برج کا امام باڑہ... پتہ نہیں کیسے اور کیوں اِن جگہوں کے سائے میں عام آدمی پناہ پکڑ لیتا ہے۔ اِس عمارت کے سہارے بھی بہت سے لوگ ٹکے ہوئے تھے، سو عمارت گری تو وہ بھی ڈھ گئے۔

موجودہ صورتِ حال یہ ہے کہ عمارت گری پڑی ہے، کچھ لوگ تو دب کر مر ہی گئے، باقی گرتے ہوئے ملبے سے چوٹ کھا کر زخمی ہوئے، اور بہت سارے عمارت کے گرنے سے دُکھی ہوئے، کچھ زخمی ابھی تک کراہ رہے ہیں، بہتوں کا کوئی ہاتھ عمارت کے نیچے دبا ہے، کچھ کا پیر پھنسا ہوا ہے، اور کچھ کی املاک تباہ ہو گئی ہیں۔

مگر صورتِ حال جیسی تھی ویسی ہی ہے کیوں مالکانِ اصلی اور کاشت کارانِ اصلی دونوں کو کسی نے سمجھا دیا تھا کہ عمارت کے نیچے خزانہ دفن ہے۔ اس لیے دونوں ہی اس عمارت کی ملکیت کے دعوے دار ہیں اور وہ منہدم عمارت، عمارت کے درجے سے آگے بڑھ کر ماں بن گئی ہے۔ حیات اللہ انصاری کی ''آخری کوشش'' والی ماں!

کرم جان کی مجبوری اور گری عمارت کا تجارتی پہلو
بابری مسجد کے دو بھیانک آفٹر ایفکٹس!

• • •

10

اُس دن گھر میں داخل ہوتے ہوئے اُس نے سوچا تھا ''عجب بدتمیز لوگ ہیں۔''
خواہش تو ہوئی کہ وہ الٹے پیروں لوٹے اور اُن سبھی کو وہاں سے ہٹا کر ہی گھر آئے مگر اسمٰعیل نے محسوس کیا کہ وہ بہت تھک گیا ہے۔ اصل کلاس لینے والے صرف تین۔ بنسی دھر، کرپاشنکر اور وہ خود باقی جو تین لکچررس کالج کنسٹی چیونٹ ہونے کے وقت بحال کیے گئے وہ بھلا کلاس کیوں لیتے؟ ایک سکریٹری کا داماد ایک ڈی.ایم. کا بھانجا اور ایک نپٹ جاہل مگر ۴۰ ہزار نقد گن کر لکچر شپ حاصل کرنے والا لکچرر... گھر لوٹتے لوٹتے بہت تھکاوٹ محسوس ہونے لگتی تھی۔

اُس نے دروازہ بھڑکاتے ہوئے ایک مرتبہ پھر سامنے نگاہ کی۔

وہ سب مصروف تھے... بیچ بیچ میں زور زور سے بحث یا قہقہہ۔

کپڑا بدلتے ہوئے منھ ہاتھ دھوتے ہوئے کھانا کھاتے ہوئے... بار بار اُس کا خیال اُن سبھوں کی طرف مڑتا اور تبھی قہقہے تیر کی طرح دروازے کے شگافوں سے اندر داخل ہو جاتے۔ پھر پتہ نہیں کس وقت وہ سب چلے گئے مگر اُس رات وہ نیند آنے تک پریشان رہا، نیند آنے تک وہ جانے کیا کیا سوچتا رہا... اور بیچ بیچ میں بحث یا قہقہہ، بہت دیر تک اُس کو نیند نہیں آسکی۔ دراصل وہ ایسی باتوں کا عادی نہیں تھا۔

مگر دوسرے دن جیسے ہی اپنے مکان کی طرف مڑا، اُس کے پورے تن بدن میں آگ لگ گئی... اُس کے گھر کے ٹھیک سامنے کلکٹریٹ کے چپراسی عیدن خاں کے مکان کے باہری اوٹے پر آلتی پالتی مار کر...

اسمٰعیل نے اُس دن پہلی مرتبہ عیدن کے اوٹے پر پوری نگاہ ڈالی۔ اُسے احساس ہوا کہ اُس نے تو بہت زیادہ جگہ انکروچ کر رکھی ہے۔ چار پانچ آدمی اطمینان سے بیٹھ سکتے تھے۔

اُس کا جی چاہا کہ وہ دوڑتا ہوا اُن تک جائے اور اُن کی گردن... آخر ان سبھوں نے سمجھا کیا

ہے؟ کل تو وہ یہ سوچ کر چپ ہو رہا کہ یہ تو ہوا کی لہریں ہیں، آج یہاں کل وہاں، گھر نہ گھاٹ نہ انگنا رہ ...کل کہیں اور جا بیٹھیں گے... یہ تو اُس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ دوسرے دن بھی...

''نہیں! آج ان کو ہٹانا ہی ہوگا'' وہ تیزی سے آگے بڑھا پھر اچانک یوں رُک گیا جیسے کرنٹ لگ گیا ہو۔

ارے یہ بھی؟

ممدو بھائی کو کون نہیں جانتا۔ کئی عدد ڈکیتیاں... بلکہ ایک قتل کی افواہ بھی... مگر کیا مجال کہ پولیس ہاتھ لگا سکے... ہر تھانہ انچارج سے یارانہ... جب سیّاں بھئے کوتوال تو ڈر کاہے کا۔

کیچڑ میں ڈھیلا ڈالو گے تو کیچڑ اُڑ کر تم ہی پر آن پڑے گی... پرانا محاورہ یاد آ گیا... مگر یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی... کوئی بھی ہوا گر چھوٹ دے دی گئی تو پھر یہ انگلی پکڑ کے پہنچے تک جا پہنچیں گے... مگر یہ میرے اوٹے پر تو نہیں ہے، سارے محلّے کا ٹھیکہ میں نے لیا ہے؟ مگر اسی محلّے میں تو میرے بال بچے بھی ہیں۔

ایک خیال دوسرے خیال کو کاٹتا رہا اور اسمٰعیل پیچ و تاب اور اضطراب کی لہروں میں ڈوبتا اُبھرتا گھر پہنچا تو بیوی دیکھتے ہی کہنے لگی: ''کیا بات ہے؟ چہرہ ایسا لال بھبھوکا کیوں ہو رہا ہے؟ طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

ایسی باتوں کا کیا جواب ہو سکتا ہے، وہ ٹال گیا مگر اندر اندر جو بھونچال مچا ہوا تھا وہ کسی طور کم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا... ایک عجیب سی بے چینی، جی چاہتا کہ وہ دوڑتا ہوا جائے اور ان سبھوں کی جی بھر کے مرمّت کرے... کم بختوں کی اتنی ہمت کہ میرے ہی دروازے کے سامنے... مگر وہ، کلکٹریٹ کا چپراسی... میں نے تو کبھی اُس سے بات بھی نہیں کی... وہ اس قابل کہاں ہے؟ مگر وہ اپنے کو خود ڈی. ایم. سے کم کہاں سمجھتا ہے؟ تبھی کانٹ چھانٹ کا سلسلہ شروع ہو جاتا... اُس رات گئی رات تک وہ بے چین رہا۔

اور تیسرے دن اسمٰعیل کی کیفیت اُس شخص جیسی ہو رہی تھی جسے کوئی ستون سے باندھ کر بلا وجہ ماں بہن کی گالی دے۔

وہ چاہنے کے باوجود صرف اِس لیے اُن کو منع نہیں کر سکتا کہ اُن میں ممدو بھائی بھی ہے۔ تُف

ہے ایسی زندگی پر، ایسی پروفیسری کس کام کی، اس سے بہتر تھا کہ تھانے کا سپاہی ہوتا، آخر ممدو بھائی بھی تو آدمی ہی ہے؟ مگر اُس نے جس کا قتل کیا وہ بھی تو آدمی ہی تھا، ممکن ہے اس کی طرح طاقت ور نہ ہو... تو پھر کیا ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہا جائے؟ اِس کے تدارک کی کوئی نہ کوئی صورت تو نکالنی ہی ہوگی!

وہ گھر جانے کے بجائے پڑوسی کے گھر کی طرف مڑ گیا... ''آپ لوگ تین دن سے یہ سب کچھ دیکھ رہے ہیں اور چپ ہیں؟''

''کیا ہوا بھائی؟ کیا بات ہے؟ بہت غصّہ میں دکھائی دے رہے ہیں۔'' انڈے مرغی کی دوکان والا پڑوسی ہنس کر پوچھنے لگا۔

''ارے! آپ پوچھتے ہیں کیا ہوا؟ گلی میں باضابطہ جوا ہو رہا ہے اور آپ کو خبر ہی نہیں ہے۔''

''گلی محلّے میں بس ہم آپ ہی بچے ہیں؟ کوئی ہمارے گھر میں گھس رہا ہے؟''

اب اس کے بعد وہ اس پڑوسی سے کیا گفتگو کرتا؟ وہ دوسرے پڑوسی کی طرف مڑ گیا۔

''بھائی! سارے کا سارا ماحول خراب ہو رہا ہے۔ آپ لوگ کچھ کرتے کیوں نہیں؟

ارے جانے دیجیے۔ اپنی قوم کے ہیں۔ کوئی کافر تھوڑے ہی ہیں؟

اُسے لگا، گندگی حلق تک بھر گئی۔ وہ سرپٹ بھاگا اور محلّے کے موڑ پر رہنے والے کانگریسی سوشل ورکر علی حسن کے یہاں جا پہنچا۔ علی حسن نے بہت لپک کر اُس کا خیر مقدم کیا: ''صاحب! میں تو بہت پہلے سے چیخ رہا ہوں، ایک محلّہ سدھار کمیٹی ہونی چاہیے... میں نے مہندر بابو... وہی سونا چاندی والے، اُن سے بات بھی کی تھی، وہ فنانس کرنے کو تیار تھے، مگر یہاں تو سماج کی خدمت کا کسی میں کوئی جذبہ ہی نہیں ہے۔ اچھا ہوا، کم از کم آپ کو تو خیال آیا۔ میں اپنے ضلع ادھیکچھ شرما جی اور ٹاؤن ادھیکچھ اقبال احمد سے بات کرتا ہوں۔ اُن لوگوں کی پہلے سے خواہش ہے کہ میں اِس کمیٹی کا صدر بن جاؤں مگر یہ ایک الگ سی بات ہے، البتہ آپ کو سکریٹری بنانے کا سجھاؤ ضرور رکھوں گا۔''

اُسے لگا، وہ کچھ دیر اور وہاں ٹھہرے گا تو اُس کا دم نکل جائے گا۔

اُسے یاد آیا کہ سابق وارڈ کمشنر مہیش پرشاد بھی تو بغل والے محلّے میں ہی رہتے ہیں۔ اُن سے تو اُس کا یارانہ رہا تھا۔

مگر مہیش پرشاد تو سنتے ہی غصہ ہوگئے، بگڑنے لگے: ''اب مجھ سے کیا کہتے ہیں؟ آپ ہی لوگوں نے شری چورسیا کو میونسپل الیکشن میں کامیاب کیا ہے۔ آج اگر آپ کی کمیونٹی نے مجھے نہ ہرایا ہوتا تو میں اِن بدمعاشوں کو بتا دیتا۔''

مہیش پرشاد کی ڈانٹ ڈپٹ پر اُسے شری چورسیا بھی یاد آئے، مگر وہ تو وارڈ کمشنر ہوئے، پھر وائس چیئرمین ہوئے، پھر کسی بورڈ کے چیئرمین ہوکر راجدھانی چلے گئے۔

اُس نے گھر کی طرف مڑتے ہوئے دیکھا، آج تعداد میں بھی اضافہ ہوگیا تھا اور آواز بھی بلند تھی۔

''کون صحیح ہے؟'' سوال کا جھک جھور اندھیرا جھک آیا تھا اور جواب کا چاند کہیں نہیں تھا۔

ساری رات اسمٰعیل اندھیروں سے جھوجھتا رہا، رات بھر وہ چونک چونک کر اُٹھتا رہا... بُرے اور ڈراؤنے خواب آخر اُسی کے دَر پے کیوں ہیں؟ اور کسی کے لیے یہ کوئی مسئلہ کیوں نہیں؟

اُس نے اپنے آپ کو سمجھانا چاہا... ''یہ ایک اتفاقی واقعہ ہے، اور بہت چھوٹی سی بات ہے۔''

اس بات پہ اک عجب سے سوال نے سر اُٹھایا... ''جیسے چھ سات فٹ لمبے چوڑے آدمی کی کانی انگلی میں پاخانہ لگ جائے؟'' دھت تری... وہ ناچ ناچ گیا... وہ چکراتا رہا، سر جھٹکتا رہا... اور اژدہا بار بار پھنکارتا رہا... ساری رات کچھ عجب سی بے چینی اُس کے اندر سر پٹختی رہی... ساری رات وہ جھوجھتا رہا۔

اگلے دن وہ ٹاؤن پریسیڈینٹ اقبال احمد سے خود ملا تو اُنھوں نے سمجھایا: ''دیکھئے! اوّل تو یہ کہ ہماری کچھ مجبوریاں ہیں، ہر پارٹی والے اس قسم کے کچھ لوگوں کو اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ مدو بھائی ہمیشہ ہمارے کام آتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ اصل ذمہ داری تو تھانہ انچارج کی ہے، اُس سے رابطہ قائم کیجیے۔

تھانہ انچارج ساری بات سننے پر پہلے تو مدد کے لیے تیار ہوگیا، مگر جگہ کے بارے میں پوچھنے پر جب اسمٰعیل نے بتایا کہ ''سب عیدن خاں کے دروازے کے اوٹے پر جمع ہیں۔'' تو تھانہ انچارج بیٹھ گیا۔ ''آپ بھی عجب آدمی ہیں، پروفیسر صاحب! کسی کے گھر پر کچھ لوگ جمع ہیں تو ہم کیا کر سکتے ہیں؟ عیدن خاں کو کہیے۔ ہاں اگر وہ آپ کو کچھ نکسان پہنچاویں تو ہم سے کہیے گا۔''

تھک ہار کر محلّے کی طرف مڑا تو اچانک مدو بھائی سامنے آگیا: ''صاحب! محلّے میں رہنا ہے تو ڈھنگ سے رہیے لفڑا مت پھیلائیے۔''

''پڑوسی؟ مہیش پرشاد؟ اقبال احمد؟ علی حسن؟ تھانہ انچارج؟ اور کسے وہ یاد کرتا۔ بات تو اُنہی لوگوں سے ہوئی تھی۔ جو کچھ میں چاہتا ہوں، وہ اتنا غیر ضروری اور بے معنی ہے؟ مدو بھائی مجھ سے زیادہ ضروری ہے؟

مور نے ناچتے ناچتے اپنا پیر دیکھ لیا۔ اُسے لگا وہ تو بالکل ننگا ہے۔ پورے بدن میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔ اُس نے محسوس کیا، اُس کے پیر تھرتھرا رہے ہیں۔ اُس نے سوچا مدو بھائی اُسے دھمکی دے رہا ہے۔ مدو بھائی، پڑوسی، علی حسن، اقبال احمد سب کی ضرورت ہے، اسمٰعیل بھی کسی کی ضرورت ہے؟

''حد سے آگے بڑھئے گا تو کھراب ہو جائے گا۔''

مدو بھائی اُسے ڈانٹ رہا تھا، سامنے اُس کے آدمی زور زور سے قہقہہ لگا رہے تھے، نہلے پر دہلا مارا جا رہا تھا۔ گلاس میں ٹھرّا یا کوئی شراب اُنڈیلی جا رہی تھی اور اُس کے دروازے پر۔

اسمٰعیل نے دیکھا کہ دروازے پر اُس کی بیوی بچے انتہائی خوف زدہ انداز میں اُسے تک رہے تھے۔

خوف کی ایک تیز لہر، بھنور روپ لہر کے جال میں، وہ اور اُس کا پورا کنبہ لپٹتا چلا جا رہا تھا۔

اُس نے محسوس کیا جیسے سیلاب، یا سمندری طوفان، یا جنگل کی آگ اُس کے اور پورے کنبے کے اِرد گرد گھیرا ڈال رہی ہے... اسمٰعیل نے ایک مرتبہ پھر سامنے دیکھا... گھر کے دروازے پر اُس کا پورا کنبہ... کسی شریر بچے کے ہاتھ میں سہمی ہوئی گوریّا.. وہ تنہا تھا... ایک پر شور سمندر میں گھرا، ہاتھ پیر مارتا ہوا۔ اُس نے اُبھ چبھ کرتے ہوئے سوچا... ''بچانے والا کوئی نہیں ہے!''

اسمٰعیل گھر کے دروازے کے قریب پہنچنے والا تھا کہ مدو کی آواز سنائی دی:

''زیادہ لفڑا پھیلاؤ گے تو وہ لونڈیا تمھاری ہے نا؟''

مدو نے نائلہ کی طرف اشارہ کرکے زور سے کہا، اور اُسے لگا کہ کسی نے اُس پر کراسن تیل چھڑک کر جلتی تیلی اُس کے جسم پر پھینک دی... سیکنڈ کے سوویں حصے میں ایک بونڈر سا اُٹھا، بہتیرے

عکس ایک دوسرے میں گڈ مڈ ہوئے...ایک زوردار بے شکل جھماکا...بے آواز دھماکا...اُسے صرف اتنا یاد تھا کہ ممدو بھائی اُسے دھمکی دے رہا ہے...وہ لونڈیا تمھاری ہے نا؟''

پڑوسی، مہیش پرشاد، علی حسن، اقبال احمد، تھانہ انچارج...علی حسن، تھانہ انچارج، پڑوسی، مہیش پرشاد، اقبال احمد...تھانہ انچارج، مہیش پرشاد، پڑوسی، اقبال احمد، علی حسن....ژائیں ژائیں ژائیں چرخی کی طرح عکس ایک دوسرے سے گڈ مڈ ہوتے رہے اور لال بھبھوکا سورج اُس کے چہرے پر جھماکا کرتا رہا اور چیختا رہا...پہچانو تو جانیں..پہچانو تو جانیں...اور آواز آتی رہی...وہ لونڈیا تمھاری ہے نا؟

اُس کو احساس ہوا کہ وہ جنگل کی آگ میں پوری طرح گھر گیا ہے اور دھڑ دھڑ جل رہا ہے۔

یک بارگی وہ سب کچھ بھول گیا...پلٹا...اور اپنی جگہ سے بالکل گیند کی طرح اُچھل کر ممدو پر جا پڑا...'حرامزادے!''

ممدو بھائی ذہنی طور پر اس کے لیے تیار نہیں تھا۔شاید اُس کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ کوئی عام آدمی اُس کے ساتھ اس طرح ٹکرا بھی سکتا ہے۔وہ تو روزمرّہ کے معمول کی طرح کھڑا تھا اور اسمٰعیل کا مذاق اُڑاتا ہوا، ہنستا ہوا اُس کو بس عادتاً دھمکا رہا تھا...سو جب اسمٰعیل اُچھل کر اُس پر جا پڑا تو وہ بالکل بھوچکا رہ گیا اور ان چلّے میں اسمٰعیل کے بدن کے بوجھ تلے دب کر زمین پر آ گرا۔اُس وقت اسمٰعیل بالکل اس پوزیشن میں تھا کہ اگر وہ چاہتا تو ممدو بھائی کو قتل بھی کر سکتا تھا۔ مگر خود اسمٰعیل کسی منصوبے کے تحت اُس پر اُچھلا نہیں تھا...وہ تو اندر اندر غصّے کی ہوا اتنی بھر گئی کہ وہ غبارہ ہو گیا۔

اور پھر اِس سے پہلے کہ وہ ممدو بھائی کو ایک مکّا مارتا یا ایک طمانچہ بھی لگا دیتا...دروازے پر کھڑی اُس کی بیوی شہوار چیختی ہوئی اُس کی طرف دوڑی..."چھوڑ دیجیے...چھوڑ دیجیے...کیا کر رہے ہیں آپ..."اسمٰعیل اور اُس بیوی کی چیخ سن کر عیدن خاں بھی گھر کے اندر سے باہر آ گیا، اور اُس نے جو ممدو بھائی کو زمین پر پڑا اور اسمٰعیل کو اُسے چھاپے دیکھا تو بالکل ہذیانی انداز میں چیخنے لگا:...ممدو بھائی...ممدو بھائی...کیا ہوا؟ ارے ماسٹر... پاگل ہو گیا ہے رے؟ پیچھے ہٹ...چھوڑ ممدو بھائی کو... ارے پاگل ماسٹر... پیچھے ہٹ...‘‘

اسمٰعیل کے اُچھلنے، اس کی بیوی کے چیخنے اور چیخ سن کر عیدن خاں کے گھر سے باہر آنے کے وقفے کے آس پاس ممدو بھائی کے باقی ساتھی بھی اسمٰعیل کے قریب پہنچ گئے اور اسمٰعیل کو مرے ہوئے چوہے یا کتّے کی طرح ٹانگ سے پکڑ کر کنارے پھینک دیا۔

ممدو بھائی کپڑے جھاڑتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا، اُس کے ساتھی اسمٰعیل کی طرف غرّاتے ہوئے آگے بڑھے، عیدن خاں ممدو بھائی کا کپڑا جھاڑ رہا تھا اور تقریباً گھگھیا گھگھیا کر کہہ رہا تھا..."ممدو بھائی آپ ٹھیک ہیں نا...ممدو بھائی آپ کو کچھ ہوا تو نہیں...ممدو بھائی، وہ سالا ماسٹر شروع سے تھوڑا پاگل ہے...آپ ٹھیک ہیں نا ممدو بھائی؟''

اسمٰعیل اب پوری طرح ممدو بھائی کے آدمیوں کے گھیرے میں تھا، اور اُن کا حملہ بس اَب شروع ہونے والا ہی تھا کہ اچانک شاعر شبیر حسن عادل، بنسی دھر اور کالج میں پچھلے دروازے داخل ہونے والا کل کا سورما اور آج کا لکچرار ارون بھاٹیہ تینوں بیک وقت وہاں پر نمودار ہو گئے۔

یہ بس اتفاق تھا اور کچھ نہیں۔ارون بھاٹیہ کو یونیورسٹی میں کوئی پرفورما جمع کرنا تھا۔وہ پرفورما مانگنے بنسی دھر کے پاس گیا، بنسی دھر کے پاس وہ پرفورما نہیں تھا اور اُسے یاد تھا کہ وہ پرفورما اسمٰعیل کے پاس ہے، بھاٹیہ کی بات وہ نہیں اُٹھا سکا اور بھاٹیہ کے ساتھ وہ اسمٰعیل کے گھر کی طرف چل پڑا، راستے میں شبیر حسن عادل سے ملاقات ہو گئی۔شبیر حسن کا کوئی پروگرام اِس طرف آنے کا نہیں تھا مگر ارون بھاٹیہ کی سنگت کے اثر کو کم کرنے کے لیے اُس نے شبیر حسن کو زبردستی اپنے ساتھ لے لیا۔یہ بس اتفاق ہی تھا اور کچھ نہیں!

"ارے...کیا بات ہے؟ کچھ گڑبڑ ہے؟'' قریب پہنچنے سے پہلے ہی ارون بھاٹیہ کی چھٹی حس جاگ اُٹھی...اُس نے ایک ہی نظر میں اسمٰعیل کے دروازے پر کھڑی اُس کی بیوی بچوں کو...انتہائی حد تک پریشان اُس کی بیوی کو...اور ممدو بھائی کے آدمیوں میں گھرے اسمٰعیل کو دیکھ لیا، اور وہیں سے للکارا..."کیا ہو رہا ہے؟''

پھر شبیر حسن اور بنسی دھر کے کچھ سمجھنے، پوچھنے اور کہنے سے پہلے اُس نے اسمٰعیل کی طرف دوڑ لگا دی...قریب پہنچ کر اُچھلا اور اسمٰعیل کے پاس پہنچ گیا... پہلے والا بھاٹیہ اچانک انگڑائی لے کر زندہ ہو گیا تھا۔

''سالو پیچھے ہٹو...نہیں تو ایک بھی زندہ نہیں بچے گا۔'' اسمٰعیل کے پاس پہنچ کر بھاٹیہ للکارا۔

ممدو بھائی کے لیے ایک مزید نئی اور غیر متوقع صورتِ حال تھی۔ ممدو بھائی اور اُس کے سبھی آدمی بھاٹیہ کو اچھی طرح پہچانتے تھے۔ سب کو احساس ہو گیا کہ اسمٰعیل بالکل تر نوالہ نہیں ہے۔

اتنی دیر میں اسمٰعیل کی بیوی نے شبیر حسن عادل اور بنسی دھر کو ساری بات بتا دی۔ شبیر حسن نے آگے بڑھ کر عیدن خاں کو سمجھانا شروع کیا اور بنسی دھر ممدو بھائی کو چمکارنے لگا۔

خدا خدا کر کے اُس وقت کسی طرح معاملہ دب گیا—

پھر سب لوگ عیدن خاں کے ڈرائنگ روم میں جمع ہوئے۔ اسمٰعیل پہلی مرتبہ عیدن خاں کے ڈرائنگ روم میں گیا اور حیرت میں پڑ گیا۔ ایک چپراسی کا ڈرائنگ روم ایک پروفیسر کے ڈرائنگ روم سے کہیں اچھا تھا۔

عیدن خاں کا کہنا تھا کہ کلکٹریٹ میں کچھ لوگوں کا کام کرانے کے لیے اس نے پیسہ لیا اور وہ پیسہ صاحب تک پہنچا بھی دیا مگر اتفاق ایسا کہ کام نہ ہو سکا۔ وہ پیسہ واپس مانگ رہے تھے۔ عیدن خاں اپنے پاس سے پیسہ دینے کو تیار نہیں تھا، تس پر وہ لوگ بدتمیزی پر اُتر آئے۔ عیدن خاں کے جاسوسوں نے اُسے بتایا تھا کہ دو چار دنوں میں اُس کے گھر پر حملہ ہو سکتا ہے۔ حفظِ ما تقدم کے طور پر اُس نے ممدو بھائی کا سہارا لیا۔

ممدو بھائی کا کہنا تھا کہ ''سالی شراب اور تاش کوئی چیز ہے۔ ہم نے تو اُس کے بغیر رہ نہیں سکتے۔ یہ سالا ماسٹر اتنی سی بات کے لیے لفڑا کاہے کو پھیلا رہا ہے۔ گسّے میں آدمی ماں بہن نہیں کرتا ہے تو کا کلمہ پڑھتا ہے۔ اتنی سی بات اِس سالے ماسٹر کی سمجھ میں نہیں آتی کہ گسّے میں کسی کو اُٹھاوے کو کہے ہے آدمی تو سچ مچ اُٹھا ہی لے ہے؟''

قصہ مختصر یہ کہ ارون بھاٹیہ کے عین وقت پر پہنچ جانے کی وجہ سے اسمٰعیل اور اُس کے گھر والوں کی جان بچ گئی!

• • •

11

منظروں میں آگ لگ چکی تھی—

یہ آگ اُس دن اور تیز ہو گئی، جب الیکشن ڈیوٹی بجالانے کا سرکاری حکم صادر ہوا۔

خاص طور پر بہار میں الیکشن کا مرحلہ جتنا مشکل ہو چکا ہے، اِس میں اپنی خوشی سے کون الیکشن ڈیوٹی کرنا چاہتا ہے، مگر جب سپریم کورٹ نے کالج اور یونیورسٹی کے اساتذہ کو بھی الیکشن ڈیوٹی میں شامل کرنے کا حکم جاری کر دیا تو کلکٹریٹ والوں کو ایک بہانہ مل گیا۔

''اب دیکھیں گے سالے پروفیسر لوگ کیسے بچتے ہیں؟'' پروفیسر راجن کسی کام سے کلکٹریٹ گئے تھے، وہاں ایک کرانی کو بولتے سنا۔

''ہاں! سب کے سب اپنے کو کمشنر کے برابر سمجھنے لگے تھے۔'' اُس کرانی کے تبصرے پر دوسرے نے گرہ لگائی۔

''اب ساری ہیکڑی بھلا دی جائے گی۔'' ایک کونے سے تیسرا تبصرہ۔

اِدھر یونیورسٹی اور کالجوں میں بھی خاصی بے چینی تھی۔ صدر انجمن اساتذہ پروفیسر نول کشور نے سکریٹری کو متحرک ہونے کیلیے ہدایت کی۔ سکریٹری رجسٹرار سے ملا تو رجسٹرار جو حکومت کا ایک ریٹائرڈ ملازم تھا، بہت غرّا کر بولا ''لسٹ کیسے نہیں جائے گی؟ سپریم کورٹ کے حکم نامے کے ساتھ کلکٹر صاحب کی چٹھی آئی ہے۔''

دوسرے دن سے آفس کا ایک کلرک لسٹ بنانے کے کام میں جٹ گیا۔

پروفیسروں کی آپس کی گفتگو میں بڑی بے چینی کا اظہار ہوا اور طرح طرح کا ردِّ عمل سامنے آیا۔ ایک مسلمان پروفیسر بھارتیہ جنتا پارٹی کا ممبر بن گیا اور بھارتیہ جنتا پارٹی کے لیٹر ہیڈ پر اپنے سیاسی تعلق کی اطلاع کلکٹر صاحب کو بھجوا دی اور مطمئن ہو کے بیٹھا کہ اَب اُسے کون چھونے والا ہے۔ دوسرے نے ایک لمبا چوڑا خط ڈی.ایم. کے نام لکھا اور پارٹی جوائن کرنے کی جو آزادی کالج

کے اساتذہ کو ملی ہوئی ہے اُس کے حوالے سے یہ نکتہ پیدا کیا کہ چونکہ اساتذہ عام طور پر کسی نہ کسی سیاسی گروپ کے ہمدرد یا مخالف ہوتے ہیں، اس لیے الیکشن کے مراحل میں اُن سے غیر جانب داری کی اُمید ہی نہیں کی جا سکتی۔ ایک اور صاحب نے اپنا ECG، پیشاب جانچ کی رپورٹ، (جس میں یرقان کی نشان دہی کی گئی تھی)، الٹرا ساؤنڈ (جس میں جگر بڑھنے کی بات کہی گئی تھی) سارا لیکھا جوکھا جمع کیا اور مطمئن ہو کے بیٹھے کہ اس بنیاد پر وہ بچ جائیں گے۔ ایک صاحب نے بھاگ دوڑ کر نگاہ کی کمزوری اور بہرے پن کی سرٹیفیکیٹ حاصل کر لی۔

اس عام بے چینی، گھبراہٹ اور بھاگ دوڑ کے درمیان اسکول کے اساتذہ اور نن گزیٹڈ ملازمین کی اسٹرائک بھی ٹوٹ گئی تو ہوا کے ریلے کی طرح ایک بات، چاروں طرف گشت کرنے لگی کہ اب کالج والوں کی کوئی ضرورت نہیں ہوگی کیوں کہ حکومت کے اپنے کارندے تو کام پر لوٹ ہی آئے۔

دوستوں نے ایک دوسرے کو خوش خبری سنائی اور گھر پر بال بچوں کو اطمینان دلایا، بات آئی گئی ہوگئی کہ پھر ایک دن جیسے بھونچال آ گیا۔ یونیورسٹی اور کالج ہر جگہ بس یک ہی بات موضوعِ بحث تھی۔ ''لیٹر آ گیا۔'' کسی کو بھی تفصیل بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔ ہر پروفیسر دوسرے پروفیسر سے بس اتنا ہی کہتا، ''تم نے سنا؟ لیٹر آ گیا؟'' اور سننے والا پہلے تو کچھ دہشت زدہ ہوتا نظر آتا، پھر حیرت بھرے لہجے میں بس ایک ہی سوال کرتا: ''یہ کیسے ہو گیا؟''

چاروں طرف اسکوٹر اور رکشے دوڑنے لگے۔ انجمن کے سکریٹری اور صدر کو پھر پکڑا گیا، ''کیا کیا آپ لوگوں نے؟ لیٹر کیسے آ گیا؟ صدر سکریٹری بے چارے کیا جواب دیتے؟ وہ آفس کی طرف دوڑے، اور وہاں سے یہ خبر لے کر آئے کہ صرف پروفیسر ہی نہیں آفیسروں کو بھی ڈیوٹی دے دی گئی ہے۔ یہاں تک کہ رجسٹرار کو بھی اب الیکشن ڈیوٹی پر جانا ہے۔

ویسے اب رجسٹرار کی سمجھ میں بھی آ چکا تھا کہ یہ غلط ہوا ہے کیوں کہ پروفیسرس، ریڈرس اور لیکچررس کے ڈیوٹی پر جانے سے صرف پڑھائی کا نقصان ہونے والا تھا، مگر افسروں کی الیکشن ڈیوٹی تو یونیورسٹی ہی بند کرا دے گی۔ اور ویسے بھی رجسٹرار حکومت کا گزیٹڈ افیسر یا اُس کے برابر ہوتا ہے۔ اُس کو کالج کے اساتذہ کے ساتھ جوڑنا بالکل غلط ہے۔ اس لیے ایک دروازے سے اگر انجمن اساتذہ کے صدر اور سکریٹری کلکٹریٹ میں داخل ہوئے تو دوسرے دروازے سے رجسٹرار صاحب

بھی داخل ہوتے نظر آئے اور پھر تینوں نے ایک حکمتِ عملی کے تحت مشترکہ طور پر درخواست دی کہ کم از کم صدرِ شعبہ، یونیورسٹی پروفیسر اور افسروں کو الیکشن ڈیوٹی نہ دی جائے تاکہ تعلیم اور دفتری کاموں میں رُکاوٹ نہ پیدا ہو۔ ڈی.ایم. نے یہ بات مان لی۔ سنگھ کا سکریٹری وہاں سے بہت خوش خوش لوٹا اور کریڈٹ لینے کے لیے ڈی.ایم. کے ساتھ ہونے والی ساری گفتگو پریس کے حوالے کر دی۔ دوسرے دن اخبارات میں خبر آئی کہ ''ڈی.ایم. صاحب صدرِ شعبہ، افسروں اور پروفیسروں کو الیکشن ڈیوٹی سے بری کرنے پر راضی ہو گئے۔''

اخبار کا بازار میں آنا تھا کہ اِک آگ سی لگ گئی۔ سارے ریڈرس اور لکچررس سر جوڑ کر بیٹھے اور ایک حکمتِ عملی کے تحت کلکٹر صاحب کے پاس گئے اور کافی غم وغصہ کا اظہار کیا۔ اُن کا کہنا تھا کہ پروفیسروں میں کون سا سرخاب کا پر لگا ہے کہ اُن کو چھوڑ دیا گیا۔ اور ریڈرس لکچررس کیا بالکل کوڑا کرکٹ ہیں کہ اِن کو جان دینے کے لیے بھیجا جا رہا ہے؟ کلکٹر صاحب تو ویسے ہی الیکشن کے سبب بدحواس ہو رہے تھے، اس پر انھوں نے جو یہ ہنگامہ دیکھا تو وقتی طور پر ذرا نروس سے ہو گئے مگر چند لمحوں بعد ہی اپنی کلکٹری کے خول میں واپس آ گئے اور ڈپٹ کر بولے، ''جھوٹی خبر ہے، میں نے کسی کو بَری نہیں کیا ہے۔''

ریڈرس اور لکچررس وہاں سے خوش خوش لوٹے۔ راستے میں ایک لکچرر نے ہنستے ہوئے کہا، ''سالے بڈھے! ہم لوگوں کو پھنسانا چاہ رہے تھے، اَب پتہ چلے گا۔'' اس بھیڑ میں پروفیسر سدھیشور پرشاد کا لکچرر بیٹا اشوک پرشاد بھی موجود تھا اور خوش تھا کہ کہیں کوئی نابرابری نہیں کی گئی۔

مگر جب کلکٹریٹ کے ایک اے ڈی ایم نے رجسٹرار کو فون کر کے بتایا کہ کلکٹر صاحب کسی کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہیں تو یونیورسٹی اور کالجوں میں پھر پٹس پڑ گئی۔ پھر لوگ سنگھ کے سکریٹری کو گالی بکنے لگے اور رجسٹرار کو یونیورسٹی کا دو دن بند ہونا پھر یونیورسٹی کے لیے بہت نقصان دہ محسوس ہونے لگا۔

سوچتے سوچتے رجسٹرار صاحب نے پھر نکتہ پیدا کیا اور ڈی.ایم. صاحب کے یہاں سہ نکاتی فارمولہ لے کر گئے۔

1. آفیسرس کو چھوڑ دیا جائے تاکہ یونیورسٹی بند نہ ہو۔
2. ہیڈس کو چھوڑ دیا جائے تاکہ شعبوں کا کام کاج چلتا رہے۔

3. جو ہاتھ پیر کان سے معذور اساتذہ ہیں، اُن کو چھوڑ دیا جائے کہ وہ یوں بھی کسی کام کے نہیں ہیں۔

رجسٹرار چونکہ حکومت کا ریٹائرڈ گزیٹڈ آفیسر تھا اور ڈی.ایم بھی چونکہ حکومت کی مشنری کا ہی ایک پرزہ تھا اس لیے ڈی.ایم. نے قہراً جبراً یا تکلّفاً اِن تجاویز کو قبول کرلیا اور جس وقت وہ اس سہولت کا آرڈر دینے والا تھا اُسی وقت انجمن اساتذہ کا سکریٹری بالکل مسمات کی شکل بنائے سامنے آگیا اور بڑی لجاجت سے بولا''سر! جب آپ آفس کے ادھیکاریوں کو چھوڑ رہے ہیں تو میں بھی تو سنگھ کا ادھیکاری ہوں۔'' ڈی.ایم.صاحب کا موڈ اُس وقت ٹھیک تھا اُنھوں نے جوان سکریٹری کو بھی چھوڑ دیا۔

اس مرتبہ سنگھ کے سکریٹری نے اخبارات کو کوئی خبر نہیں دی۔

❖

سردیوں کے موسم میں تو شام ذرا پہلے کیا بہت پہلے ہوجاتی ہے۔ شام ہو چکی تھی مگر مجمع ابھی کم نہیں ہوا تھا۔

چند برسوں قبل لکچرر بنے آشوک پرشاد اور چند برسوں میں ریٹائر ہونے والے اُن کے پِتا پروفیسر سدھیشور پرشاد، دونوں کلکٹریٹ میں بیٹھے اپنی اپنی باری کا انتظار کررہے تھے۔ مگر بیٹا باپ سے کٹا کٹا چل رہا تھا، اور باپ کی نگاہ اگر بیٹے پر پڑتی تو وہ جلدی سے اپنی نگاہ پھیر لیتا یا سگریٹ جلانے لگتا۔

''وجے! کتنا بجا بھائی؟'' اسمٰعیل نے ایک کلیگ وجے کمار گپتا سے پوچھا۔

''چھ بج گئے۔'' گپتا جی نے جواب دیا۔

''ابھی اور کتنا وقت لگے گا؟''

''کیسے کہا جائے؟ ساری پہلی سٹنگ سماپت کردی گئی تو نئی سٹنگ میں تو سمئے لگے گا۔''

''لیکن اِس اُلٹ پھیر کی ضرورت کیا تھی؟''

''تم نے سنا نہیں؟ جو پر بندھ کیا گیا، سب پارٹیوں کی جو میٹنگ کی گئی، وہ سب پچھلے الیکشن کے پروگرام اَنوسار تھی۔ اس کی خبر آبزرورس کو ملی تو اُن کو لگا کہ یہ خبر چھپی نہ رہ سکے گی اور ہوسکتا ہے

کہ پارٹیاں پریزائڈنگ افسروں اور پٹرولنگ مجسٹریٹوں کو اپنی طرف کرنے کا کوئی نہ کوئی راستہ نکال لیں۔ اس لیے ساری سٹنگ کو دوبارہ کمپیوٹر میں ڈال دیا گیا تا کہ بالکل نیا پربندھ اور سٹنگ سامنے آوے۔ ایک ایسی سٹنگ جس کی خبر، جانے سے پہلے تک کسی آفیسر کو نہ مل سکے۔''

اسمٰعیل گپتا جی کی آواز سنتے سنتے اونگھ گیا۔ یہ سب کچھ اُس کی فریکوینسی سے کچھ الگ کی چیز تھی۔ تاریخ کا پروفیسر ہونے کے ناطے وہ ساری زندگی افسانہ اور حقیقت، سچ اور جھوٹ کے درمیان کا فرق سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ اُسے کیا خبر تھی کہ سچ میں بھی جھوٹ تلاش کیا جائے گا اور جھوٹ میں سے سچ نکال لیں گے۔ اُس نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ انتہاؤں میں بھی ''وسط'' تلاش کیا جائے گا۔ اُس کی نگاہ اچانک پروفیسر سدھیشور پرشاد پر چلی گئی۔ اُسے معلوم تھا کہ اُنھوں نے کئی ملک گیر سطح پر منعقد ہونے والے سیمیناروں کی صدارت کی ہے اور وہ بھی کلکٹریٹ میں بچھی دس برس پرانی لوہے کی کرسی پر بیٹھے صبح نو بجے سے اپنا نام پکارے جانے کا انتظار کررہے ہیں۔ اور اب شام کے چھ بجنے والے ہیں۔

''حرامزا...'' اچانک ہی ایک لفظ اسمٰعیل کے منھ سے بہ آواز بلند نکل گیا۔

حالاں کہ اُس نے جلدی سے زبان دانتوں تلے دبائی مگر وجے بابو نے سن ہی لیا۔

''کیا ہوا اسمٰعیل، گالی کیوں بک رہے ہو؟''

''بس ایسے ہی یار...طبیعت جھلّا گئی تھی۔''

''اسمٰعیل! تمھاری طبیعت تو ابھی جھلّائی'' انگلش کے سینئر پروفیسر شمس الہدیٰ کہنے لگے۔''میرا حال تو یہ ہے کہ جس دن سے لیٹر آیا ہے، ہر بات میں ماں بہن کی گالی منھ سے نکلی جارہی ہے۔''

اسمٰعیل، وجے کمار گپتا اور شمس الہدیٰ تینوں آہستہ آہستہ ہنسنے لگے، سدھیشور پرشاد چپ تھے۔

فضا پر چھایا بوجھل پن کم ہوتا محسوس نہیں ہورہا تھا۔ اندھیرا اب اور گہرا ہوگیا تھا۔ چہرے، چہرے کم تھے اور چہروں کا عکس زیادہ!

کلکٹریٹ کے لان میں تقریباً ڈھائی تین سو کرسیاں بچھی ہوئی تھیں، اور وہاں لوگوں کی تعداد چار سو سے کم نہیں تھی۔ یہ چار سو افراد صبح نو بجے سے اپنا نام پکارے جانے کا انتظار کررہے تھے۔ ان سب کو پٹرولنگ مجسٹریٹ کی ڈیوٹی ملنی تھی۔

پٹرولنگ مجسٹریٹ کے ماتحت ایک پولیس انسپکٹر اور چار بندوق بردار سپاہی دیے جاتے ہیں۔

ان لوگوں کی ذمہ داری یہ ہوتی ہے کہ یہ امن وامان اور ایمانداری کے ساتھ الیکشن کے مراحل مکمل کرائیں۔ اس غرض سے ایک پٹرولنگ مجسٹریٹ کو چار سے چھ پولنگ بوتھ تک حوالے کیے جاتے ہیں جو تقریباً چار پانچ کیلومیٹر کی دوری میں پھیلے ہوتے ہیں۔ الیکشن کے دوران کئی قسم کی گڑبڑی کے خطرات رہتے ہیں۔ مثلاً پریزائڈنگ آفیسر یا پولنگ آفیسر کسی خاص سیاسی پارٹی کے ساتھ کوئی رعایت تو نہیں برت رہے ہیں، یا کسی پارٹی والے کسی بوتھ پر قبضہ تو نہیں کر رہے ہیں، یا علاقے کے عام لوگ تو ووٹ دینا چاہتے ہیں مگر کچھ لوگ باقی لوگوں کو ڈرا دھمکا کر پولنگ بوتھ تک آنے سے روک تو نہیں رہے ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ اور چھوٹے چھوٹے حادثات کا خطرہ بھی بنا رہتا ہے، کہیں کچھ لوگ بیلٹ پیپر پھاڑ دیتے ہیں، کچھ لوگ پریزائیڈنگ آفیسر کے ساتھ بدسلوکی کرنے لگتے ہیں، ایسی ہر صورت حال میں پٹرولنگ مجسٹریٹ کو اختیار حاصل ہے کہ اگر وہ چاہے تو پولنگ رُکوا سکتا ہے، جہاں کوئی بدنظمی ہوئی ہے وہاں کی پولنگ ردّ کرنے کے لیے الیکشن کمیشن سے سفارش کر سکتا ہے، لاٹھی چلانے کا حکم دے سکتا ہے، حد یہ ہے کہ اگر ضرورت پڑے تو گولی چلانے کا بھی حکم دے سکتا ہے۔

''مگر وجے بابو۔'' اسمٰعیل وجے کمار گپتا کی طرف مخاطب ہوا: ''پٹرولنگ مجسٹریٹ کو اختیارات بہت ہیں۔''

اور اس سے پہلے کہ وجے گپتا کچھ کہتا، اچانک دونوں کی نگاہ پروفیسر رکن الدین پر پڑی۔

رکن الدین گورے نارے، خوب صورت آدمی تھے اور چند خوش لباس لوگوں میں گنے جاتے تھے مگر اِس وقت تو منظر ہی کچھ دوسرا تھا۔ بال اُلجھے ہوئے، چہرہ پسینے سے تر، گوراپن سیاہی مائل ہو رہا تھا، پینٹ شرٹ پر ایک دو جگہ دھبّے بھی نظر آئے۔ ایک ہاتھ میں کلکٹریٹ سے ملے ہوئے سارے کاغذات اور دوسرے ہاتھ میں اُن کا بریف کیس!

''دین صاحب؟'' سدھیشور بابو اچانک پکار اُٹھے۔ رکن الدین آواز پہچان کر بے ساختہ اُن کی طرف دوڑے۔

''کیا دین بھائی، آپ کی ڈیوٹی کہاں پڑی؟''

''سر! ایک دم نکسل ایریا ہے۔ شیر گھاٹی اور آمس کے بیچ سے ایک سڑک گئی ہے۔'' رکن الدین کا لہجہ بجھا بجھا سا... بلکہ کچھ رویا رویا تھا۔

''آپ لوگ بچ گئے سر؟'' رکن الدین صاحب کے لہجے سے حسرت ٹپک رہی تھی۔

''ابھی کیسے کہا جائے؟'' شمس الہدیٰ نے گویا تسلّی دی۔ ''نام پکارا جا رہا ہے، دیکھئے ہمارا نمبر کب آتا ہے؟''

''آپ کو کیا ملی؟ کار یا جیپ؟'' اسمٰعیل نے پوچھا۔

اسمٰعیل کی اس بات پر رکن الدین اچانک ہنس پڑے۔ ''آپ بھی کیسی بات کر رہے ہیں بھائی؟''

''کیوں؟ کیا ہوا؟ میں نے غلط کہا؟''

''ڈاکٹر صاحب! ہم لوگوں کو جیپ مل جائے گی تو صاحب لوگ کس پر جائیں گے؟''

''ارے بھائی! تو ہم لوگوں کو جانے کے لیے گاڑی تو وہ دیں گے نا؟''

''ہاں سر! دیں گے۔ ٹریکٹر مل رہا ہے، ہم لوگوں کو!''

''کیا کہہ رہے ہیں؟'' اچانک سدھیشور بابو ہڑبڑا کر کھڑے ہو گئے۔

''مولبی صاحب... اب وہاں کیا کھڑے ہو گئے؟ چلیے!'' اچانک آ گئے رُکے انسپکٹر سپاہی، قانونی طور پر رکن الدین کے ماتحتوں میں سے کوئی ایک بالکل جیسے ڈپٹ کر بولا۔ اور رکن الدین بے چارہ مزید کچھ کہے بغیر جلدی سے پولیس والوں کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔

''یار مجسٹریٹ ٹریکٹر پر جائے گا؟'' سدھیشور پرشاد بڑبڑائے۔

''ہدیٰ صاحب! انسپکٹر مجسٹریٹ کا ماتحت ہے یا مجسٹریٹ انسپکٹر کا ماتحت؟'' اسمٰعیل نے بڑے تیکھے لہجے میں شمس الہدیٰ سے پوچھا۔

کسی نے کسی کو جواب نہیں دیا۔ پروفیسر رکن الدین جا چکے تھے۔ نام پر نام پکارا جا رہا تھا۔ سرد اندھیری رات دوڑتی آ رہی تھی۔

''اسمٰعیل! کہیں پانی ملے گا؟'' سدھیشور پرشاد آہستہ سے بولے۔

''کیا بات ہے؟'' ہدیٰ صاحب نے سدھیشور بابو کا چہرہ دیکھا۔ فروری کی ایک سرد شام میں اُن کے چہرے پر پسینہ آ رہا تھا۔

''تم دل کے پرانے مریض ہو، دوا چوس لو۔ پانی مت پیو۔'' وجے کمار نے مشورہ دیا۔

سدھیشور بابو صرف دل کے مریض نہیں تھے۔ اُن کا شوگر لیول بھی بڑھا ہوا تھا اور تنفس بھی

پریشان کرتا تھا۔ اس وجہ سے گرد و غبار سے تو اُن کو بالکل ہی الرجی تھی۔ ساتھ ساتھ موتیا بند بھی بالکل تیار ہو چکا تھا، اگلے مہینے آپریشن لینے کا ارادہ تھا۔ اُن کو بھاری کام کرنا بالکل منع تھا اور کچھ طبیعت بھی آرام پسند تھی، اسی لیے آئی اے ایس کا مقابلہ جاتی امتحان پاس کر لینے اور سروس جوائن کر لینے کے چھ ماہ بعد ہی اُنھوں نے استعفیٰ دے کر یونیورسٹی جوائن کر لی۔ لکھنے پڑھنے کی عادت شروع سے تھی اور اپنے موضوع کا بہت واضح اور منفرد تصور رکھتے تھے، اس لیے فلسفہ کے میدان میں اُن کی بڑی قدر تھی۔ عمر اٹھاون کے آس پاس تھی۔ صوبہ کے ایک وزیرِ اعلیٰ کے کلاس فیلو رہ چکے تھے۔ صوبے میں اور صوبے کے باہر، ہر جگہ بحیثیت فلسفی اُن کی عزت کی جاتی تھی۔ اُنھوں نے تو کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ ایسی صورتِ حال کا سامنا بھی اُن کو کرنا پڑ سکتا ہے۔ اُن کی دنیا کتاب اور قلم تھی۔ انھوں نے اپنی طبیعت کو انتظامیہ کی طرف مائل ہوتے نہ دیکھا، تبھی تو وہ انتظامیہ چھوڑ کر تعلیم کے میدان میں آ گئے۔ اور اَب اُنھی سدھیشور پرشاد کو حکم نامہ ملا۔ سدھیشور بابو نے دوا کھا کر، ایک کرسی پر پیر پھیلا دیا، اور جس کرسی پر بیٹھے تھے اُس کی پشت پر سر ٹکا دیا۔

''ہم بلبلیں ہیں اِس کی، یہ گلستاں ہمارا۔'' جانے کب کا سنا ہوا، قومی ترانے کا یہ بول اسمٰعیل کے ذہن میں گونج گیا۔ اُس نے سدھیشور بابو کے چہرے پر نگاہ کی... ''بے چارے سدھیشور بابو!'' اُس کی آنکھیں بھر آئیں۔ بچپن میں سنا باپ کا ایک جملہ یاد آ گیا۔ کسی بات پر انھوں نے ماں کو سمجھاتے ہوئے کہا تھا: ''باعزت زندگی کے لیے آزادی ضروری ہے۔''

''کیا ہم واقعی آزاد ہو گئے؟'' اسمٰعیل کے دماغ میں سانپ سرسرایا۔

اُس نے پھر سدھیشور پرشاد کو دیکھا... ''اگر انھوں نے انڈین ایڈمنسٹریٹو سروس سے استعفیٰ نہ دیا ہوتا تو یہ ڈی. ایم. اِن کے اسسٹنٹ کا بھی شاید اسسٹنٹ ہوتا۔'' اس نے سامنے بنے اسٹیج پر ایک خصوصی گدے دار کرسی پر بیٹھے اور حکم دیتے ڈی. ایم. کو دیکھ کر مند مند آنکھوں سے جانے کیا کیا دیکھا اور اُس کی آنکھیں دھندلا گئیں۔

۱۹۷۴ء کے بعد سے صوبے میں سماجی اور سیاسی تحرک پسندی (ایکٹیوزم) کا کچھ عجیب پیچیدہ بلکہ سچ مچ سمجھ میں نہ آنے والا معاملہ شروع ہو چکا تھا۔ سدھیشور پرشاد جیسے لوگ کسی پارٹی کے ممبر نہیں تھے مگر مزاجاً وہ سماجی بدلاؤ کو خوش آمدید کہنے کی ہمت کرنے والوں میں اپنا شمار کرتے تھے۔ دورانِ گفتگو کئی مرتبہ اسمٰعیل وغیرہ کو بھی انھوں نے سمجھانے کی کوشش کی کہ جب ساری دنیا میں اینٹی

اپر تھائڈ تحریک چل رہی ہے تو ہم عالمی سطح کے اِس بدلاؤ میں روڑا کیوں بنیں؟ وہ تاریخ کا چکّہ گھومنے کے قائل تھے۔ اس لیے پسماندہ طبقات کے سماجی و سیاسی جوش و جذبہ کو بھی وہ مطلقاً ردّ نہیں کرتے تھے۔ اور اِسی لیے جب دلت، پسماندہ طبقات اور اقلیتوں کی سماج اور حکومت میں حصہ داری کی بات اُٹھی تو وہ اُس کے ساتھ ہو لیے۔ مقامی سطح پر وی. پی. سنگھ کا ایک چھوٹا روپ!

مگر ۱۹۷۴ء سے ۱۹۹۸ء تک کے چوبیس برس کے طویل عرصے میں سماجی انصاف کے نام پر جس طرح ایک ذات کی بالادستی اور اُس کی وجہ سے غنڈہ گردی، انتظامیہ کی بے ایمانی اور بے بسی دونوں، ذات کے نام پر مجرموں کی پردہ پوشی اور اساتذہ سمیت تمام نظریاتی بنیاد رکھنے والے شریف انسانوں کی بے عزتی کا جو سلسلہ شروع ہوا، وہ خود اسمٰعیل کے ذہنی ڈھانچے میں کہیں فٹ نہیں ہو پا رہا تھا۔ حالت یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ دارالسلطنت سے آنے والے ایک آدمی نے بتایا کہ ایک شخص جو نہ تو مرکز یا ریاست کہیں کا وزیر ہے، نہ الیکشن جیت کر آیا ہوا ایم پی، ایم ایل اے ہے۔ صرف راجیہ سبھا کا ممبر ہے اور وزیرِ اعلیٰ کا رشتہ دار، وہ اتنا سر چڑھ گیا ہے کہ یونیورسٹیوں کے وائس چانسلر بھی جب اُس کے کمرے میں جاتے ہیں تو وہ بھی کھڑے رہتے ہیں، کیونکہ جس کمرے میں وہ بیٹھتا ہے وہاں ایک ٹیبل ہے اور ایک کرسی۔ وہ شخص کرسی پر بیٹھا رہتا ہے اور ٹیبل پر پیر پھیلائے رہتا ہے اور سارے وائس چانسلر اور چیئر مین اُس کے سامنے کھڑے رہتے ہیں—اور وہ سارے دانش وروں کو گالی بکتا رہتا ہے۔

اسمٰعیل سوچے چلا جا رہا تھا اور کلکٹریٹ کے لان میں گہری اندھیری رات جھوم جھوم کر برس رہی تھی۔

''پورے ہندوستان پر رات کا سمئے ہے یا یہ اندھیرا صرف اِسی علاقے کے لیے ہے؟''

اسمٰعیل نے آہستہ سے وجے بابو سے پوچھا تو وجے بابو ہنس دیئے اور دھیرے سے بولے، "Please don't be so emotional" فضا قدرے کم بوجھل محسوس ہونے لگی، مگر کسی کی بوریت، ذرا بھی کم نہیں ہو پا رہی تھی۔

لان میں چاروں طرف برقی قمقمے روشن کر دیئے گئے تھے۔ ڈی. ایم. صاحب اور ایس. پی. صاحب شاید آرام کرنے کے لیے اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے تھے۔ اِس لیے کہ اسٹیج پر بچھی تین کرسیوں میں سے بیچ والی کرسی پر ایک اے. ڈی. ایم. بیٹھا تھا۔ باقی دو کرسیوں پر ایک طرف بی

ڈی او بیٹھا تھا اور دوسری طرف کلکٹریٹ کا ایک بڑا بابو!

زیادہ تر لوگ اپنا اپنا نام پکارے جانے پر جا چکے تھے۔ اُن میں سے کچھ گاڑی اور پولیس پارٹی لے کر دوبارہ شاید بیلٹ پیپر لینے آ رہے تھے۔ اب جو لوگ باقی بچے تھے وہ عجب گومگو کی کیفیت میں تھے۔ کبھی دل کہتا کہ اب شاید اُنہیں نہیں پکارا جائے گا، مگر پھر خیال آتا کہ نام تو پکارا جا رہا ہے۔

اس نام پکارنے کے مرحلے میں تین چار مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ کسی کا نام پکارا گیا اور وہ حاضر نہ ہوا، تو پانچ سات منٹ کے وقفے پر بار بار اُس کا نام پکارا گیا اور ہر بار دو تین مرتبہ پکارنے کے بعد بھی جب وہ شخص حاضر نہ ہوا تو اعلان کرنے والے بڑے بابو نے بڑے ہی دھمکی بھرے انداز میں ... اور ذرا زیادہ ہی زور سے کہا کہ:

’’جو لوگ اُپستھت نہیں ہوئے ہیں، اُن کے وِرودھ پراتھمکی اَوشیہ درج کرائی جائے گی۔‘‘

’’ہدیٰ صاحب! کیا سچ مچ جو لوگ نہیں آ سکے، اُن کے خلاف ایف آئی آر درج ہوگا؟‘ اسمٰعیل نے ہدیٰ صاحب سے پوچھا۔

’’دُھت! آپ بھی کہاں کی بات کرتے ہیں؟ الیکشن کے بعد کون پوچھتا ہے؟‘‘ گپتا جی نے ہنس کر کہا۔

’’آپ اتنا یقین کے ساتھ کیسے کہہ سکتے ہیں؟‘‘

’’میرے ایک سمبندھی دوسرے ڈپارٹمنٹ میں ہیں۔ پچھلے تین الیکشن سے اُن کو لگاتار لیٹر آتا ہے، اُن کا نام پکارا جاتا ہے، وہ سنتے رہتے ہیں مگر حاضر نہیں ہوتے۔ پھر بھی کبھی کچھ نہیں ہوتا۔‘‘

’’بھگوان کرے، ایسا ہی ہو‘‘ سدھیشور بابو آہستہ سے بولے۔

’ارے؟‘‘ ہدیٰ صاحب اچانک چونکے۔ ’’وِجے بابو! یہ تو ریزرو والوں کا نام پکارا جا رہا ہے۔‘‘

’’مطلب؟‘‘

’’لگتا ہے، ہم لوگ بچ گئے۔‘‘

’’کیا کہا ہدیٰ صاحب؟‘‘ اسمٰعیل چونک کر سیدھے ہو کر بیٹھ گیا۔

’’ابھی جو نام پکارا، روی شنکر شرما‘‘ ہدیٰ صاحب نے وضاحت کی۔ ’’اِن سے میری جان پہچان ہے، یہ ریزرو میں تھے اور ریزرو والے تو بالکل آخر میں بلائے جاتے ہیں۔ اس کا سیدھا

مطلب یہی ہے کہ جنرل کوٹا میں سے ہم لوگوں کا لیٹر وہاں پر ہے ہی نہیں۔‘‘

’’ارے واہ ہدیٰ صاحب۔ ایسا ہو جائے تو میں آپ کو مٹھائی کھلاؤں گا! کیوں وجے بابو؟‘‘

’’میں کیا کہوں بندھو، میں بھی ریزرو میں ہوں، اب کہیں میری پکار ہو گئی تو؟‘‘

ہدیٰ صاحب اور اسمٰعیل گڑبڑا کر چپ ہو گئے۔ وجے بابو کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔

’’کیا سدھیشور بابو کی طرح مجھے بھی دل کا دورہ پڑنے والا ہے؟‘‘ وجے گپتا کے دل میں شک کا ایک سانپ سارینگا۔

’’شری ایس ہدیٰ، ویاکھیاتا بی این کالج۔ بارون۔‘‘ فضا میں اچانک لاؤڈ اسپیکر سے آواز گونجی اور پروفیسر شمس الہدیٰ کا چہرہ بالکل سفید ہو گیا۔

’’ہدیٰ صاحب! آپ کی تو پکار ہو گئی۔‘‘ وجے بابو نے بڑے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

’’ہاں بھائی! پکار تو ہو ہی گئی۔ میرا اتنی دعائیں پڑھنا شاید بیکار گیا۔‘‘

’’چپ رہیے، مت جائیے، کچھ نہیں ہوگا۔‘‘ اسمٰعیل نے ہدیٰ صاحب کو مشورہ دیا۔

’’شری شمس الہدیٰ، وِیاکھیاتا بدری نرائن کالج، بارون، کرپیا آپ آ کر اپنا پارٹی نمبر اور سب کاگج لے لیں۔‘‘

لاؤڈ اسپیکر پر آواز پورے لان میں پھیل رہی تھی اور شمس الہدیٰ رومال سے اپنا چہرہ صاف کر رہے تھے۔

’’وجے بابو! کیا کروں؟ میرا تو ریزرو میں بھی نہیں ہے۔‘ ہدیٰ صاحب نے تھوک نگلتے ہوئے پوچھا۔

’’ہمت کیجیے، بیٹھے رہیے، جنرل اور ریزرو کیا؟ دیکھا نہیں۔ آپ سے پہلے نو آدمی اُپستھت نہیں ہوئے۔‘‘

لاؤڈ اسپیکر پر اُسی وقت بہت زور سے آواز گونجی ’’شری شمس الہدیٰ! آپ جہاں بھی ہوں جلد آویں، یاد رکھیں جو اُپستھِت نہیں ہوگا اُس کے وِرُدھ پراتھمکی اوشیہ درج کرائی جائے گی۔‘‘

ہدیٰ صاحب ہڑبڑا کر کھڑے ہو گئے۔ ’’میں جا رہا ہوں!‘‘

اور اس سے پہلے کہ وجے کمار گپتا، سدھیشور پرشاد، کوئی بھی اُنہیں کچھ سمجھا پاتا، وہ اسٹیج کے نزدیک پہنچ چکے تھے۔

کلکٹریٹ کے میدان میں اَب زیادہ کرسیاں خالی تھیں۔ زیادہ لوگ جا چکے تھے، بمشکل وہاں پچاس آدمی ہوں گے۔ فروری کے مہینے میں عموماً ٹھنڈک کم ہونے لگتی ہے، مگر اس مرتبہ سردی کم ہونے کا نام نہیں لی رہی تھی، رات کے آٹھ بج چکے تھے۔ سامنے اسٹیج پر اَب صرف ایک بی ڈی او بیٹھا تھا۔ اس کے بغل میں کلکٹریٹ کا بڑا بابو سُتا ہوا لمبوترا چہرہ لیے کسی مشین کی طرح لاؤڈ اسپیکر پر بار بار یہی جملہ دہرا رہا تھا: ''جو اُپستھِت نہیں ہوں گے اُن کے وِرُودھ پراتھمکی اوشیہ درج کرائی جائے گی۔'' اور اسٹیج سے ذرا ہٹ کر ایک ٹیبل پر چار پانچ آدمیوں پر مشتمل کلکٹریٹ کا وہ عملہ بیٹھا تھا، جو ڈیوٹی پر جانے والوں کو کاغذ دینے کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔

فضا عجب اَٹ پٹی سی ہو رہی تھی۔ لمبے چوڑے میدان میں دس بارہ بڑے درخت برقی قمقموں کی روشنیوں کو بار بار چھپا لیتے، پھر ہوا چلتی تو روشنی کی کوئی کرن کرسی پر بیٹھے کسی آدمی پر پڑتی۔ پھر پل بھر میں ہوا کا دوسرا جھونکا اُس آدمی کو دوبارہ چھپا دیتا۔ کوئی آدمی بھی پوری طرح سامنے نہیں آ رہا تھا۔ حالاں کہ میدان میں ایسی جگہوں پر بھی خالی کرسیاں تھیں، جہاں درختوں نے اندھیروں کا جال نہیں بُنا تھا۔ مگر لوگ درختوں کی اوٹ ہی میں بیٹھے ہوئے تھے، شاید شبنم سے بچنے کے لیے۔ ویسے درختوں کی اُوٹ میں بیٹھنے کی وجہ سے اسٹیج والے بھی کسی کو بہت صاف صاف نہیں دیکھ پا رہے تھے۔ سامنے بیٹھا بڑا بابو لوگوں کا چہرہ دیکھے بغیر بس نام پکار رہا تھا۔

اب زیادہ پکار خالی جا رہی تھیں اور مائیکروفون پر بس ایک ہی جملہ بار بار سنائی دے رہا تھا:

''اُپستھِت نہ ہونے والوں کے وِرُودھ پراتھمکی اوشیہ درج کرائی جائے گی۔''

پروفیسر شمس الہدیٰ جا چکے تھے۔

سدھیشور پرشاد اُسی طرح بے سدھ کرسی کی پشت سر سرٹکائے آنکھیں بند کیے بیٹھے تھے۔

اسمٰعیل اور وجے کمار دو بدھے میں گھرے بس اپنے دل کی دھک دھک سن رہے تھے۔

اور نام پکارا جا رہا تھا۔

''ہے بھگوان!'' اچانک وجے بابو کی کراہ سنائی دی۔ لاؤڈ اسپیکر پر آواز گونج رہی تھی...

''وجے کمار گپتا، وِیاکھیاتا رسائن شاستر وبھاگ...رام لکشمن سنگھ کالج، اورنگ آباد...''

سدھیشور بابو نے وجے کمار کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ وجے بابو نے سدھیشور جی کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا تو سدھیشور پرشاد کو احساس ہوا کہ وجے کمار کا ہاتھ تو کسی لاش کی طرح سرد ہو رہا تھا۔

''وجے، کیا کرو گے؟'' سدھیشور جی نے بڑی اپنائیت سے پوچھا... مائیکروفون پر پھر آواز گونجی۔

''شری وجے کمار گپتا آ کر اپنا پارٹی نمبر اور دوسرے سمبندھت پیپرس لے جائیں۔''

''چھوڑیئے، مت جایئے!'' اسمٰعیل بولے مگر اُن کی آواز بالکل کھوکھلی ہو رہی تھی۔

''اسمٰعیل جی، ہدیٰ ہم لوگوں سے جونیئر ہیں، عمر میں بھی کم ہیں، وہ تو اِس کی ہمت نہیں کر سکے۔''

اسمٰعیل کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اب وہ وجے کمار سے کیا کہیں۔ فضا میں وہی کرخت آواز پھر گونجی۔

''شری وجے کمار، اگر آپ اُپستھت نہیں ہوں گے تو آپ کے وِرُودھ پراتھمکی...''

وجے بابو اِس سے زیادہ نہیں سن پائے۔ انھوں نے اپنا بریف کیس اُٹھایا اور سیدھ میں چل پڑے۔

سدھیشور بابو نے دل کی تکلیف میں کھائی جانے والی ایک اور گولی منھ میں ڈالی۔

اچانک اسمٰعیل کو احساس ہوا کہ وہ بالکل تنہا ہے۔

کرسی کی پشت سے سر ٹکائے ٹکائے سدھیشور بابو کو یاد آیا کہ اُن کا لکچرر بیٹا بھی تو اِسی میدان میں تھا، کیا اُسے ڈیوٹی مل گئی؟ وہ چلا گیا؟ اُنھوں نے اُچک اُچک کر چاروں طرف دیکھنے کی کوشش کی مگر وہ کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ سدھیشور بابو کو اپنے بیٹے پر بہت غصہ آیا۔ نالائق جانے سے پہلے مل تو لیتا۔ پھر اُنھیں دوسری فکر نے آ گھیرا۔ پتہ نہیں اُس کی کس علاقے میں ڈیوٹی پڑی۔ اگر کہیں نکسلائٹس کا علاقہ ملا تو؟ اندر اندر ایک عجیب سی بے چینی نے اُنھیں اپنے گھیرے میں لے لیا۔ مرضِ قلب اور بلڈ پریشر کے مریض کا بھی عجب حال ہوتا ہے۔ جب وہ موجود تھا تو اُسے دیکھ کر گالی بک رہے تھے اور چلا گیا تو یہ سوچ کر پریشان ہو رہے تھے کہ پتہ نہیں کس علاقے میں گیا۔

رات کے تقریباً نو ساڑھے نو بج رہے تھے۔ نزدیک و دور اندھیرے کی چادر تنی ہوئی تھی۔ لمبے چوڑے کلکٹریٹ کے میدان میں اب بمشکل بیس پچیس آدمی بچے ہوں گے۔ اسمٰعیل نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کی... سدھیشور کے علاوہ کوئی شناسا، جان پہچان کا کوئی آدمی... اسمٰعیل کو احساس ہوا کہ وہ بالکل تنہا ہے۔ ان بیس پچیس افراد میں ایک بھی تو اُس کی جان پہچان

والا نہیں تھا۔ پتہ نہیں کون لوگ ہیں؟ کسی دوسرے کالج کے، یا کسی آفس کے، یا پھر کسی اسکول کے ...اسمٰعیل فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔

اچانک دماغ میں ایک سوال نے سر اُٹھایا۔ پورے ہندوستان میں الیکشن ہوتا ہے۔ دوسرے کسی صوبے کے لوگوں کو الیکشن کرانے میں کوئی دشواری تو نہیں محسوس ہوگی۔ اُنھیں یاد آیا۔ پانچ چھ سال پہلے اُس کے ایک تامل دوست کے کچھ رشتہ دار اُس دوست کے یہاں آئے ہوئے تھے۔ بات گھومتے گھومتے الیکشن اور اُس کے مراحل تک پہنچی۔ وہ بہت اطمینان سے الیکشن کروانے کا اپنا تجربہ بیان کرنے لگے۔ اُن کے تجربے میں کوئی لاقانونیت یا تشدد نہیں تھا۔ اُن کے بیان کے مطابق دکنی ہندوستان میں الیکشن یا الیکشن ڈیوٹی کوئی مسئلہ نہیں تھی۔ پھر بہار، اُتر پردیش اور بنگال والے الیکشن کرانے سے کیوں گھبراتے ہیں؟ کیا ہم ڈرپوک ہیں؟ کیا ہم ذمہ داریوں سے بھاگتے ہیں؟ کیا شمالی ہندوستان میں امن وامان برقرار رکھنے کا مسئلہ واقعی دوسرے علاقوں سے زیادہ مشکل اور تکلیف دہ ہے؟ کیا باقی پورے ہندوستان میں غیر سماجی عناصر نہیں ہیں؟ نکسلائٹس یا پیپلز وار گروپ والے نہیں ہیں؟ ہم میں کون سا سرخاب کا پر لگا ہوا ہے کہ ہم الیکشن مکمل کرانے کے کام میں حصہ لینا اپنے منصب سے کمتر سمجھتے ہیں؟ یا پھر یہ وجہ ہے کہ جو لوگ ٹیچنگ کے پیشے سے جڑے ہیں، وہ انتظامیہ کے مدّوجزر سے خود کو ہم آہنگ نہیں کر پاتے اور اِسی لیے درس وتدریس سے متعلق افراد کبھی کبھی سر پر آنے والی اِس ذمہ داری سے فرار حاصل کرنا چاہتے ہیں کیونکہ بھیڑ کی نفسیات کو سمجھنا اور اُس کا مقابلہ کرنا ایک الگ فن ہے، جس سے یا تو سیاست داں واقف رہتا ہے یا پولیس کا عملہ یا مجرم!

اسمٰعیل سوالات کی ڈھلان پر پھسلا تو پھسلتا چلا گیا۔ ہدیٰ صاحب اور وجے کمار گپتا تو جا ہی چکے تھے اور سدھیشور بابو اپنے حال میں بے حال تھے۔ اب اسمٰعیل کو ٹوکنے والا کون تھا؟

تقریباً ایک گھنٹے کے بعد وہ چونکا... اُس نے ہڑبڑا کر سامنے نگاہ کی... سدھیشور پرشاد اپنی کرسی پر نہیں تھے۔ اسمٰعیل سمجھ نہیں پایا، وہ کہاں گئے؟ وہ گئے تو اُنھوں نے اس کی خبر کیوں نہیں کی ...اور خود اُس کو یہ خبر کیوں نہیں ہے کہ سدھیشور پرشاد کا نام پکارا گیا۔ اُنھوں نے ڈیوٹی جوائن کی... یا وہ گھر چلے گئے؟

اُس نے گھڑی دیکھی۔ دس سے زیادہ بج گئے تھے۔ وجے بابو نو کے آس پاس گئے تھے... وہ

سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ وہ نو بجے سے دس بجے تک سوتا رہا یا جاگتا رہا... اُسے احساس ہوا کہ اس بیچ وہ اونگھ گیا۔

بہرحال! ایک گھنٹہ گزر چکا تھا۔ میدان میں پانچ سات آدمی آتے دکھائی دیے۔ اسٹیج بالکل خالی تھا۔

''کیا میرا نام نہیں پکارا گیا؟'' خیال کی پہلی لہر خوش کرنے والی تھی۔

''مگر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ میرا نام نہیں پکارا گیا، ممکن ہے پکارا گیا ہو'' خیال کی دوسری لہر نے اُسے پریشان کیا۔

''اگر پکارا گیا تو سدھیشور بابو نے مجھے جگایا کیوں نہیں؟''

کیا سدھیشور بابو مجھ سے پہلے چلے گئے؟

اگر پہلے گئے بھی تو اُنھوں نے جانے سے پہلے مجھے بتایا کیوں نہیں؟

یہ کیسے پتہ چلے کہ میرا نام پکارا گیا یا نہیں پکارا گیا؟

بے چینی اور خوف کے ایک بھنور میں اُس نے خود کو گھرتا محسوس کیا۔ ذہن پر بہت زور دیا مگر اسمٰعیل یہ فیصلہ نہیں کر سکا کہ وہ سو گیا تھا، یا اونگھ رہا تھا، یا جاگ رہا تھا۔

اُسے اپنے آپ پر شدید غصہ آیا۔ لعنت ہے اِس بڑھتی عمر پر جو روٹین کا غلام بنا دیتی ہے اور اپنی خبر سے بھی بے خبر کر دیتی ہے۔ دس بجے کے آس پاس سونے کی عادت نے آج یہ سارا فساد کھڑا کیا۔ اُس کو لگا کہ اُس سے اچھے تو ہدیٰ صاحب اور وجے بابو ہی تھے جنھوں نے ایک واضح صورتِ حال کی طرف ارادی طور پر قدم بڑھایا۔

''کلکٹریٹ کے بڑا بابو سے پوچھ لیا جائے۔'' ایک راستہ نظر آیا۔

''مان لو، تمھارا نام نہیں پکارا گیا ہے مگر سامنے آنے پر کوئی ڈیوٹی دے دی گئی تو؟'' یہ تو آبیل مجھے مار والی بات ہوگی۔

ویسی تمام راتوں کا آخری منظرنامہ یہ ہوتا ہے کہ ہدیٰ صاحب اور وجے بابو آگے بڑھ جاتے ہیں، سدھیشور پرشاد لاپتہ ہو جاتے ہیں اور اسمٰعیل رضا جہاں اور جس علاقے میں رہیں، نہ آگے بڑھ پاتے ہیں نہ پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔

اسمٰعیل بارہ بجے رات تک کلکٹریٹ کے میدان میں کلکٹریٹ کے بڑا بابو اور دوسرے

کرمچاریوں کی نظروں سے بچ بچ کر ٹہلتے رہے اور اپنے جانتے صورتِ حال کا اندازہ لگانے کی کوشش کرتے رہے اور اُنہیں کوئی اندازہ نہیں لگ سکا۔ اور بار بار لاؤڈ اسپیکر سے میدان میں گونجنے والی آواز اُن کے سینے پر دوہتھڑ برساتی رہی: ''اُپستھِت نہ ہونے والوں کے وِرُودھ پراتھمکی اوشّیہ درج کرائی جائے گی!''

ایک ڈیڑھ بجتے بجتے کلکٹریٹ میں بالکل سناٹا چھا گیا۔ اسمٰعیل کے پاس وہاں سے چلے آنے کے سوا، اب کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ وہ بے چین دل اور تھکے قدموں کے ساتھ نکلا اور گھر کی طرف بڑھ گیا۔

بچے سو چکے تھے، مگر بیوی جاگ رہی تھی، کال بیل بجتے ہی اُس نے دروازہ کھولا۔ اسمٰعیل بے سدھ ہو کر بستر پر لیٹ گیا۔ اس کو پتہ نہیں کیسے کیسے خیالات نے گھیر رکھا تھا۔

''کیا ہوا؟ آپ بچ گئے نا!'' بیوی نے بڑی اُمید سے پوچھا۔

''پتہ نہیں!''

''کیا مطلب؟''

''ابھی کیسے کہا جائے کہ میں بچا یا نہیں!''

''جب نام نہیں پکارا گیا تو بچ ہی گئے۔''

''یہ کیسے سمجھ لوں کہ نام نہیں پکارا گیا۔''

''عجیب سی بات کر رہے ہیں آپ۔ نام پکارا جاتا تو آپ کو معلوم نہ ہوتا؟''

''یہی تو مسئلہ ہے، نو سے دس کے درمیان میری آنکھ جھپک گئی تھی۔''

''ارے تو کسی نے تو سنا ہوگا۔ کوئی تو آپ کو بتاتا۔''

''کون بتاتا؟ وجے کمار، شمس الہدیٰ، روی شنکر، رکن الدین... جان پہچان والے سب پہلے ہی جا چکے تھے۔''

بیوی کچھ بولی نہیں مگر پریشانی اُس کے چہرے پر بھی جھلکنے لگی۔ پھر چند لمحوں بعد ہی اُس نے سنبھالا لیا۔

''دیکھئے! اس میں دونوں پہلو ہیں، ممکن ہے پکارا گیا ہو، ممکن ہے نہ پکارا گیا ہو۔ آپ اُس کا تاریک رُخ ہی کیوں دیکھ رہے ہیں؟''

''دل کا کیا کروں؟''

''ارے کچھ نہیں ہوگا۔ چلیے اُٹھئے، منہ ہاتھ دھو لیجیے۔ میں کچھ کھانے کو لاتی ہوں۔''

''نہیں! اِس وقت کچھ کھانے کی خواہش نہیں ہے، صرف چائے پلا دو۔''

بیوی چائے بنا کر لے آئی۔ اسمٰعیل جب تک چائے پیتا رہا، شہوار بھی بیٹھی رہی۔ پھر اسمٰعیل ہی نے اُسے سونے کے لیے کہا اور خود بھی بستر پر لیٹ گیا۔

وہ جتنا تھک چکا تھا، ویسے میں اُسے بے سدھ ہو کر سونا چاہیے تھا، مگر لیٹنے کے بعد پھر طرح طرح کے خیالات نے ہلّہ بول دیا۔ اُسے یاد آیا، ایک دن اسٹاف روم میں بات چل رہی تھی تو کسی نے کہا تھا۔ الیکشن ڈیوٹی سے بھاگنا بڑا جرم ہے، اس میں تو جیل بھی ہو سکتی ہے اور نوکری بھی جا سکتی ہے۔

اُسے لگا، وہ پسینے پسینے ہو رہا ہے۔ اس نے بدن میں کچھ کپکپی سی محسوس کی۔ گنجائش تو دونوں طرح کی تھی، مگر وہ اپنے دل کا کیا کرتا، اچھی بات یاد ہی نہیں آ رہی تھی... ساری رات اِسی ادھیڑ بن میں گزر گئی۔

دوسرے دن وہ ایک نئی مصیبت میں گرفتار ہو گیا۔

گھر سے جب وہ نکلا تو اُس کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ وہ وہاں جائے گا مگر چلتے چلتے بیچ راہ میں اُس کا دل گھبرانے لگا... پتہ نہیں کیا ہوا؟ الیکشن ڈیوٹی تقسیم کرنے کا کام تو ختم ہوا لیکن اب وہ ایف آئی آر کی طرف متوجہ نہ ہو جائیں۔ اسمٰعیل کسی اور طرف جانے کے بجائے کلکٹریٹ کی طرف مڑ گیا۔ وہ گیارہ بجے کے قریب کلکٹریٹ پہنچا تھا۔ پورے کلکٹریٹ میں سناٹا تھا۔ دراصل کل دن بھر یہاں ایسی چہل پہل رہی کہ آج پچیس تیس آدمیوں کی موجودگی اُسے سناٹے کے مماثل لگ رہی تھی... وہ ایک انجان کی طرح کلکٹریٹ میں گھوم رہا تھا۔ کلکٹریٹ پوری طرح کھلا ہوا بھی محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ جو کمرے کھلے ہوئے تھے اُن کمروں میں جاتا۔ جن ٹیبلوں پر کچھ لوگ گپ شپ کر رہے تھے اُن کے پاس سے گزرتا... کان لگاتا۔ کل حاضر نہ ہونے والوں کے بارے میں کچھ بات ہو رہی ہے کیا... مگر وہ کچھ اندازہ نہیں لگا پایا۔

اچانک اُسے یاد آیا... آج تو الیکشن ہے، ہر جگہ چھٹی ہے تو کلکٹریٹ کہاں سے کھلا ہوگا۔ اُسے

اپنی جھلکی پر غصہ آیا۔

وہ تیز قدموں سے گھر کی طرف لوٹا، پھر راستے ہی میں یاد آیا کہ جب گھر سے باہر آ ہی گیا ہے تو ووٹ بھی دے لے، اُسے یاد آیا کہ اُس کا پولنگ بوتھ بھی قریب ہی ہے۔ وہ گھر جانے کے بجائے پولنگ بوتھ کی طرف مڑ گیا۔ پولنگ بوتھ ایک اسکول میں تھا۔

اسکول کے باہر لوگوں کا مجمع لگا ہوا تھا۔ ہر پارٹی والے اپنے دو چار سورماؤں کے ساتھ موجود تھے۔ رکشہ والے عورتوں کو اور کبھی کبھی بوڑھے مردوں کو بھی لے کر آتے اور اسکول سے ذرا دور پر اُتار کر پھر محلے کے اندر چلے جاتے۔ اسمٰعیل کو یاد آیا کہ پارٹی والوں کی طرف سے ووٹروں کو آنے جانے کی یا کسی بھی قسم کی کوئی سہولت دینا اب الیکشن کمیشن کی طرف سے غیر قانونی قرار دیا جا چکا ہے۔ مگر اسمٰعیل دیکھ رہا تھا کہ رکشے آ جا رہے تھے اور کوئی روک ٹوک کرنے والا نہیں تھا۔

''آج تو رکشہ وغیرہ بند ہے نا؟''

''ہاں تو؟'' شناسا نے اُلٹے اُس سے سوال کر ڈالا۔

''تو یہ کہ یہ رکشے والے سڑک پر کیوں ہیں؟ کن لوگوں کو لا رہے ہیں لے جا رہے ہیں؟''

''پروفیسر صاحب!'' شناسا ہنسا، ''آپ بھی کیسی بات کرتے ہیں، یہ کسی ایک پارٹی کا رکشہ ہے؟ ہر پارٹی نے اپنا اپنا رکشہ طے کر رکھا ہے، اور پارٹی والے اپنا اپنا ووٹر بھجوا رہے ہیں۔''

''مگر الیکشن کمیشن نے تو...؟''

''سر! آپ بھی عجیب بات کرتے ہیں، الیکشن کمیشن کو خبر کون کرے گا؟ اس حمّام میں تو سب ننگے ہیں۔''

'ہاں، سو تو ہے۔'' اسمٰعیل اتنا کہہ کر چپ ہو رہا۔

''آپ نے ووٹ دے دیا؟''

'نہیں، ذرا پرچی لے لوں۔''

''ٹھہریئے میں پرچی لاتا ہوں۔''

اتنا کہہ کر شناسا ایک پولنگ ایجنٹ کے پاس جا کر پرچی بنوانے لگا۔ ابھی وہ شناسا لوٹا بھی نہیں تھا کہ اچانک اسکول کے اندر سے پہلے تڑاتڑ لاٹھی چلنے کی آواز آنے لگی، اور پھر ہوائی فائر ہوا۔ پل بھر میں کچھ لوگ اسکول کے اندر سے باہر بھاگے، باہر بھی بھگدڑ مچ گئی اور منٹوں میں جہاں

اسمٰعیل کھڑا تھا، وہاں سناٹا چھا گیا۔ اب نہ تو کہیں کسی پارٹی کا کوئی ورکر نظر آ رہا تھا، نہ پولنگ ایجنٹ دکھائی دے رہا تھا، نہ باہر کھڑے لوگوں کا کوئی پتہ تھا۔ اسمٰعیل نے سوچا کہ اُس کو بھی یہاں سے ہٹ جانا چاہیے۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ قدم آگے بڑھاتا، سامنے سے پولیس وین آتی دکھائی دی، بے ساختہ اُس کے قدم تیز ہو گئے۔ پچپن کے قریب عمر، بدن بلغمی، چند قدموں بعد ہی وہ ہانپنے لگا۔ مگر اُس کو لگا کہ یہاں سے ہر حال میں ہٹ جانا ہی بہتر ہے۔ اس کے قدم کا تیز ہونا تھا کہ پولیس کی ایک گاڑی نے اپنا رُخ اس کی طرف کر دیا، اور اسمٰعیل ابھی ایک گلی میں مڑنے والا ہی تھا کہ اس کے پیچھے پولیس وین رُکی اور چند سپاہیوں نے بہت تیزی سے گاڑی سے کودتے ہوئے پیچھے سے اُس کا کالر پکڑ لیا۔

اسمٰعیل ہک بک، کاٹو تو خون نہیں، دماغ سن سن کر رہا تھا۔

''سالا بھاگ رہا تھا، حرامی کا جنا۔'' ایک سپاہی نے اُسے گاڑی میں ٹھونستے ہوئے کہا۔

''بھائی...'' اسمٰعیل ہکلایا... ''بھائی صاحب... میری بات سنئے۔''

''ہاں بڑھے! سب سنیں گے۔ چلو تھانہ چل کے سنتے ہیں اور سناتے ہیں۔''

ایک سپاہی نے بندوق کا کندا اس کے پیٹ میں چبھوتے ہوئے کہا۔ اسمٰعیل نے درد سے زیادہ ذلّت محسوس کی، مگر وہ کیا کر سکتا تھا۔ اچانک اُس کی نگاہ اپنے کپڑوں پر گئی۔ وہ کل صبح کو پہنا کپڑا بدلے بغیر سو گیا تھا اور صبح کو وہی کپڑا پہنے باہر نکل آیا تھا۔ اس نے محسوس کیا وہ غلط انداز میں، غلط وقت اور غلط مقام پر اپنے غلط فیصلے کا خود شکار ہوا تھا۔

اسمٰعیل کو سپاہیوں نے جیپ کے پچھلے حصّے میں، دونوں سیٹوں کے بیچ، جیپ کے فرش پر بٹھا لیا تھا اور جیپ آگے بھاگی جا رہی تھی۔

اس نے اپنے اِرد گرد نگاہ کی، اس کے ساتھ ہی دو اور آدمی فرش پر اُکڑوں بیٹھے تھے۔

سامنے جیپ کی دونوں سیٹ پر بیٹھے ہوئے دو اور دو، چار سپاہی۔

آگے ڈرائیور کے بغل میں شاید ان سپاہیوں کا کوئی افسر تھا... انسپکٹر یا سب انسپکٹر!

اسمٰعیل نے ایک بار پھر درد سے زیادہ ذلّت محسوس کی اور وہ اپنے اندر ہی اندر کٹ کٹ کر گرنے لگا۔

''تو یہ ہے... ڈاکٹر اسمٰعیل رضا... آپ کی اصل اوقات!''

اُس نے بہت تمسخرانہ انداز میں اپنے آپ پر نگاہ کی۔ میاں صاحب اپنے آپ کو بہت سورما سمجھتے تھے۔ دنیا بدل دینے کا ارادہ لے کر اُٹھے تھے۔ طے کیا تھا کہ اپنے آپ پر ترحّمانہ اور تمسخرانہ انداز میں اُٹھنے والی ہر نگاہ کو بے نگاہ کر دیں گے، عزت، نیک نامی اور سکون سے جینے کا راستہ تلاش کر رہے تھے۔ بہت اینڈتے تھے کہ خلقِ خدا میں میری ایک پہچان ہے۔

''اِن میں سے کوئی مجھے نہیں جانتا؟'' اسمٰعیل ''خود استہزائیت'' سے ''خود ترحمی'' کی طرف لوٹ آیا تھا۔

بھیونڈی سے بہار تک .صورتِ حال میں تبدیلی کیا آئی ؟

شہر کی درجنوں سماجی تقریبات میں شرکت کی، ہندی انگریزی اخبارات میں تصویریں چھپیں، اور اِس جیپ میں بیٹھے دس آدمیوں میں سے ایک بھی مجھے نہیں جانتا؟ اس کا جی چاہا کہ وہ جیپ کے اندر موجود لوگوں کو بتائے کہ ''کم بختو! تم نے شہر کے ایک انتہائی شریف اور جانے مانے شہری کو بلا قصور گرفتار کر لیا ہے۔'' اُس نے سوچا کہ ''وہ اِس کی اطلاع صوبے کے وزیرِ اعلیٰ سے صدر جمہوریہ تک کو دے گا اور اِن نالائقوں کو کٹہرے میں کھڑا کر کے رہے گا۔''

''ارے سالا...ای سے کا دیکھ رہا ہے رے؟'' ایک سپاہی نے اُس کو اپنی طرف گھورتے دیکھ کر اُس کا بال پکڑ کر ایسا جھٹکا دیا کہ اُس کا سر زمین سے ٹکرا گیا اور درد کی شدت سے وہ بلبلانے لگا...اُس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

''کا نام ہے رے؟'' دوسرے سپاہی نے ڈپٹ کر پوچھا۔

''اسمٰعیل رضا!''

''ای سب تیرے ساتھی ہیں نے؟''

''میں ان کو نہیں جانتا۔''

''بڑا امیں ٹیں کر رہا ہے۔ پوچھو تو کا کرتا ہے؟'' آگے بیٹھے شخص نے بغیر مڑے کہا۔

''کا کرے ہے رے؟''

''پروفیسر ہوں۔''

''کیا؟'' آگے بیٹھا شخص یک لخت مڑا۔ ''کہاں پروپھیسر ہو؟''

''رام لکشمن سنگھ کالج میں!''

''کس وِشے میں؟''

''ہسٹری میں۔''

''آگے بیٹھے شخص نے شاید کوئی اشارہ کیا۔ دو سپاہیوں نے اپنے بیچ میں جگہ بناتے ہوئے کہا۔ ''یہاں بیٹھو!''

مگر اس کے بیٹھتے بیٹھتے جیپ رُک گئی۔ شاید تھانہ آ گیا تھا۔

اسمٰعیل اور اُس کے ساتھ جو دو آدمی اور پکڑے گئے تھے، تینوں کو ایک بڑے ہال میں لا کر بند کر دیا گیا۔ شاید یہ اُس تھانے کی حوالات تھی۔ اسمٰعیل نے دیکھا، وہاں اُن تینوں سے پہلے لگ بھگ پچیس تیس آدمی لائے جا چکے تھے۔

اس نے ہال میں داخل ہو کر اِس سرے سے اُس سرے تک نگاہ کی۔

کسی بھی آنے والے کو کوئی پریشانی نہیں تھی۔ کوئی کھینی ٹھونک رہا تھا، کوئی پان کھا رہا تھا، کوئی سگریٹ پی رہا تھا، کسی گوشے میں دو تین آدمی گپ کر رہے تھے۔

وہ چپ چاپ، ہال کے آخری کنارے پر پڑی ایک چوکی کے آخری کنارے پر جا کر بیٹھ گیا، اور دیوار سے سر ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔

وہ ایک عجیب بے کیفیتی کے حصار میں تھا... خلا...سب کچھ دھواں دھواں...ایک انجا ہی انفعالیت بلکہ مُردنی...وہ سانس لے رہا تھا مگر وہ تھا ہی نہیں...اسمٰعیل تو اس وقت کہیں بھی نہیں تھا ...دماغ سے تلوے تک، اعصاب ایسے اضمحلال کے حصار میں تھے جس میں ہر عضو زندہ رہتا ہے، مگر مفلوج نہ ہو کر بھی مفلوج ہو جاتا ہے...بس اُس کا سر دیوار سے ٹکا تھا، آنکھیں بند تھیں، سانسیں چل رہی تھیں...اور اُسے دیکھنے والا کوئی نہ تھا۔

پھر اندر ہی اندر ایک حزن کا بادل سا اُٹھا اور وہ پور پور اُس میں بھیگ گیا...اُس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔

منہ پونچھنے کے بہانے رومال سے آنکھ اور ماتھا پونچھنے لگا...ایک بے اَنت حزن اور بے آواز گریہ اُسے اپنے گھیرے میں لے چکا تھا۔

اُس نے چاروں طرف نگاہ کی، دور پر ایک پانی کا مگ نظر آیا، وہ اپنی جگہ سے اُٹھا، مگ سے پانی لیا، منہ دھویا، پھر منہ پونچھ کر سر میں کنگھی کی، تھوڑا پانی پیا۔ اُسی وقت ہال کا دروازہ کھلا، ایک

سپاہی اندر داخل ہوا اور اُسی کی طرف بڑھتا چلا آیا۔

''تم کو صاحب بلا رہے ہیں۔'' سپاہی کا لہجہ نسبتاً نرم تھا۔

''کیا بات ہے؟'' وہ ورانڈے میں بچھی کرسی پر بیٹھے شخص کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ یہ وہی تھا جو جیپ میں آگے بیٹھا ہوا تھا۔

''یہ آپ کو بوتھ کیپچرنگ کی کیا اوشکتا پڑ گئی تھی؟''

''میری عمر بوتھ کیپچرنگ کی ہے؟ میں ووٹ دینے گیا تھا۔''

''تو آپ بھاگنے کیوں لگے تھے؟''

''آپ لوگوں کو دیکھ کر کسی کا ہوش حواس ٹھکانے رہتا ہے؟ اچھا بھلا آدمی گڑبڑا جاتا ہے۔'' اسمٰعیل نے پہلی مرتبہ اپنا لہجہ بحال کرنے کی کوشش کی۔

''خیر جو ہوا، سو ہوا، سب لوگ چوں کہ ڈی ایم صاحب کے حکم پر پکڑے گئے ہیں، اس لیے الیکشن ختم ہونے تک تو رُکنا ہی ہوگا۔ شام میں چلے جایئے گا۔ اپنے کسی آدمی کا پتہ بتا دیجیے کہ اُس کو خبر کر دی جائے۔''

اسمٰعیل نے ایک وکیل کا پتہ بتایا اور ہال میں واپس آ گیا۔ وہ خود بھی سمجھ رہا تھا کہ دن بھر کی سرکاری مہمانی کا انتظام تو اُس نے اپنی ہی بے وقوفی سے کر لیا ہے۔ اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چُگ گئیں کھیت!

وہ تقریباً دو گھنٹے تک ایک انتہائی گھناؤنے اور متعفّن ماحول میں سانسیں لیتا رہا۔ ہال میں موجود دوسرے سارے افراد اِس طرح کھینی ٹھونک رہے تھے اور گانجے کا دَم لگا رہے تھے، کھڑکی کے پاس کی ہوٹل سے چائے ناشتہ منگوا کر کھا پی رہے تھے، گپیں ہانک رہے تھے جیسے اُن کے لیے یہ سارا کچھ بالکل روزمرّہ کا معمول ہو...''

اسمٰعیل کا حال یہ تھا کہ نہ بھوک لگ رہی تھی، نہ چائے کی خواہش ہو رہی تھی، نہ بولنے کو جی چاہ رہا تھا، اور نہ ہی وہ کچھ سننا چاہتا تھا مگر وہ مجبور تھا... جاگنے پر بھی، دیکھنے پر بھی اور سننے پر بھی!

❖

''سار! ہم تو سسرے سپہیا کے ٹیٹوا دبائی دیت، مگر اکھلیش بھیا پکڑ لیتیو۔''

''ارے کا بھئیل، اکھلیش بھیا کچھ بتائن؟ بھیکن پور کا سماچار رہتیو؟''

''اکھلیش بھیا کے بتاوے کا سمئے کہاں ملا... باکی بھیکن پور تو اُہاں ہمار آدمی کر لہس ہوگا۔ بھیکن پور میں کام ہو جئی تے نا تا اکھلیش بھیا کے جیتے سے کونو روکے والا نیکھے۔''

❖

''ارے! آج سانجھی بیلا، روپا رانی کے ہاں چلے کے بانے؟''

''ارے تو ایہاں سے چھوٹل جائی تب نا؟''

''کا رے؟ بھانگ پی گیلے بڑا کا، تو کا، ای سسرے سب ایہاں، تو ہر بیاہ کر کے لائین با کا؟''

''تین بج گئیل۔ ہمار آدمی سب کونو نیکھے آئیل۔''

''تھوڑا کا گج پتّر میں دیر تو ہوئی بے کرے ہے۔ ہم جیپ میں چڑھت رہیں تو مہندوروا دیکھ لہس تھا۔''

❖

اب کی بار اگر سریش جی جیت گئلن تو پٹنہ میں مہیش رام والے کوارٹر پر کبجہ کرے کے با...''

''سسرے... مہیش رام جب ہار جتئی تب نا؟''

''مہیشوا، اب کے گئیل بونٹ لا دے۔''

''کیسے رے؟ ای تیں کئی سے بول رہا ہے؟''

''ڈی ایم واا و کرا سے کھسیائے ہوا ہے نے؟ بیس سوتر یا میں مہیشوا ڈی ایم کے اب کی ٹھینگا دکھا دہس نے؟''

''سب اپنے لے کے بیٹھ گیا۔''

''اے رام جتن بھیا۔ اب کے بیس سوتری راور لے لیہیں۔''

''دیکھل جائی۔ کھالی ہمہو نیکھی بنی نا؟''

''نا ہو رام جتن بھیا۔ اب کے مہیس جی سے کہے کے با۔ ای کونو بات نیکھے بانو کہ جان دیوے اور جیل جائے کہ ہم اور ہمنی کے آدمی اور کرسی سار دُوسر کو؟''

''چپ رہ، چپ رہ۔ جاستی بکر بکر مر کر۔ سمئے آوے پر دیکھل جائی۔''

❖

کیا عام آدمی ایسی گندہ صورتِ حال کو بدلنے کے لیے کچھ نہیں کرے گا؟

کچھ دنوں پہلے کا وہ لمحہ اسمٰعیل کو بہت شدّت سے یاد آیا، جب اس نے یہ سوچا تھا کہ ایک طرح سے وہ ایک ذاتی یا زیادہ سے زیادہ ایک فرقے کی صورتِ حال تھی۔ مگر پھر اسمٰعیل نے خود کو کاٹا۔ کیا بابری مسجد کا گرنا کسی ایک فرقے کا مسئلہ ہے؟ یا قومی سطح پر قانون کے بے بس ہونے کا لمحہ؟ مگر قانون کو بے بس اور لولا لنگڑا تو شاہ بانو کیس کے وقت بھی بنایا گیا۔ زوالِ روس کا سب سے زیادہ خراب اثر یہ ہوا کہ طبیعتوں کا توجیہی اور تجزیاتی مزاج کمزور ہوا اور نظریاتی مباحث میں اختلاف ناممکن ہو گیا۔ عباسیوں کا کمال یہ تھا کہ اُن کے عہد حکومت میں معتزلہ، اشعری، ماتریدی اور ظاہریہ سب مکالمے کی ہمت رکھتے تھے مگر یہ دور تو یزیدی جبر کا استعارہ ہے۔

قومی ہم آہنگی میں دراڑ ڈالنے کی صلاحیت، احساسِ جبر سے زیادہ کسی عنصر میں نہیں ہے۔

میں اسمٰعیل رضا ولد ابراہیم رضا بابری مسجد کے گرنے پر کچھ نہیں کر سکتا، شاہ بانو کیس کی بے معنویت پر اپنے ہم مذہبوں سے کوئی مکالمہ نہیں کر سکتا، الیکشن دیتے ہوئے بلا وجہ گرفتار کر لینے پر اور دن بھر کے لیے حراست میں ڈال دینے پر کچھ نہیں کر سکتا۔

یہاں اجماع چاہیے۔ بھیڑ، جاہلوں کی یا ایسے پڑھے لکھے لوگوں کی جنہیں جاہلوں کی بھیڑ پڑھا لکھا مان لے، یہاں ایک آدمی کی تنہا رائے کا کوئی معنی نہیں بنتا... جمہوریت وہ طرزِ حکومت ہے...

میں کس ڈھلان پہ جا رہا ہوں؟ اسمٰعیل نے خود کو حیرت سے تکا... یزید اور ہٹلر بھی تو ایک آدمی ہی کی مثال تھے!

اچانک اسمٰعیل کی نگاہ سامنے اُٹھ گئی۔

اسمٰعیل کا وکیل دوست ہال میں داخل ہوا... اسمٰعیل تیزی سے اُن کی طرف لپکا۔

چھ گھنٹے میں پہلا شناسا سا چہرہ... طبیعت میں اندر سے اُبال آتا محسوس ہوا۔

''ارے کیا پروفیسر صاحب، کہاں پھنس گئے؟'' وارثی نے اُس سے گلے لگتے ہوئے کہا۔

'ارے پہلے باہر نکالو بھائی۔ باتیں بعد میں ہوں گی۔''

''ہاں ہاں چلیے۔'' وہ اُسے لیے ہوئے تھانہ انچارج کے ٹیبل کے پاس آئے، وہاں ایک

کاغذ پر اُن سے دستخط کرا کے تھانہ انچارج کے حوالے کیا۔ تھانہ انچارج تکلّفاً کچھ تسلّی کے جملے ادا کرنا چاہتا تھا، مگر اسمٰعیل نے دونوں ہاتھ جوڑ کر صرف اتنا کہا، ''اب آ گیا دیجیے۔'' اور اُس کا جواب سنے بغیر دوست کا ہاتھ پکڑے پکڑے تیز قدموں، تھانہ سے باہر آ گیا۔ اور شام کی ٹھنڈی اور کھلی ہوا میں ایک لمبا سانس لیا۔

تھانے سے باہر نکل کر وارثی کچھ بات کرنے اور حال جاننے کے موڈ میں تھے مگر اسمٰعیل کی طبیعت اتنی بوجھل اور مکدّر ہو رہی تھی کہ وہ صرف چپ رہنا چاہتا تھا، پھر بھی مختصراً اپنے پر بیتی سنائی اور اُس کو راستے ہی سے رخصت کر دیا، البتہ رخصت ہوتے وقت اتنا ضرور کہا: ''اس بات کو اپنے تک ہی محدود رکھئے گا۔''

بیوی بچوں نے دیکھا تو اطمینان کا سانس لیا، اسمٰعیل کبھی اورنگ آباد، کبھی پٹنہ کے چکر میں ابھی فون بھی نہیں لگوا سکا تھا، بلکہ سچ یہ ہے کہ کالج میں ابھی تک کاغذی کارروائیاں پوری طرح مکمل ہی نہیں ہوئی تھیں، اس لیے ایڈ ہاک ادائیگی کے طور پر جو مل رہا تھا اُس سے شاید یہ ممکن بھی نہ تھا۔

''گھر سے نکلو تو دن بھر گھر سے رابطہ کٹا رہتا ہے۔'' اس نے سوچا

''کہاں رہ گئے تھے آپ؟ سارا دن گزر گیا۔'' شہوار نے بہت تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔

''ووٹ دینے چلا گیا تھا۔ پھر کچھ اور کام آن پڑا۔'' اسمٰعیل اصل بات چھپا گیا۔

''مگر آپ کا چہرہ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ بالکل جھانولا؟''

''گرمی میں دھوپ کا اثر تو پڑتا ہی ہے۔'' وہ ہنستے ہوئے بولا اور منھ دھونے کے لیے اُٹھ گیا۔

تب تک بیٹی نائلہ دسترخوان پر ناشتہ سجا چکی تھی، اسمٰعیل کو بھی اب بھوک کا احساس زوروں سے ہوا، اس نے سارا ناشتہ ختم کر دیا، چائے پی اور پنکھے کے نیچے بیٹھا تو طبیعت کچھ پرسکون ہوئی۔

اس نے جو گھر کرائے پر لیا، اس میں آنگن بھی تھا، رات میں اُس کی اور بیٹے کی پلنگ آنگن ہی میں لگ جاتی تھی۔ اسمٰعیل اپنی پلنگ پر لیٹا تھا، آنکھوں کے سامنے کھلا آسمان، چاند کی دسویں گیارہویں تاریخ تھی، چاند اپنے عروج پر تھا، چاند کی روشنی میں تارے کم نظر آ رہے تھے، مگر پورا آسمان اپنی تابانی کے ساتھ اُس پر پھیلا ہوا تھا۔

رات گرتی گئی، دالان میں بیوی بیٹی، بغل کی پلنگ پر بیٹا، سب کو نیند آتی گئی، مگر وہ جاگ رہا تھا، وہ کچھ سوچ نہیں رہا تھا، مگر کسی کوشش اور ارادے کے بغیر مناظر جھمکا کے کر رہے تھے... بھیونڈی

کی زندگی، ماں باپ بیوی بچے، تمکنت اور وہ، رُکمنی ...نہیں سادھوی رُکمنی، فسادات، راستے میں
اُس ایرانی کا ساتھ، بھنڈاران والے کی روح سے لگا تار جاری مکالمہ، بمبئی میں مولا علی کی درگاہ،
بہار کا سفر، پٹنہ کی زندگی اور پھر یہ...؟

فسادات کے دوران اُس نے خود کو بے بس محسوس کیا تھا مگر ایسی ذلّت؟

یہ کیوں ہوا؟

میری غلطی کیا تھی؟

کیا ایسا صرف ہندوستان میں ہوتا ہے یا کہیں بھی ہوسکتا ہے؟

اُس نے محسوس کیا، وہ سوالات کے تیروں کی سیج پر لیٹا ہوا بھیشم پتامہ ہے جسے مطمئن کرنے
کے لیے کوئی کرشن میسّر نہیں تھا، اس کی آنکھیں دھندلا گئیں، بار بار اندر اندر ایک بونڈر سا اُٹھا،
بار بار اپنے اِردگرد پھیلے ہوئے ڈرامائی عناصر (رہسّیہ سامگری) سے من اُوبا۔

کہیں سے آواز آئی:

بچ بچ کے راستہ چلنا / تعاقب کر رہے کتوں سے بچنا / یہ پاگل / یہ کوڑھی / بجبجاتے گھاؤ
والے / عفونت سے بھر پور کتّے / بظاہر تو بس بھونکتے ہیں / مگر پاس جانے پہ اُن کی عفونت /
زہر میں بجھائی ہوئی سیف کا استعارہ!

کیا وہ واقعی پاگل کتوں کے گھیرے میں آ گیا ہے—؟؟

فلیش بیک میں جھماکوں کا سلسلہ جاری تھا۔

اسمٰعیل نے بیٹی، نائلہ کا داخلہ بھی اپنے کالج ہی میں کرایا تھا، حالاں کہ کالج میں مخلوط تعلیم تھی،
اسمٰعیل چاہتا تھا کہ نائلہ شہر ہی کے گرلس کالج میں پڑھے مگر تنخواہ کی غیر یقینی صورت حال نے یہ موقع
ہی نہیں دیا کہ وہ کسی دوسرے کالج میں داخلہ کرا پاتا۔

ویسے اسمٰعیل مزاجاً دقیانوسی نہیں تھا۔ شروع ہی سے وہ اپنی عقل سے کام لیتا رہا تھا، اس نے
جب بھی پردے وغیرہ کے بارے میں سوچا تو اُسے یہی احساس ہوا کہ اصل چیز نظر کا حجاب اور دل
کی احتیاط ہے۔ اگر یہ دو صفتیں شخصیت کا حصہ ہیں تو بحرانی لمحات سے بچا جا سکتا ہے۔ مگر حالات
کے تقاضے عجیب ہوتے ہیں۔

فلیش بیک میں جھماکے جاری تھے۔

پندرہ اگست کی تیاری چل رہی تھی۔

بنسی دھر انچارج تھے، نائلہ کا بہت خیال رکھتے تھے، انھوں نے کلچرل فنکشن کی ساری ذمہ
داری نائلہ کو سونپ دی تھی۔ اسمٰعیل کیا کہہ سکتا تھا؟

نائلہ ایک ہفتے سے دن دن بھر کالج میں مصروف رہتی، اوّل تو پندرہ اگست اور اُس پر کالج کا
سلور جبلی سال۔ پچیس سال پہلے پندرہ اگست ہی کے دن کالج کا سنگِ بنیاد رکھا گیا تھا۔ تنخواہ کی
بے ضابطگی کے باوجود دوسرے کالجوں کی بہ نسبت اِس کالج کے اساتذہ نے پڑھنے اور طلبار سے
جڑے رہنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی، اس لیے مجموعی طور پر تعلیمی ماحول میں گراوٹ آنے کے باوجود
پندرہ اگست اور چھبیس جنوری کے مواقع پر طلبار جمع ہو ہی جاتے تھے۔

کالج میں بہت گہما گہمی اور رونق تھی۔

نائلہ نے ساتھیوں کے ساتھ مل کر ڈرامہ، رقص، ضلع کی جھانکی اور کئی قسم کے دوسرے پروگراموں
کا منصوبہ بنایا تھا۔ انچارج اور پرنسپل سے ہر پروگرام کی منظوری بھی لے لی تھی۔ کئی لڑکیاں اور لڑکے
اُس کی ٹیم کا خاص حصہ تھے۔ ان میں اس کی سہیلی شوبھا اور ایک سینئر رمیش بہت آگے آگے تھا۔

رمیش شہر ہی کے ایک اسکول ماسٹر کا لڑکا تھا۔ ماسٹر صاحب کبھی کبھی اسمٰعیل کے گھر بھی آتے
تھے، کبھی اُس کی شام کی مجلسوں میں بھی شریک ہو جایا کرتے۔ سیاسی آدمی نہیں تھے مگر مزاجاً سیکولر
اور گاندھیائی تھے۔ اسمٰعیل نے جب نہ تب یہ بھی محسوس کیا کہ اُنھوں نے بیٹے کی تربیت بھی سلیقے
سے کی ہے۔ رمیش جب بھی ملا، ایک مہذب اور نرم لہجے والا لڑکا محسوس ہوا۔

وہ شعبہ تاریخ ہی کا طالب علم تھا اور اسمٰعیل واقف تھا کہ یہ لڑکا پابندی سے کلاس میں آتا ہے
اور سنجیدگی سے اساتذہ کے لکچرس سنتا ہے۔ نصابی ضرورتوں کے تحت وہ اسمٰعیل کے پاس بھی بار بار
آتا تھا، اسی لیے اسمٰعیل بھی اُس پر توجہ دیتا تھا، اگر کوئی سوال پوچھتا اور کالج میں موقع نہ ملتا تو
اسمٰعیل اُسے گھر بلا لیتا، اس طرح اس کا گھر میں بھی آنا جانا شروع ہو گیا تھا۔

گھر کا جیسا ماحول اسمٰعیل نے بنایا تھا، اس کے تحت اُس کی بیوی بیٹی کسی مخلوط سوسائٹی کا حصہ
تو نہیں تھیں مگر ضرورت پڑنے پر لوگوں سے ملنے جلنے میں اُنہیں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوتی تھی۔
ایک مرتبہ شہوار، اسمٰعیل کی بیوی بیمار پڑی تو رمیش کے ساتھ اُس کی ماں بھی آئی تھیں، کبھی کبھی رمیش
زبردستی گھر کا سودا سلف بھی لے آتا، شہوار کی بیماری کے زمانے میں تو دوا لانا رمیش نے اپنا معمول سا

بنالیا تھا۔ مانو آہستہ آہستہ رمیش گھر کا ایک فرد سا بن گیا تھا۔

''کیا جو کچھ ہوا یا ہو رہا ہے، یہ سب کچھ اس کی مرضی سے ہو رہا ہے؟ مند ہوتی آنکھوں کے ساتھ اس نے سوچا۔

وقت جس طرح اپنے پر پانکھ نکال رہا تھا۔ یہ تو اُس کے تصور میں بھی نہ تھا، شاید زندگی کا حال بھی ''خار پشت'' (ساہی) جیسا ہے جو یوں تو اپنے پر سمیٹے عام سا پرندہ لگتا ہے، مگر جب اپنے پر پھیلاتا ہے تو کانٹوں کا ایک حصار سے اپنے اِردگرد بُن لیتا ہے۔

جو لمحہ گزر گیا اُس میں وقت کے خار پشت نے اس کے اردگرد کانٹوں کا جال سا بُن دیا تھا مگر یہاں جنم جنمانتر کا یارانہ کون باندھتا ہے؟ جب سب گزر گئے تو یہ لمحہ کہاں سے اور کیسے قیامت کی مسور چنے گا؟

''اسے بھی گزرنا ہے۔''

اُس نے ایک سرگوشی سی سنی، لہجہ میاں میر والے کا تھا مگر وہ کہیں محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

''کیا اَب وہ میرے احساس کا حصہ بننے والا ہے؟'' اسمٰعیل کو ہنسی آ گئی۔

اُسی پل اُسے میر صاحب کی وہ عمارت یاد آئی جس کے ملبے میں کسی کا ہاتھ دبا ہوا ہے اور کسی کا پیر، پھر اُسے کرم جان کی کہانی یاد آئی۔ کہانی کا بالکل آخری حصہ!

دور دور تک پھیلے کھیت میں بلند ہوتے سورج کی تیز دھوپ پھیل چکی تھی۔

سامنے ایک سانڈ ایک گائے کو دوڑا رہا تھا، چار چھ سُور گلی کے پاس پھیلی۔ غلاظت میں اپنی غذا تلاش کر رہے تھے، اور گاؤں کا پاگل لڑکا مادرزاد برہنہ کسی طرف دوڑا جا رہا تھا اور پیشاب کیے جا رہا تھا۔''

اسمٰعیل کو یاد آیا، یہ کہانی سن کر اُسے ایک محاورہ یاد آیا تھا: ''جس کی لاٹھی اُس کی بھینس۔''

نیند کی وادی میں اُترتے ہوئے اُس کے ذہن نے پھر دہرایا: ''جس کی لاٹھی اُس کی بھینس... جس کی لاٹھی اُس کی بھینس۔... لاٹھی اور بھینس... مسلمان لاٹھی ووٹ بھینس!''

• • •

12

کالج میں لاٹھی اور بھینس کا ایک نیا معنی سننے کو ملا تھا۔

جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔

میاں کی لاٹھی بیوی کی بھینس۔

گوالوں کی لاٹھی لالو کی بھینس۔

شری متی رابڑی دیوی وزیرِاعلیٰ بہار۔

کالج میں ہنستے ہنستے سب کو ''اچھُّو'' ہو گیا۔

نتیش اور بی جے پی والے شعر پڑھ رہے تھے۔

اپنی خوشی کے ساتھ مرا غم نباہ دو
اِتنا ہنسو کہ آنکھ سے آنسو نکل پڑے

(بعد میں آنسوؤں کو تو نکلنا ہی تھا!)

مگر فورتھ فیز (4th Phase) کے لکچرر صاحبان کے پاس تو رونے کے لیے بھی کچھ نہیں تھا۔ جگن ناتھ مشرا کے وقت سے کالجوں کو کانسٹی چیونٹ کرنے کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ لالو کے وقت تک جاری رہا اور وہ جو کہتے ہیں کہ ''ماریں گے مگر رونے بھی نہیں دیں گے'' تو کچھ ایسا ہی سلوک اساتذہ کے ساتھ تمام حکومتیں کرتی آئیں، نتیجتاً فورتھ فیز کے اساتذہ ریڈر اور پروفیسر تو کیا ہوتے وہ تو اپنی لکچرشپ بھی نہیں بچا پا رہے تھے۔ ایسے سیکڑوں اساتذہ تھے جن کا کوئی پوسٹ نہیں تھا یا عہدہ کوئی دوسرا انکروچ کر چکا تھا۔ اس لیے رابڑی نے جو تیر چلایا، اُس نے یونیورسٹی ہیڈ کوارٹر سے تھرڈ فیز (3rd Phase) تک کے اساتذہ کو سیدھے نشانے پر لیا۔

بس ایک حکم نامہ ''مانو کہ آپ کی پرونتی ہوئی ہی نہیں۔''

مان لیجیے کہ آپ کی ترقی ہوئی ہی نہیں۔

بس ایک ''یک سطری حکم نامہ'' صادر ہوا اور اُس کے بعد صورتِ حال یہ ہوئی کہ سارے اساتذہ یونیورسٹی ہیڈ کوارٹر سے سکریٹریٹ اور اسمبلی تک چلاتے رہے، بلبلاتے رہے، منمناتے رہے'' سر دیکھئے کاغذ دیکھئے، یہ وائس چانسلر کا آرڈر ہے، یہ محکمہ اعلیٰ تعلیم کا سرُکلر ہے، یہ ہائی کورٹ کا فیصلہ ہے، میں ریڈر ہوں، میں پروفیسر ہوں۔''

اور ہر جگہ اُنہیں بہت ادب و احترام سے سمجھایا جاتا رہا: ''سر! مان لیجیے کہ آپ کا پرموشن ہوا ہی نہیں!''

یہ وہ زمانہ تھا جب فورتھ فیز والے تھوڑا سا ہنسنے کا پہلو بھی پیدا کر لے رہے تھے۔

کالج میں بات چلی تو اس نئے حکم نامے تک پہنچ ہی گئی۔

''مگر ایسا آرڈر آخر کیوں نکلا؟''

''کیوں کہ پچھتّر پرسنٹ پرموشن میں گڑبڑ گھٹالا ہے۔''

''لو، یہ آروپ تو ہم لوگوں پر لگتا ہے، وہ لوگ تو دودھ کے دُھلے ہیں۔''

''ہاں دودھ کے دُھلے تو ہیں مگر لالو کی بھینس کے دودھ سے دھوئے گئے ہیں۔''

''اور رابڑی جانتی ہیں کہ اُس دودھ میں دودھ کتنا ہے اور پانی کتنا۔''

''ہاہاہاہا۔''

''مگر وہ تو کہتے ہیں ہم دُھلے دھلائے ہیں۔''

''ہاں ہاں کیوں نہیں۔''

پروفیسر گھنشیام قہقہہ لگا کر ہنسے، ''کسی کی زبان پر کوئی روک ٹوک ہے جس کا جو جی چاہے بولے مگر یہ تو جگ جانتا ہے کہ تھرڈ فیز میں دو طرح کے ٹیچر ہیں۔ ایک تو وہ ہیں جن کو کمیٹی نے اُس سمئے نیُکت (مقرر) کیا جب کالج افلیئیڈ تھا۔ اُس میں سچ ہے کہ جو لوگ آئے وہ جاہل نہیں تھے، مگر کانسٹی چیونٹ ہوتے ہی سمئے تو وہاں بھی ویسی ہی ہوڑ لگی۔ ایک سے ایک جاہل گھسا اور جاہل تو جاہل کاغذ پتّر صحیح نہیں ہے۔''

''یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟'' اسمٰعیل نے سوال کیا۔

''سر! بہت گھپلا ہے، کسی کی پی ایچ. ڈی. ۱۹۸۵ء کی مگر اُس کو سینئریٹی اُس سمئے سے ملی جب اُس کا رجسٹریشن ہوا، کسی کا اپوائنٹمنٹ لیٹر جس تاریخ کا ہے اُس تاریخ میں اُس کا ریزلٹ نکلا ہی

نہیں تھا۔ پوچھو تو کہے گا ''میں امتحان تو دے چکا تھا، اور جب ریزلٹ آیا تو میں پاس بھی کر گیا۔ پی ایچ. ڈی. کی ڈگری ریڈر میں کام آ گئی۔ اُس ڈگری کو چھپوا کے پروفیسری لے لی۔

یہ تو ایک منظر تھا، دوسرا منظر اُس وقت سامنے آیا جب اُس کے دو ملنے والے سکریٹریٹ گئے۔

دونوں اپنے کام کے سلسلے میں سکریٹریٹ گئے تھے، مگر جس ٹیبل پر دونوں کا کام اٹکا ہوا تھا اُس ٹیبل کا بڑا بابو ساڑھے بارہ بجے تک آیا ہی نہیں۔ دونوں نے یہ اطمینان بھی کرنا چاہا کہ اگر بابو کی چھٹی کی درخواست آ گئی ہو تو دونوں لوٹ جائیں مگر بڑا بابو بڑے تیقّن سے بولا: ''نہیں بھائی! چھٹی کی درخواست نہیں ہے، وہ آئیں گے۔''

بڑا بابو کے یہ کہہ دینے کے بعد رُکنے کے علاوہ چارہ کار کیا تھا؟

سیماب اور توفیق دونوں نے نو صبح ہی ٹرین پکڑی تھی۔ اس ٹرین کا پٹنہ پہنچنے کا وقت بہت صحیح تھا۔ دفتر پہنچنے کے آس پاس ٹرین پہنچ جاتی تھی۔ مگر ٹرین اپنے وقت سے دو گھنٹہ تاخیر سے پٹنہ پہنچی۔ نتیجتاً دونوں بھاگم بھاگ سکریٹریٹ پہنچے، کہیں ایک گلاس پانی پینے کا موقع نہیں مل سکا لیکن سکریٹریٹ پہنچ کر ساری بھاگ دوڑ بے معنی محسوس ہونے لگی۔ ٹیبل پر وہ بابو تھا ہی نہیں جس سے دونوں کا کام اٹکا تھا۔

ہال کے ایک کنارے، ایک بڑا سا ٹیبل لگا ہوا تھا، اُس پر ایک آدمی بہت بھرے پُرے انداز میں بیٹھا نظر آیا۔ دوسری میزوں کی بہ نسبت اُس ٹیبل کے اِردگرد کرسیاں بھی زیادہ تھیں۔ اندازہ ہوا کہ بڑے بابو ہی ہوں گے۔ دونوں نے اُن کے پاس جا کر اپنے ٹیبل والے بابو کے بارے میں پوچھا تو اُنہوں نے گویا یقین دلایا کہ ''وہ آئیں گے۔'' اس اُمید پر دونوں کچھ دیر ٹہلتے رہے۔

گیلری میں دو رویہ کمرے تھے، ہر کمرے پر خوب صورت اور قیمتی پردہ ٹنگا ہوا تھا، دروازے پر چپراسی، کمرے کے اندر سے اے. سی. یا کولر چلنے کی آواز، کبھی کبھی اندر سے کوئی باہر آتا تو دروزے کا پردہ ذرا ہٹتا، ایسی ہی کسی ایک ساعت میں توفیق نے ایک کمرے کے اندر جھانکا، ایک بہت ہی خوبصورت چم چم کرتا ٹیبل جس پر خوب صورت ٹیبل کلاتھ اور اُس کے اوپر شیشہ، سامنے صاحب سوٹ ٹائی میں ملبوس، صاحب کے مقابل کچھ لوگ ریشہ خطمی ہونے کے پوز میں، گفتگو جاری تھی مگر کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا، کمرہ روشن تھا پھر بھی کچھ دھند کی کیفیت تھی۔

''یار! اندر تو بڑی پُراسراری فضا ہے۔'' توفیق مسکرا کر بولا۔

''بابو، صاحب کا کمرہ ہے، میرا تمھارا تھوڑے ہی ہے۔'' سیماب نے بہت آہستہ سے کہا۔

دونوں کچھ دیر اسی طرح ٹہلتے رہے، اِدھر اُدھر دیکھتے رہے، ڈیڑھ بجے کے قریب دونوں بڑا بابو کے پاس پھر گئے۔ ''سر! اُن کے بارے میں کچھ خبر ملی؟''

بڑے بابو نے بہت اُکتائی اُکتائی نظروں سے دونوں کو دیکھا، اور پھر اُس سے زیادہ اُکتائے ہوئے لہجے میں بولے: ''جہاں آپ وہاں ہم، کھبر کیسے ملے گی؟''

سیماب توفیق کے پاس چپ ہو جانے کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔ مگر اتفاق سے اُسی وقت ایک اور صاحب بڑا بابو کے پاس آ گئے تو بڑے بابو نے اُن سے پوچھ لیا:

''ارے بھائی، گپتا جی! یادو کی کوئی کوئی سوچنا ہے؟ آئے گا کہ نہیں؟''

''یادو جی آ گئے ہیں۔'' اُس آدمی نے لپک کر جواب دیا۔

''کہاں ہے؟''

''تِنک منترالئے گئے ہیں، آتے ہی ہوں گے۔''

''اِدھر سے ہو کر جاتا۔ جواب دیتے دیتے آدمی کا بھیجا پک جاتا ہے۔'' بڑے بابو کی آواز بہت تھکی تھکی تھی۔

توفیق سیماب اِس کے بعد وہاں ٹھہرے نہیں۔ دونوں کو بھوک بھی شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔

دونوں پاس کی ایک ہوٹل میں چلے آئے۔ راستے ہی میں بات چل نکلی۔ تو چلتے چلتے امن و قانون کا مسئلہ زیرِ بحث آ گیا۔ اس پر توفیق نے بسکٹ کا ایک ٹکڑا منھ میں ڈالتے ہوئے کہا:

''شکر ہے کہ اَب یہاں ہندو مسلمان فساد نہیں ہوتا۔''

اُسی وقت سیماب کو پانی سرک گیا تھا اور وہ کھانستے کھانستے بے حال ہو گیا تھا۔

کھانسی رُکی تو اس کی نظر گھڑی پر گئی۔ ڈھائی بج رہے تھے۔

''چلو، چلو۔ اب بابو آ گیا ہوگا۔'' سیماب کرسی چھوڑ کر اُٹھ کھڑا ہوا، توفیق نے بھی اُس کا ساتھ دیا۔

دونوں ہال میں پہنچے تو دونوں کی باچھیں کھل گئیں۔ بابو کرسی پر بیٹھا ہوا کوئی فائل دیکھ رہا تھا۔

سیماب نے دور سے ہی آداب کرنا چاہا مگر خیال آیا کہ پہلے کی کوئی بے تکلّفی کیا، اس سے تو کوئی جان پہچان بھی نہیں ہے۔ توفیق کا انداز ٹیبل کے پاس پہنچنے تک بہت محتاط رہا۔ دونوں ٹیبل کے پاس پہنچ کر کھڑے ہو گئے۔

بابو فائل دیکھتا رہا۔ توفیق ذرا سا کھنکارا بھی، تس پر بھی بابو فائل دیکھتا رہا۔

سیماب نے ذرا زور سے لیکن مہذب انداز میں کہا: ''یادو جی! نمستے!''

یادو جی نے ہاتھ کے اشارے سے جواب دیا، مگر نگاہ فائل پر ٹکی رہی۔

''ہم لوگ ڈہری آن سون سے آئے ہیں۔'' توفیق بولا۔

''ہم لوگ تو گیارہ بجے یہاں پہنچ گئے تھے...'' اتنا کہہ کر سیماب رُک گیا تھا۔

''آپ شاید منترالیہ میں تھے۔'' توفیق نے بابو کی غیر حاضری کو ذرا خوب صورت اور پُروقار بنا دیا۔

''ہم لوگوں کی فائل آپ کے یہاں ہے۔''

''کون سی فائل—؟'' یادو جی نے سر اُٹھائے بغیر پوچھا۔

''چھٹی بغیر تنخواہ کی۔ منظوری کے لیے آئی ہے۔''

''کہاں سے آئی ہے؟''

''ٹاؤن اسکول، ڈہری سے۔''

''نہیں! یہاں کوئی فائل نہیں ہے۔''

'یادو جی! دیکھئے نا، وہاں کا ڈسپیچ نمبر اور تاریخ یہ ہے۔'' توفیق نے جلدی سے ایک کاغذ بڑھایا۔

''وہاں کے ڈسپیچ اور تتھی سے ہم کو کیا لینا دینا، یہاں پہنچنا چاہیے۔'' اب کے یادو جی نے سر اُٹھایا۔

''جب لیٹر وہاں سے بھیجا جا چکا، بھیجے ہوئے پندرہ دن ہو گئے۔ آپ ہی کے یہاں اُسے آنا ہے۔ تو پھر وہ کہاں جائے گا؟'' سیماب چپ نہ رہ پایا۔

''آپ لوگ تو ایسی بات کرتے ہو کہ آشچریہ (تعجب) ہوتا ہے۔'' بابو بہت تیکھے لہجے میں بولا

''کہ آپ لوگ شکچھک کیسے بن گئے۔''

سیماب اور توفیق دونوں اندر سے کھول گئے، مگر چپ رہنے کے علاوہ چارہ کیا تھا؟

''کرپا کر کے یہی بتا دیجیے کہ کہاں ہو سکتی ہے؟'' توفیق بہت آہستہ سے بولا۔

''لادو دو، لدوادو، لدوا کے گھر پہنچا دو، یہی کر رہے ہیں آپ لوگ۔'' بابو بغل والے ٹیبل پر بیٹھے ساتھی کی طرف دیکھ کر بہت زور سے ہنستے ہوئے بولا۔ ''جب آپ لوگ کو اتنا بھی گیان نہیں تو آپ لوگ سچیوالیہ (سکریٹریٹ) آئے کا ہے کو؟''

اندر اندر جھنجھلا کر سیماب اور توفیق دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا، شاید دونوں نے کچھ کہنا بھی چاہا، مگر دونوں کچھ نہ کہہ سکے...

یادو جی پھر فائل دیکھنے میں مگن ہو گئے تھے۔

''یادو جی!'' توفیق نے عجب انداز میں بابو کو مخاطب کیا۔

توفیق کے منھ سے آواز نکلی تو سیماب نے بڑی تاسّف بھری نگاہ توفیق کے چہرے پر کی۔

اُسے صاف محسوس ہوا کہ اتنا کہنا سے پہلے توفیق نے تھوک نگلا ہے۔

پھر سیماب بھی ''یادو جی!'' کہہ کر رُک گیا، لگا جیسے اپنے الفاظ تول رہا ہو، پھر ذرا رُک کر بولا، ''ایسا ہے کہ سچیوالیے کی کاریہ پرنالی کا (کام کرنے کا طریقہ) ہمیں ٹھیک ڈھنگ سے معلوم نہیں، تنِک آپ مارگ درشن کر دیجیے۔''

اِس بار یادو جی نے گردن اُٹھائی اور بولے: ''ہرڈاک ڈسپیچر کے یہاں سے ٹیبل پر آتی ہے۔ ڈسپیچر کے یہاں دیکھیے۔''

اُن کا موڈ ابھی بھی ٹھیک نہیں لگ رہا تھا، مگر آواز ذرا نرم اور مہربانی جھلکاتی محسوس ہو رہی تھی۔

اب یہ ہمت نہیں ہوئی کہ اُس سے پوچھتے کہ ڈسپیچر کہاں بیٹھتا ہے، دونوں نے ٹیبل کے پاس کھڑے کھڑے ہی پورے ہال پر ایک طائرانہ نگاہ دوڑائی تو ایک کونے میں ایک آدمی بہت سے لفافے لیے بیٹھا نظر آیا، وہ ایک آفس ڈائری پر کچھ لکھ رہا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو نگاہوں سے اطمینان دلایا کہ ڈسپیچر وہی ہے۔ دونوں دوڑے دوڑے ڈسپیچر کے پاس گئے۔ اُس کا رنگ ڈھنگ بھی یادو سے کم نہیں تھا مگر جب پچاس روپیہ اُس کی جیب میں گیا تو اُس نے رجسٹر دیکھ کر بتایا کہ ''یہ چٹھی تو دس دن پہلے یادو جی کے یہاں چلی گئی۔''

دونوں بابو کے پاس آئے اور بڑے ادب سے بولے: ''یہ چٹھی تو دس دن پہلے آپ کے

یہاں آ چکی۔''

''بلائیے، ہری داس کو بلائیے۔'' یادو جی نے بالکل حکم دینے کے انداز میں کہا۔

جب دونوں نے ہری داس کے پاس جا کر یادو جی کا پیغام سنایا تو اُس نے وہیں سے پکار کر کہا: ''ہاں یادو جی! چٹھیا (چٹھی) تو ستر ہے (سترہ ہی) کی تَتھی میں آپ اَصول (وصول) کیے ہیں۔''

''تنِک ٹھہریے... دیکھتے ہیں۔'' اتنا کہہ کر یادو جی پھر فائل دیکھنے لگے۔

سیماب اور توفیق ٹیبل کے پاس کھڑے رہے، یادو جی پھر فائل دیکھتے رہے... دیکھتے رہے..

''ارے رے رے... یہ مادر...'' فائل کے ایک صفحہ پر نظر پڑتے ہی یادو جی کے منھ سے ماں کی گالی نکلتے نکلتے رہ گئی، وہ جیسے خوشی سے اُچھل پڑے اور فائل لیے ہوئے بڑا بابو کے ٹیبل کی طرف دوڑے اور فائل بڑا بابو کے ٹیبل پر، بڑے بابو کے سامنے پٹخ کر زور سے بولے:

''دیکھل جائی (دیکھا جائے) اِکرا میں لکھل با کہ نا ہیں (اس میں لکھا ہے کہ نہیں) کہ...''

وہ فائل میں لکھی کسی خاص بات پر انگلی رکھے ہوئے تھے، اور اُس خاص بات یا نکتے کے بارے میں زور زور سے بولے چلے جا رہے تھے۔

بڑا بابو ''سنئے تو... سمجھئے تو... اُس کے آگے پڑھیے تو...'' کہے جا رہے تھے۔ مگر یادو جی تو اپنی دُھن میں مگن تھے اور زور زور سے بولے جا رہے تھے۔

یادو جی اپنی دُھن میں مگن تھے، اُسی دھن میں وہ بڑا بابو کے ٹیبل سے... ''ہم تو اِکرا کے منتری جی کے دکھائب... جرور دکھائب... ایک دم دکھائب...'' کہتے ہوئے بلکہ رَٹتے ہوئے ہال سے باہر نکل گئے۔

بڑا بابو ''سنئے تو... سمجھئے تو... یادو جی رُکیے تو...'' کرتے رہے مگر یادو جی یہ جا وہ جا!

سیماب اور توفیق دونوں ہال کے بیچوں بیچ کھڑے تھے، اور دیوار گیر گھڑی کا گھنٹے والا کانٹا چار پر ٹکا تھا۔

دس پندرہ منٹ بعد لوگ اپنی اپنی کرسیوں پر سے اُٹھنے لگے۔ ساڑھے چار بجتے بجتے پورا ہال خالی ہو گیا۔ توفیق اور سیماب پانچ بجے تک اندر باہر کرتے رہے، مگر سوا پانچ بجے جب چپراسی تالا لگانے آ گیا تو اُن دونوں کو بھی باہر آنا پڑا۔

سیماب نے اسی جوکھم کا ذکر کرتے ہوئے توفیق کی وہ بات بھی دُہرائی تھی کہ ''اب یہاں ہندو مسلم فساد نہیں ہوتا۔'' اور اِس بات پر اسمٰعیل کو ممبئی کا ملنگ دوست یاد آیا تھا، جس نے بہار لوٹنے کا مشورہ دیتے ہوئے کہا تھا کہ ''بہار ایک پُرسکون صوبہ ہے۔ وہاں فرقہ وارانہ فساد نہیں ہوتا!'' کیا انسانی سروکار میں سب سے بڑا عنصر جینا ہے—؟''

پاگل، مفلوج اور مندبُدھی والے بھی تو جیتے ہیں!

❖

شہر میں خانہ بدوشوں کا قافلہ اُترا ہوا تھا۔

نہیں...شہر میں نہیں، وہاں جہاں اُن کے خیمے گڑے ہوئے تھے۔

دن بھر کے تمام ہنگاموں کے بعد جہاں جا کر وہ پناہ پکڑتے تھے۔

اُس جگہ کے بارے میں کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ کئی افراد نے اُن سے اُن کے ٹھہراؤ کے بارے میں پوچھا بھی تو وہ ہنس کر ٹال گئے۔ کئی منچلوں نے تو اُن کا تعاقب بھی کیا لیکن واپس آکر اُنھوں نے یہ حیرت ناک کہانی سنائی کہ جہاں سے شہر ختم ہوتا ہے، اُس کنارے تک پہنچتے پہنچتے یہ تمام افراد، اُن کے تماشوں کی پٹاریاں، اُن کے چھوٹے بڑے جانور، اُن کے مختلف طائفوں کے لڑکے لڑکیاں، بڑے اور چھوٹے، جوان اور بوڑھے، عورتیں اور مرد سب اچانک غائب ہو جاتے ہیں، پتہ ہی نہیں چلتا کہ اُنھیں زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔

اوّل اوّل تو سب نے یہ بات بہت حیرت سے سنی۔ پھر بڑے بوڑھوں نے یہ کہہ کر نوجوانوں کو مطمئن کر دیا کہ جیسے دن میں وہ سب کی نظریں باندھ کر، سب کی نظروں کے سامنے کسی لڑکے کے سینے میں چھری گھونپ دیتے ہیں، مگر سچ مچ تو اُس لڑکے کو کچھ نہیں ہوتا۔ یا جس طرح چادر سے ڈھانپ کر کوئی چیز یا کوئی بچی غائب کر دیتے ہیں، اُسی طرح شہر سے باہر جاتے ہوئے اور نکلتے ہوئے بھی وہ پیچھا کرنے والوں کی نظریں باندھ دیتے ہوں گے کیوں کہ یہ بات تو کسی کے لیے بھی خطرناک ہو سکتی ہے کہ شہر کے کچھ بااثر، دولت مند، طاقت ور اور خوب صورت جوان لڑکے کسی ایسے جتھے کا تعاقب کریں جس میں خوب صورت عورتیں اور جوان لڑکیاں بھی شامل ہوں۔

فوراً فوراً تو یہ دلیل کچھ دل کو لگی لیکن بعد میں تمام لوگوں کو اور خصوصاً نوجوانوں کو بے حقیقت

معلوم ہونے لگی، کیوں کہ ایک آدمی کو تو جادو کے زور سے شاید غائب کیا جا سکے، مگر پورے کے پورے طائفے کا اپنے سارے سامان کے ساتھ نظروں سے اوجھل ہو جانا نظر بندی سے کچھ آگے کا معاملہ محسوس ہوتا ہے۔

دوسری طرف طائفے والے عوام کی اس ذہنی کشمکش سے ناواقف تھے یا واقف ہو کر بھی ناواقف نظر آنے کا پوز دے رہے تھے، سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیوں کہ ہر صبح خانہ بدوشوں کے مختلف طائفے شہر کے مختلف محلوں میں پھیل جاتے اور اُن کا کھیل شروع ہو جاتا ہے۔

کسی کے پاس ایک بندر اور ایک بندریا ہوتی، بندر اور بندریا کا مالک، ڈگڈگی بجاتا اور لڑکے دوڑتے ہوئے گھروں سے باہر آ جاتے...کسی طائفے کے پاس بھالو ہوتا اور وہ بھالو کے نت نئے تماشے لوگوں کو دکھاتا...ایک طائفہ جس میں کچھ زیادہ لڑکے لڑکیاں تھیں، نٹ گری اور جگلری کے کرتب دکھاتا، بانس کی لمبی لمبی کمانچیاں پیروں میں باندھ کر بونے بھی نو فٹے نظر آنے لگتے، لڑکیاں دو بانسوں کے بیچ رسّی باندھ کر، سر پر چار چار گھڑا رکھ کر رسّی کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چلتی نظر آتیں اور اُن کے نیچے دہہ دہہ آگ دہکتی رہتی کہ اگر گریں تو اُسی آگ میں جل کر راکھ ہو جائیں، لڑکیاں چلتی رہتیں اور دیکھنے والوں کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا سانس نیچے اٹکا رہتا...پھر ایک طرف چھوٹے چھوٹے لڑکے دس دس بارہ بارہ فٹ لمبے بانس پر چڑھ کر اُلٹے سیدھے ہو کر اپنے کرتب دکھاتے اور دیکھنے والوں کے منھ سے حیرت و استعجاب بھری ''سی سی'' نکلتی رہتی...جگلر پہلے اپنا خالی منھ دکھاتے، پھر منھ بند کر لیتے اور دوبارہ جب منھ کھولتے تو منھ سے شعلے نکلتے...ایک طائفہ اپنے ہی لڑکے کے گلے پر چھری پھیر دیتا، لڑکا تڑپتا رہتا اور خون کے فوارے چھوٹتے رہتے...پھر کسی لڑکے کو چادر سے ڈھانپ دیتا، اور جب چادر اُٹھاتا تو زمین خالی ملتی، لڑکا وہاں پر نظر نہیں آتا۔

شروع کے دنوں میں اِسے کوئی خاص اہمیت نہیں دی گئی، اور بچے بھی اُن مداریوں، نٹوں اور جگلروں کے پاس اپنے فاضل وقتوں میں ہی پہنچتے تھے، لیکن آہستہ آہستہ یہ منظرنامہ بدلنے لگا، ایک طرف جہاں طائفے والوں نے جگلری کے نئے نئے مظاہرے دکھانے شروع کیے، وہیں دوسری طرف اُن سبھوں کے اِرد گرد حاضری کا تناسب بھی بڑھتا گیا۔ تماشا اتنا دلچسپ ہوتا گیا کہ لڑکے تو مدرسوں کا راستہ بھولنے ہی لگے، اساتذہ کو بھی مدرسوں اور اسکولوں سے زیادہ طائفہ یاد آنے لگا۔

لوگوں کا ازدہام اُس وقت سے زیادہ بڑھنے لگا، جب اُن کی خوب صورت عورتوں اور لڑکیوں نے دل کھول کر اپنی صلاحیت کا مظاہرہ شروع کیا۔

خیمے سے بکنی پہنے ہوئی گداز بدن کی عورتیں اور لڑکیاں میدان میں آتیں اور سسکاریوں اور سیٹیوں کے آگے کوئی لفظ سنائی نہیں دیتا اور طائفے کے مرد مسکرا کر اُن کی ہمت افزائی کرتے رہتے۔ یہ ایک نئی صورتِ حال تھی اور اس کا لطف لینے میں چھوٹے بڑے کی کوئی قید نہیں تھی۔

نتیجتاً وہ ہونے لگا جس کے ہونے کے بارے میں کسی نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ یہ بات تو سبھی نے محسوس کی تھی کہ لڑکوں کا زیادہ وقت طائفے میں گزر رہا تھا اُن کی زیادہ دلچسپی بندر، بھالو، مداری اور جگلر میں ہو رہی تھی اور کتابوں میں دلچسپی کم سے کم ہوتی جا رہی تھی۔ اس بات پر ماں باپ، سرپرست اور اساتذہ سبھی نے اُن کی سرزنش کی تھی اور سمجھایا تھا کہ جس کا جو کام ہو اُسے وہی کام کرنا چاہیے۔ لڑکوں نے اِس نصیحت کا کتنا اثر قبول کیا کتنا نہیں کیا اِس کی جانچ پرکھ سے پہلے ہی سارا منظر نامہ اُلٹ پلٹ ہو گیا۔

اساتذہ بھی درس دینے کے بجائے تماشہ دیکھنے میں محو ہونے لگے بلکہ اُن میں سے بعضوں نے تو یہ کرتب خود بھی سیکھنے اور تماشائی کے بجائے تماشے کا حصہ بننے کی خواہش ظاہر کی۔ خانہ بدوشوں نے اساتذہ کی یہ درخواست ہنسی خوشی قبول کی۔ عورتیں ہنسیں اور مرد خوش ہوئے، پھر یوں ہوا کہ دن کا ایک مخصوص حصہ اِن لوگوں کو جگلری سکھانے کے لیے مخصوص کر دیا گیا۔

شروع کے کچھ دنوں میں عوام نے اور خصوصاً حویلیوں اور کوٹھیوں والے شرفا نے خانہ بدوشوں کی کرتب بازی کے اِس نئے پہلو پر اپنی ناپسندیدگی ظاہر کی، مگر پانی ڈھلان کی طرف مڑ چکا تھا۔ جگلری کے تماشے میں جگلر بننے کی خواہش رکھنے والوں کی تعداد رفتہ رفتہ بڑھتی گئی۔ اساتذہ کے علاوہ مختلف شعبہ ہائے حیات سے تعلق رکھنے والے افراد جگلری کے اِس عمل میں جگلروں کے شریکِ کار بنتے گئے۔ منشی، مزدور، سوداگر، برسرِ روزگار، بیکار سبھی اپنا زیادہ سے زیادہ وقت جگلری اور مداری پن سیکھنے میں استعمال کرنے لگے۔

پھر یوں ہوا کہ گھروں کا سودا سلف ختم ہونے لگا...

بیویوں کی ساریاں اور بہنوں کے دوپٹے پھٹنے لگے...

بیمار ماں باپ کے سرہانے دواؤں کی خالی شیشیوں کی تعداد بڑھنے لگی...

بچے اور نوجوان تو پہلے ہی سے والا وشیدا اور عادی ہو چکے تھے، اب باپوں اور سرپرستوں کی دلچسپی نے اِس کھیل کا رنگ اور چوکھا یا تیکھا کر دیا۔ گھروں میں کوئی پوچھنے والا نہ رہا، پس درس گاہوں میں طلبا کی تعداد تو گھٹنے ہی لگی، طلبا کے غائب ہونے سے اساتذہ کو بھی بہانہ مل گیا۔ وہ بھی درس گاہوں میں صرف حاضری بنانے کے لیے آتے اور حاضری بنا کر طائفوں کی طرف دوڑ پڑتے۔ جب اساتذہ اور طلبا رخصت ہوئے تو کتاب دار (لائبریرین) کیا کرتا؟ جب تینوں نہ رہے تو منشی کا کیا مصرف باقی بچا؟ اور جب سب رخصت ہو گئے تو چپراسیوں کے سر میں بھی سودا سمایا۔

گزشتہ کچھ دنوں پہلے تک کی اطلاعات یہ تھیں کہ سارا شہر جگلروں اور مداریوں کا عقیدت منداور دل دادہ بلکہ دیوانہ ہو چکا تھا، عوام اور خواص، نام نہاد شرفا اور بدنامِ زمانہ لفنگے، اساتذہ اور شاگرد، باپ اور بیٹے، پروفیسر، ڈاکٹر، انجینئر، طبلہ بجانے والے، بکری چرانے والے، مسجد و مدرسہ کا چندہ جمع کرنے والے، رکشہ چلانے والے، بھیک مانگنے اور مدد کے نام پر قرض لے کر عیش کرنے والے، برسرِ روزگار اور بیکار ساری خلقِ خدا نے اپنے اپنے اصل کاموں سے منھ موڑ کر جگلروں اور مداریوں کی جگلری اور مداری پن دیکھنے، پسند کرنے، متاثر ہونے اور اُن جیسا جگلر یا مداری بننے کی کوشش کرنے کا سبق سیکھ لیا ہے۔

اور بالکل تازہ ترین خبر یہ ہے کہ وہ جگلر اور مداری اُس شہر سے کسی اور شہر کو رخصت ہو چکے ہیں مگر شہر کے مداری پن میں کوئی کمی نہیں ہوئی ہے بلکہ کچھ نہ کچھ ترقی ہو ہی رہی ہے۔ دُنیا کے نقشے میں نہ اُس شہر کا تذکرہ ہے جہاں وہ تھے، نہ اُس شہر کا نشان ملتا ہے جہاں وہ گئے !!

❖

مگر یہ تمثیل مجھے کیوں یاد آئی؟

اس تمثیل کے ذریعہ میرا اپنا آپ مجھے کن جہانوں کی جانب لے جانا چاہتا ہے؟ اس تمثیل میں جو اشارے کیے گئے وہ کچھ نئے تو نہیں ہیں۔ مہاما یا پرشاد سے لالو پرشاد تک، ۱۹۶۸-۶۹ء میں بیسویں صدی کے اختتام تک کانگریس کی مخالفت نے یا ایک مضبوط اقتدار کو اُکھاڑ پھینکنے کی خواہش یا ہوس نے ملکی پیمانے پر بھی تو ایسے بہت سے تماشے دکھائے۔ راج نرائن، وی. پی. سنگھ، سارے سوشلسٹوں کی چھٹپٹاہٹ، دوسری طرف کمیونزم کے زوال کے سبب مذہب اور فرضی ہندو مسلم

تہذیب و تشخص کا شوشہ چھوڑ کر مختلف ہندو مسلم جماعتوں اور اِداروں کا تمام ہندوستانیوں کو الگ الگ خانوں میں بانٹنے کا مداری پن، جو بظاہر تو مداری پن محسوس ہوتا ہے، مگر آج جب اِس مداری پن کے نتائج پر نگاہ جاتی تو ایک خوف ناک اور ہول ناک صورتِ حال سر اُٹھاتی نظر آتی ہے۔

شاید اس تمثیل میں اس سارے بھیانک پن کے انکھوئے چھپے ہوئے ہیں۔

یہ انکھوئے گزشتہ دس پندرہ برسوں میں آہستہ آہستہ انکرے اور اَب اُن کے پھل پھول گلاب، بیلا، جوہی، چمیلی کی خوشبو پر حاوی ہوتے جا رہے ہیں۔

اسمٰعیل کو اپنی سائیکی پر خود ہنسی آ گئی، اُسے گلاب، بیلا، جوہی، چمیلی، کے نام پر باغ یاد آتا، جہاں رنگ برنگے پھول مل جل کر ایک باغ بناتے۔

اسمٰعیل نے اپنے آپ کو سخت ذہنی خلجان میں گھرتا محسوس کیا۔

کیا کسی ایک ہی پھول کی چھبن بغیہ کو زیب دیتی ہے؟

کیا آدمی کو، کم از کم ہندوستان کے آدمی کو اِن رنگ برنگے پھولوں کی اب کوئی ضرورت نہیں ہے؟

کیا سچ مچ کسی ایک پھول اور خوشبو کے علاوہ باقی سارے پھول اور خوشبوئیں صرف باہر سے برآمد کی ہوئی ہیں؟

کیا اس رویے اور رُجحان کے بغیر جینے کی کوئی اور راہ بھی ہے؟

اِن دنوں اسمٰعیل ایک عجیب بات محسوس کر رہا تھا۔ کالج سے اُس کا جی اُچٹنے لگا تھا۔ گزشتہ پندرہ برسوں میں اُس نے نوکری کے نام پر جو جو تماشے دیکھے وہ اُس کا جی کھٹّا کرنے کے لیے شاید بہت کافی تھے۔ اُسے یاد آیا، شروع شروع جب اُس نے نوکری جوائن کی تھی تو کیسا ولولہ اُس کے جی میں تھا۔ دونوں کام آگے پیچھے ہوگئے تھے، نوکری اور شادی بھیونڈی، مالیگاؤں، ممبئی پورا مہاراشٹر چھوڑ کر جب وہ بہار سے جڑا تھا تو اُسے اُمید نہیں تھی کہ وہ یہاں ٹِک سکے گا۔ وہ صرف وقتی طور پر ایک سہارے کی اُمید میں بہار آیا تھا۔ دل میں یہی طے کیا تھا کہ آگے بڑھیں گے دم لے کر۔ مگر بہار میں آہستہ آہستہ ایسے حالات پیدا ہوتے گئے کہ وہ بے سوچے سمجھے بہار سے جڑتا گیا، اور اَب تو وہ اپنی زبان اور لہجے پر دھیان دیتا تو اُسے ایک دلچسپ احساس یہ بھی ہوتا کہ اُس کا لہجہ بھی اب بہاری ہوتا جا رہا تھا۔ اتنے دنوں کی رہائش اور سنگت نے اُس کی آبائی سائیکی کو دوبارہ

زندہ کر دیا تھا اور وہ محسوس کر رہا تھا کہ اُس کی اپنی نفسیات بدلتی جا رہی ہے۔ اب اُسے بہاری محاورے ضرب الامثال بھی از بر ہو گئے تھے اور وہ مقامی مگہی لب و لہجے میں بات کرنے لگا تھا۔ یہاں کے لوگوں سے اُس کا دل مل گیا تھا اور یہاں کی خوبی اور خامی کو وہ اپنی خوبی اور خامی سمجھنے لگا تھا۔ ابتدا میں کالج کو بھی اُس نے صرف پیسہ کمانے کا ذریعہ نہیں سمجھا، اُس نے نوکری تو کی تھی پیسہ کمانے کے لیے مگر چوں کہ محنت اور ایمانداری کا سبق اُس کو بچپن ہی میں پڑھا دیا گیا تھا اس لیے ابتدائی دِنوں میں بھی وہ محنت اور ایمانداری کے ذریعہ اپنا پیسہ حلال کرتا رہا اور کالج میں اُس کی ساکھ بنتی گئی۔ اساتذہ اور انتظامیہ کے نزدیک بھی اور طلبا کے درمیان بھی، ڈھیر سارے خوب صورت دن اُس کی یاد کا حصہ تھے، مگر پھر آہستہ آہستہ سب کچھ بدلنے لگا۔

اُس کا، یونیورسٹی کے دِنوں کا ساتھی، دوست اور کلیگ کرپاشنکر جب صرف پیسوں کے بَل پر تھرڈ پوسٹ سے سیکنڈ پوسٹ پر آ گیا اور وہ صرف اس لیے منظور شدہ سے غیر منظور شدہ عہدے پر پھینک دیا گیا کہ وہ کالج کے صدر اور سکریٹری کو اتنا پیسہ نہ دے سکا جتنا کرپاشنکر نے اُنڈیل دیا تو پہلی مرتبہ بے اطمینانی نے اُس کے دل میں گھر کیا، پھر یہ سلسلہ دراز ہوتا گیا۔ ارون بھاٹیہ کا منظر نامے پر طلوع ہونا، عیدو چپراسی کے اوٹے پر ممدو بھائی، جیکی کو چرا اور پلائی، شاہ بانو اور محمد خاں کا خرخشہ، بھیڑ جمع کر کے قانون بدلوانے میں کامیابی، باجپئی کی مختصر مدت کی حکومت، بابری مسجد کا انہدام، تعلیمی اداروں میں سیکولر اور ایمان دار طاقتوں کی شکست...

اور بالآخر اس کی ایک دن کی تھانے کی حراست۔

کیا وہ واقعی پاگل کتوں کے گھیرے میں آ گیا ہے؟

نہیں...نہیں...نہیں...اک چیخ سی اُس کے نرخرے سے نکلتے نکلتے رہ گئی۔

"یہ جو بھی ہے، میں اِس سے انکار کرتا ہوں۔"

بھری پری سڑک پر اسمٰعیل مسلسل بدبدا رہا تھا...انکار...انکار...انکار!!

• • •

13

''کیا بات ہے اسمٰعیل؟ آج کل تم کالج میں کم دکھائی دے رہے ہو؟'' باتوں باتوں میں ایک دن بنسی دھر نے سوال کیا۔

''سر! میں کوئی کلاس نہیں چھوڑتا۔''

''بھئی میں کلاس کی بات نہیں کر رہا ہوں، کلاس لینے میں تو تم ہمیشہ سے نمبر ایک پر ہو، میں تو ملنے ملانے کی بات کر رہا ہوں۔ تم کلاس کے وقت آتے ہو، کلاس لے کر چلے جاتے ہو، اسٹاف روم میں ہم لوگ بہت دنوں سے بیٹھے نہیں، گپ شپ نہیں کی۔''

''ہاں سر، وہ تو ہو رہا ہے، اصل میں کچھ کام بڑھ گیا ہے۔'' اسمٰعیل ہنس کر بولا۔

''سر! اسمٰعیل نے کوچنگ کھول لی ہے۔'' ایک کلیگ نے خبر دی۔

''ارے واہ! تب تو بدھائی ہو، مگر اس میدان میں تم کیوں کود گئے؟''

''سر، جینے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑتا ہے۔'' اسمٰعیل بڑے رسان سے بولا۔

''مطلب؟'' بنسی دھر اسمٰعیل کو کریدنے کے موڈ میں تھے۔

''کرپا شنکر نے جو ڈرامہ کیا اُس کے بعد اب میری تنخواہ کی ادائیگی کا مسئلہ پتھر پر دوب اُگانے جیسا ہو گیا ہے۔ میں سمجھ چکا ہوں کہ یونیورسٹی غیر منظور شدہ عہدوں پر پیسہ بھیجنے والی نہیں کیوں کہ اُسے حکومت سے ملنے والا نہیں ہے، پھر ایسے میں تو میں پرنسپل اور بر سر کی خوشامد کروں، سینکشنڈ پوسٹ والوں کا جو پیسہ آتا ہے اُس میں دوسروں کے ساتھ مل کر میں بھی سیندھ ماری کروں اور صدقے خیرات کے طور پر تھوڑا بہت میں بھی پالوں، یہ تو مجھ سے ہونے والا نہیں، لہٰذا جینے کے لیے کچھ اور تو کرنا ہی پڑے گا۔''

''بھائی لڑو، سنگھرش کرو، ہمت کیوں ہارتے ہو؟''

''جس لڑائی کی بنیاد ہی کمزور ہو، میں ایسی ہارنے والی لڑائی لڑنے کو تیار نہیں۔''

بنسی دھر چپ ہو گئے۔ اُن کے پاس بھی کہنے کو کیا بچا تھا۔ اندر اندر وہ بھی اسمٰعیل کی دلیلوں سے متفق تھے، اصل معاملہ یہ تھا کہ پیسے کے بَل پر وہ لوگ لکچرر ہو گئے تھے جو اگر اُس وقت اور ایسے ہی کسی کالج میں لکچرر نہ ہوتے تو کرانہ یا چوڑی کی دوکان ہی کھول کر بیٹھتے مگر یہ تو بلّی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹنے والی بات تھی سو وہ لکچرر ہو گئے۔ اب اُن کے لیے یہی سب سے بڑی بات تھی کہ وہ لکچرر ہیں، منظور شدہ عہدے پر ہیں یا نہیں، تنخواہ کتنی ملے گی، ملے گی یا نہیں ملے گی، یہ باتیں اُن کے لیے ثانوی حیثیت رکھتی تھیں۔ اُن میں سے زیادہ تر کسان تھے اور کچھ دوکاندار، سب اپنے اپنے پیشے میں مصروف تھے جو باقی بچے وہ پرنسپل، رجسٹرار اور کنٹرولر امتحانات کی خوشامدیں کر کے کاپیاں دیکھتے، اس بہانے پیسہ لے کر نمبر بڑھواتے، امتحان میں بحیثیت نگراں خود کو مقرر کرا لیتے اور پیسہ لے کر امتحان دینے والوں کو پرزہ پہنچاتے۔

گھناؤنے پن کا ایک طویل سلسلہ تھا جس سے اسمٰعیل نہ جڑ پایا اور اُس نے کوچنگ کے سہارے جینے کی راہ نکال لی۔

کالج میں صبح سے شام تک کی مشغولیت کم ہوئی تو طرح طرح کی مشغولیتوں نے دامن پکڑا۔

اسمٰعیل کو زبردستی ایک مدرسے کا صدر بھی بنا دیا گیا۔ مدرسے میں درسِ نظامیہ رائج تھا اور مدرسہ مسلمانوں کے چندے سے چلتا تھا۔ اسمٰعیل اس طرح کے بندھن کا نہ عادی تھا، نہ شوقین مگر اندر سے وہ مذہب بیزار کبھی نہیں تھا اور خدمت کی خواہش بہرحال کہیں نہ کہیں موجود تھی، اس لیے جب کچھ ملنے والوں کا اصرار بڑھا تو اُس نے بھی قبول کر لیا۔

مدرسوں کی ایک بڑی حقیقت یہ تھی کہ یہاں غریب، مسکین اور یتیم بچوں کی تعداد زیادہ تھی۔ یہ وہ گروہ تھا جو اگر چھوڑ دیا جاتا تو آگے چل کر رکشہ چلاتا، بیڑی بناتا، عمارتیں بنانے والے مستریوں کا رضا کار ہوتا، اور اگر ذرا بھی تربیت میں کمی ہو جاتی تو پاکٹ مار، چور، اسمگلر، کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ اس لحاظ سے یہ بڑی بات تھی کہ کچھ غریب و یتیم بچے یہ سب کچھ نہ ہو کر حافظ، مولوی ہو رہے تھے اور کسی نہ کسی طور آگے کے دنوں میں سماج کے کام آنے والا عنصر بننے والے تھے۔

بس یہی خیال اسمٰعیل کی دلچسپی کا سبب تھا۔

اسمٰعیل جس مدرسے کا صدر تھا وہ اورنگ آباد سے کچھ دور پر بسے ایک گاؤں میں قائم تھا۔

اسمٰعیل نے ارادہ کیا کہ وہ خود اُس مدرسے کو اور اُس کے طلبا کو دیکھے۔

جب وہ مدرسے میں پہنچا تو سورج ابھی ڈھلا نہیں تھا۔

گاؤں شہر سے دور تھا اور دوسرے تمام ہندوستانی دیہاتوں کی طرح زندگی کی بنیادی سہولتوں سے محروم تھا۔ گاؤں میں بجلی نہیں آئی تھی۔ راستے تمام کے تمام کچے تھے۔ صرف وہ سڑک جو اورنگ آباد سے ہوتی ہوئی داؤد نگر تک گئی تھی، وہی کسی قدر خام اور پختہ کا آمیزہ تھی، کہیں سالم، کہیں خام جس پر گٹی یا کوڑا اکرکٹ ڈال کر کسی قدر چلنے کے قابل بنا لیا گیا تھا، کہیں بالکل اُدھڑی ہوئی، مادرزادننگی سڑک، کہیں اتنے بڑے بڑے گڈھے کہ بس کا تقریباً آدھا چکّا اُس میں چلا جاتا تھا، مگر بہرحال سڑک تھی۔ سڑک کب بنی تھی اس کا کوئی اندازہ گاؤں والوں کو بھی نہیں تھا، پوچھنے پر ایک پختہ عمر شخص نے بتایا کہ میرے دادا بتاتے تھے کہ انگریزوں نے دوسری جنگِ عظیم کے وقت فوجوں کے آنے جانے کے لیے بنوائی تھی۔

اس سڑک سے جب ڈھلان پر اُتر کر اسمٰعیل گاؤں میں داخل ہوا تو اُسے کچھ گلیاں ضرور نظر آئیں جن پر سے دو رکشہ بیک وقت نہیں گزر سکتا تھا، اور اُس پر ستم یہ کہ پانی نکلنے کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ نتیجتاً راستہ چلنا دشوار تھا۔ کہیں پوری گلی پانی سے بھیگی نظر آتی۔ کہیں گلیوں میں اینٹیں رکھ رکھ کر لوگوں نے آنے جانے کا انتظام کیا تھا۔ ایک دو گلی میں گلی والوں نے گلی کے بیچوں بیچ یا مکانوں کی دیوار کے کنارے کنارے گڈھے کھود کھود کر پانی کی نکاسی کا انتظام کیا تھا۔ مگر یہ نکاسی بھی بس نام کی تھی، اس لیے کہ پانی کہیں جاتا نہیں تھا، ہر گلی کا پانی کچھ دور جا کر کسی نہ کسی چھچّے یا گڈھے میں جمع ہو جاتا تھا، بجبجاتا رہتا تھا اور اُس میں مکھیوں مچھروں اور کیڑوں کی فوج اپنی چھاؤنی بنائے بیٹھی تھی۔

اُسے یاد آیا کہ وہ اِس دیہات میں ایک مرتبہ پہلے بھی آ چکا ہے۔

تب اُس کی نوکری ہو چکی تھی، مگر شادی نہیں ہوئی تھی۔ بہار آنے کے بعد پہلی مرتبہ ماموں کی سرپرستی اور نگرانی کا دور ختم ہوا تھا۔ وہ ایک آزاد پنچھی تھا، اور ہواؤں میں اُڑ رہا تھا۔ فیضان رسول کے گھر پر جو کچھ اُس نے دیکھا اور محسوس کیا وہ تو ایک لمحاتی اور غیر اختیاری معاملہ تھا مگر اسی بہانے جب فیضان سے گفتگو کا دَر کھلا تو کمیونسٹ پارٹی، نکسل ازم، پسماندہ طبقات کا سرجوش، کیا کیا نہ زیرِ بحث آیا۔ انہی سروکاروں کے کسی کنارے یا بیچوں بیچ کھڑا دامودر ٹھاکر، ماموں کے دوست کی

بہت ساری باتیں، پھر جے پی تحریک اور کمیونسٹ پارٹی کا اس تحریک کو فاشسٹ تحریک قرار دینا۔

اور اِن سب کے بیچ ایک چہرہ!

سنیل دا... سنیل داس گپتا کا چہرہ!

اُسے حیرت ہوئی، وہ سنیل دا کو اتنے دنوں سے بھولے ہوا تھا۔

سنیل دا کو وہ کیوں بھولے ہوا تھا؟

اس کیوں کا اُس کے پاس جواب نہیں تھا۔ مگر اُس دیہات میں قدم رکھتے ہی اُسے سنیل دا یاد آ گئے۔ فیضان رسول نے ڈاکیے کی طرح کمیونسٹ پارٹی کا جو خط اُس تک پہنچانے کا کام کیا تھا، وہ خط سنیل دا نے اُسے سنایا، ایک ایک لفظ سنایا، ایک ایک جملہ سمجھایا۔

وہ سنیل دا کے ساتھ کمیونسٹ پارٹی کے دفتر گیا تھا اور پارٹی جوائن کی تھی۔

کوئی غور سے دیکھتا تو اُسے نظر آتا کہ اسمٰعیل مسکرا رہا ہے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب نائب صدر شیوسینا کے جلسے میں شرکت کر رہے تھے۔ اٹل بہاری باجپئی کو پدم بھوشن کا خطاب ملا تھا، مرلی منوہر جوشی سرکاری انتظام کے سہارے لال چوک تشریف لے گئے تھے۔ پارلیمنٹ میں کانگریسی اور سنگھ گھرانے والے ایک دوسرے کی حمایت کر رہے تھے۔ جائے پناہ کہیں نہیں تھی، اسمٰعیل نے گھبرا کر پارٹی جوائن کر لی۔

مگر زوالِ روس نے تو اس ایک موہوم سی اُمید پر بھی پانی پھیر دیا۔

حالاں کہ اُن دنوں گرباچوف صاحب سیاست کے منظرنامے پر تشریف فرما تھے مگر کمیونزم کے غبارے میں گلاسناسٹ اور پراستروئکا کی سوئی چبھ چکی تھی اور شاید اسمٰعیل کو اندازہ نہیں تھا کہ غبارہ جتنا بڑا ہوتا ہے، ہوا بھی اتنی جلدی نکلتی ہے۔ اور معلوم بھی کیسے ہوتا، اسمٰعیل تو یہ بھی فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ گلاسناسٹ اور پراستروئکا نے سوئی کے ناکے کے برابر سوراخ کیا تھا یا بھنبھاڑا کر دیا تھا۔

دراصل اُن دنوں اُس پہ قیامت کا جنوں طاری تھا۔ اقبال اور جوش وغیرہ کو تازہ تازہ پڑھا تھا۔ ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام۔ جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی/ اُس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو۔ رائی زورِ خودی سے پربت/ پربت ضعفِ خودی سے رائی۔ پھر جوش کا مرثیہ ہاتھ لگ گیا۔

پھر گرم ہے فساد کا بازار دوستو — تلوار، ہاں اُٹھی ہوئی تلوار دوستو

جو تیز تر ہو خونِ امارت کو چاٹ کر — رکھ دے جو سیم و زر کے پہاڑوں کو کاٹ کر
تم حیدری ہو، سینۂ اژدر کو پھاڑ دو — اِس خیبرِ جدید کا بھی دَر اُکھاڑ دو
تاخیر کا یہ وقت نہیں ہے دلاورو! — ایسے میں باڑھ پر ہے جوانی، بڑھے چلو
گرجو مثالِ رعد - گرج کر برس پڑو — اُٹھو مثالِ ابر، بکھر کر برس پڑو
ہاں زخم خوردہ شیر کی ڈھکار دوستو
جھنکار! ذوالفقار کی جھنکار دوستو

اُس وقت صورتِ حال کچھ یوں تھی کہ پارٹی اسمٰعیل کے لیے حق کی پہچان بن گئی تھی۔

اور پارٹی ایگزیکیوٹو کا حکم آسمان سے اُتری وحی کے مماثل۔

لہٰذا جب پارٹی میٹنگ میں یہ بات چلی کہ سکّر پور کے علاقے میں پارٹی کیڈر بالکل ٹوٹنے بلکہ بکھر جانے کی منزل تک پہنچ چکا ہے اور وہاں فوراً سے پیشتر کچھ لوگوں کے جا کر کام کرنے کی ضرورت ہے تو اسمٰعیل خود کو روک نہیں سکا۔ تفصیلات کا پتہ چلانے پر معلوم ہوا کہ اس علاقے میں سی پی آئی کے بہت فعال اور متحرک رکن رام بچن مہتو پارٹی سے استعفیٰ دے کر آزاد اُمیدوار کی حیثیت سے الیکشن لڑے، بہت زیادہ ووٹوں سے جیتے، اور جیت کے بعد آئی پی ایف میں چلے گئے۔ نتیجتاً پارٹی کا کیڈر ٹوٹ ٹوٹ کر آئی پی ایف میں جانے لگا۔ ظاہر ہے یہ خطرناک صورتِ حال تھی کیوں کہ سی پی آئی کے ناراضوں کو رضامند کرنا گویا رام بچن مہتو کی دشمنی مول لینا تھا، مگر اس کے علاوہ کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔

پارٹی نے چار آدمیوں کو سکر پور میں کام کرنے کی ذمہ داری سونپی۔ یوگیشور پرشاد، نرنجن کمار سنگھ، راکیش بیدی اور اسمٰعیل مرچنٹ۔

جب یہ چاروں سکّر پور پہنچے تو عجیب منظر نظر آیا۔ دس بارہ ہریجن درختوں میں چھپے بیٹھے تھے۔ نرنجن کمار سنگھ اُسی علاقے کا رہنے والا تھا اور اُس سے پہلے بھی بار ہا اِدھر آتا رہتا تھا، غریبوں میں کام کرنے کا اُس کا پرانا تجربہ تھا، اِس لیے علاقے کے لوگوں سے وہ متعارف تھا۔ اُسے آتا دیکھ کر درخت پر چڑھے لوگوں میں سے دو آدمی نیچے اُترے۔

''بابو! اُدھر مت جائیے۔'' ایک آدمی نے منع کیا۔

''کیوں؟''

''پارٹی والے آئے ہیں۔''

پارٹی والے کا مطلب آئی پی ایف – یا ام سی سی والے ہوتا ہے۔ اس صورت حال کی کچھ سن گن تو مل چکی تھی، مگر اب اندازہ بھی ہو گیا، پھر بھی تکدّر کی اصل بات یہ تھی کہ اسمٰعیل سمیت چاروں کو اپنے ''بے بنیاد'' ہونے کا احساس ہو گیا تھا۔

''مگر ہم لوگ تو گاؤں کے لوگوں ہی سے بات کرنے آئے ہیں۔'' اسمٰعیل چپ نہ رہ سکا۔

''اب آپ کیا بات کریں گے جناب؟'' اُس آدمی نے بڑے تیکھے لہجے میں سوال کیا تو اسمٰعیل چونک اُٹھا۔

''اِس کا لہجہ تو بالکل اُردو والوں کا ہے۔'' مگر یہ وقت اس معاملہ پر سوچنے کا نہیں تھا اس لیے اس نے اُس آدمی سے دوسرا سوال کیا۔

''کیوں؟ تم لوگوں کو معلوم نہیں ہے؟ رام بچن مہتو کی وجہ سے سب لوگ پارٹی چھوڑتے چلے جا رہے ہیں!''

''تو جناب آدمی اپنی جان بچائے کہ پارٹی دیکھے۔''

اس کا جواب اُن چاروں میں سے کسی کے پاس نہیں تھا، سبھی مخمصے میں پڑ گئے، کیا لوٹ جایا جائے؟ مگر شاید لوٹنا بھی ممکن نہیں تھا، وہ جتنا راستہ طے کرکے یہاں تک پہنچے تھے، اتنا ہی طے کرکے مقامی ریلوے اسٹیشن تک پہنچتے، اور اسٹیشن تک پہنچتے پہنچتے رات ہو جاتی۔ دوسرا اہم سوال یہ تھا کہ اِس خراب صورت حال کے بارے میں تو پارٹی نے اشاروں اشاروں میں پہلے ہی مطلع کر دیا تھا۔

واپسی کا جواز کہاں باقی تھا—؟

سب آگے بڑھے۔ گاؤں کے باہر ایک کنواں نظر آیا تو اچانک نہانے کی خواہش جاگ اُٹھی، بعد میں یوگیش، نرنجن اور راکیش تینوں نے اعتراف کیا کہ موت سر پر کھڑی دیکھ کر پاک صاف ہو جانے کی خواہش سب کے دل میں مچل اُٹھی تھی۔

غسل کے بعد چاروں گاؤں میں داخل ہوئے۔ پورے گاؤں میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے بچوں اور جانوروں کا بھی منہ باندھ دیا گیا ہے۔ یہ فیصلہ ہی مشکل تھا کہ وہ آبادی کے کسی مرکز میں پہنچے ہیں یا کسی قبرستان میں۔ مرگھٹ کا سناٹا چاروں طرف ناچ رہا تھا اور گاؤں کے ہر گھر کا دروازہ بند تھا، مگر وہ تو گاؤں میں داخل ہو ہی چکے تھے، اس لیے اُنہیں تو اَب آگے ہی بڑھنا تھا،

چند ہی قدم چلے ہوں گے کہ اچانک تڑ تڑ تڑ تڑ گولیوں کی آواز آنے لگی۔ وہ مشینی انداز میں زمین پر لیٹ گئے۔ گولیاں پھر چلیں تو اندازہ ہوا کہ یہ ہوائی فائر ہے۔

''وہ جا رہے ہیں۔'' نرنجن آہستہ سے بولا۔

''کیسے سمجھا تم نے؟'' اسمٰعیل نے پوچھا۔

''وہ ہوائی فائر، جاتے ہوئے ہی کرتے ہیں۔''

چاروں کچھ دیر تک وہیں بیٹھے فضا کا اندازہ کرتے رہے۔ دس پندرہ منٹ بعد گھروں کے دروازے کھلے۔ ایک گھر سے کچھ لوگ بھی نکلتے دکھائی دیئے۔ چہروں پر مختلف کیفیتیں تھیں، کوئی بہت پر جوش تھا، کوئی متفکر تھا، کوئی خوف زدہ تھا، کوئی پریشان تھا۔

یہ چاروں اکھلیش کے گھر کی طرف بڑھے، جس سے مشورہ کرنے کے لیے اس گاؤں میں آنے کا پروگرام بنا تھا۔

کامریڈ اکھلیش نے بہت چوکنا انداز میں استقبال کیا... کچھ دیر بعد گفتگو شروع ہوئی۔

''کامریڈ! یہ لوگ کیوں آئے تھے؟''

''کچھ ہتھیار بانٹنے، کچھ پیسہ لینے اور بارہ گاؤں میں جو کچھ ہوا اُس پر بات کرنے کے لیے۔''

''کیا بات؟''

''وہاں گولڈن آرمی کا ایک آدمی ٹکراؤ میں مارا گیا ہے۔ اس سے زمیندار لوگ بہت بوکھلائے ہوئے ہیں اور لگتا ہے کہ پارٹی والوں کے خلاف یہ لوگ کچھ کرنا چاہتے ہیں اس لیے ہوشیار تو رہنا ہوگا۔''

''مرنے والا اور مارنے والا دونوں ہی تھانے میں نامزد مجرم ہیں۔'' اسمٰعیل بولا۔

''کامریڈ! مارنے والے کو مجرم مت کہیے۔ وہ ہندوستان میں جاری اُس سنگھرش کا ایک حصہ ہے جو ویوستھا بدلنا چاہتا ہے۔''

اُس نے حیرت سے کامریڈ اکھلیش کو دیکھا تھا، وہ تو اُس قتل کے دن وہاں موجود تھا۔

'کامریڈ! اُس کا ریکارڈ تو بہت خراب ہے، مجرم کو مجرم کہیے، آپسی جھگڑے کو سنگھرش سے مت جوڑیئے۔''

''بھائی، اس بات کو چھوڑیئے۔'' نرنجن نے بات کاٹی۔ ''ہم دوسری سمسّیا پر بات کرنے

آئے ہیں۔''

''اور کیا سمسّیا ہے نرنجن بائی؟'' کامریڈ اکھلیش نے پوچھا۔

''سمسّیا آپ کے سامنے ہے، یہ گاؤں سی. پی. آئی. کا پرانا گڑھ ہے، اور اَب اس گاؤں میں پارٹی والے آ گئے۔ ظاہر ہے اِس کا اثر آس پاس کے گاؤں پر بھی پڑے گا۔ اس کے لیے آپ کیا سوچتے ہیں؟''

''نرنجن بھائی! آپ ہمارے علاقے کے ہیں، اور اس چھیتر میں آپ کی بھل منسی سب مانتے ہیں اس لیے آپ اِن لوگوں کے ساتھ گاؤں میں داخل بھی ہوئے اور یہاں تک آ بھی گئے۔ اگر آپ نہ ہوتے تو شاید یہ سب لوگ میرے گھر تک نہ پہنچ پاتے۔ آپ کہتے ہیں دوسرے گاؤں پر اثر پڑے گا، نہیں نرنجن بھائی اثر پڑ چکا۔ یہ گاؤں ہی نہیں، جو جو گاؤں سی پی آئی اور سی پی ایم والوں کا تھا، سب پارٹی والوں کے ساتھ ہو گیا۔''

''لیکن ایسا کیوں ہوا؟'' نرنجن اپنی جھنجھلاہٹ دبانے کی ناکام کوشش کرتا ہوا بولا۔ ''اِس کا علاج کیا ہے؟ آپ کے ہوتے ہوئے یہ سب کیوں ہوا؟''

''جھنجھلایئے مت نرنجن بھائی۔'' کامریڈ اکھلیش ٹھنڈے لہجے میں بولا۔ ''ایسا تو ہونا ہی تھا، چالیس برس تک ہم لوگ سی پی آئی اور سی پی ایم کے سہارے جیے، اس آس پر جیے کہ وہ صبح کبھی تو آئے گی، مگر وہ صبح کبھی نہیں آئی۔ ہم قتل ہوتے رہے، ذلیل ہوتے رہے، ہماری ماؤں بہنوں کی عزت لوٹی جاتی رہی، ہم بندھوا مزدور بنتے رہے اور مالک نے جس طرح چاہا ہمیں استعمال کیا، ہم دانے دانے کو ترستے رہے اور مالک کی کوٹھیاں بھرتی رہیں، پٹنہ میں ڈمراؤں راج اور ہتھوا راج کی محل نما عمارتیں اِس کی گواہ ہیں۔ اور آپ سب کامریڈ لوگ شہر میں بیٹھ کر صرف پرستاؤ پر پرستاؤ پاس کرتے رہے۔ آپ نے کیا کیا ہے اَب تک؟'' کامریڈ اکھلیش کا چہرہ اب سرخ ہو گیا تھا۔ ''دلی، پٹنہ، کلکتہ ہر جگہ آپ لوگ ہمیں چارے کی طرح استعمال کرتے رہے، اگر کانگریس اور بی جے پی ووٹ بینک کے لیے سوانگ بھرتی ہے تو آپ نے بھی ووٹ بینک کے لیے کیا کم سوانگ بھرے ہیں؟ آپ کے گیا ہی کے اسمبلی حلقے سے مسلمان کیوں کھڑا کیا جاتا تھا؟ ووٹ بینک کی اہمیت کو تسلیم کرنا، ذات اور مذہب کی بنیاد پر ووٹ بانٹنے کا چلن عام آدمی کو جذباتی اور فرقہ وارانہ رشوت دینا نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ سی پی آئی کبھی کانگریس کا دم چھلّا بن جاتی ہے،

کبھی جنتا دل کا۔ سی پی ایم بنگال میں آئیڈیالوجی کی وجہ سے زندہ نہیں تھی بلکہ اِس لیے بچی ہوئی تھی کہ وہ بنگالیوں کی پارٹی بن گئی۔ آئیڈیالوجی کہاں گئی کامریڈ؟ آپ کو پریشانی ہے کہ اس علاقے سے سی پی آئی کا اثر ختم ہو رہا ہے، کیوں نہیں ختم ہوگا؟ چالیس برس میں آپ اس علاقے کے لیے کیا کر سکے؟ زمینوں کے مالکانہ کے جو پرچے بٹے اُن کے مطابق زمینوں پر قبضے کا کام بھی پورا نہیں ہوا۔ زمین دار کا ظلم اپنی جگہ برقرار ہے۔ آپ لوگ جمہوریت کی دُہائی دے دے کر ہمیں اور بزدل نہ بنایئے۔ رام بچن مہتو جب آپ کے ساتھ تھا تو انقلابی تھا، الگ ہو گیا تو مجرم ہے۔ اور اگر ہے تو ہو۔ خونی سہی، لٹیرا سہی مگر ہمارے دُکھ سکھ کا ساتھی تو ہے۔ ہم اُس کے ساتھ کیوں نہ رہیں؟ اور آپ گاؤں دیہات پر سی پی آئی کے سماپت ہوتے پربھاؤ کو بچانا چاہتے ہیں، باقی رکھنا چاہتے ہیں تو آپ کو قربانی دینی ہوگی۔ نرنجن بابو! سنگھرش شروع ہو چکا ہے، خون دیجیے ہمارا ساتھ لیجیے۔ اب ہم لوگوں سے یہ سارا اَنّیائے اور نہیں سہا جائے گا۔ اور آپ جو یہ پوچھتے ہیں کہ تمھارے ہوتے یہ سب کچھ کیوں ہوا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ میں اَب سی پی آئی کا ممبر نہیں ہوں، میں نے ایم.سی.سی. جوائن کر لی ہے۔''

اب اس کے بعد پوچھنے کو کیا رہ گیا تھا، سب چپ چاپ اُٹھ گئے۔ وہاں اور ٹھہرنا اپنے کو ماں کی گالی دینے جیسا لگ رہا تھا۔

''اب رات کہاں گزرے گی؟'' راکیش کی زبان سے سب کے دل کا چور باہر آ گیا۔

''میری ایک موسی یہاں رہتی ہیں۔ چلو وہیں چلتے ہیں۔'' نرنجن کی بات سے تھوڑا اطمینان ہوا۔

کامریڈ نرنجن کشواہا برادری سے تعلق رکھتے تھے اور اُن کے موسا ایک غریب کشواہا تھے۔ موسا کا گھر بھی غربت کی کہانی کہہ رہا تھا، نیچا دروازہ، جھکی چھپر، کچی دیوار، مکان کا دروازہ بند تھا۔ نرنجن نے دروازہ تھپتھپایا تو اندر سے کسی بوڑھے کی آواز آئی۔

''کے بچوا؟''

''کھولیں موسا، ہم ہیں... نرنجن!''

''کون نرنجن؟ گاؤں میں تو کونو نرنجن نیکھے با۔''

''ہم بنی۔ چندر موہن کے بیٹا نرنجن... موسا جی!''

''اچھا اچھا، بچوا... رُکو... آوت ہیں۔''

''نرنجن، یہ مگہی نہیں بول رہے ہیں؟''اسمٰعیل نے آہستہ سے پوچھا۔

''اِن کے پتا جی کا گھر سہسرام کے پاس ایک گاؤں میں تھا، یہاں نوکری ملی تو یہیں رہ گئے، مگر بھاشا نہ بدلی۔''

نرنجن کی بات ختم ہوتے ہوتے دروازہ کھل گیا۔ سب اندر داخل ہوئے، نرنجن نے موسا کے پیر چھوئے، باقی سبھوں نے نمستے کیا، موسا نے آشیرواد دیا اور کھاٹ پر بیٹھنے کے لیے کہتے ہوئے ایک طرف بڑھے، مٹی کا چراغ ایک طاق پر رکھا اور پھر وہیں پر سے ایک دو بہت ہی بوسیدہ پنکھا نکال لائے۔ مارچ کی ابتدائی تاریخیں تھیں، گرمی ابھی پوری طرح شروع نہیں ہوئی تھی، مگر مچھروں سے بچنے کے لیے پنکھا ضروری تھا۔

تھوڑی دیر میں جب آنکھ کمرے کے اندھیرے اور گھٹن سے ہم آہنگ ہوگئی تو نظر آیا کہ اوسط سائز کا، کچی دیواروں پر کھڑا کمرہ ہے، اور کمرے کی دیواریں نیچی ہیں۔ یہ بھی نظر آیا کہ الف بے ج زاویے (۸) کی چھپّر (کھپریل) ایک بڑی گول (کسی درخت کی، بغیر تراش کی، گولائی میں قائم شہتیر) کے سہارے ٹکی ہوئی تھی۔ کمرے میں بس ایک کھاٹ بچھی ہوئی تھی، ایک کونے میں چراغ رکھا ہوا تھا، جو دھویں سے بالکل سیاہ ہو رہا تھا، دوسرے طاق پر لکشمی جی کی مورتی، ایک طرف دیوار پر ایک بہت پرانا کلینڈر آویزاں تھا جس میں شری کرشن اور رادھا جی کی تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ کلینڈر کئی سال پرانا لگتا تھا کیوں کہ تاریخ والا حصہ جانے کب کا پھٹ کر پھنکا جا چکا تھا۔

نرنجن اندر جا چکا تھا۔ شاید موسی سے ملنے۔

''آپ ریٹائر ہو گئے؟''راکیش نے پوچھا۔

''ارے نا بچوا۔''موسا منھ بنا کر بولے۔''چینی مل میں نوکری کا رِٹار کا؟ سال میں کلّم چار مہینہ ٹھو کام ملے ہے۔ اوکر میں بھی آج پانچ برس سے تالا لگل با۔ سب بابو لوگ تو چھوڑ کر چل دیہن پرنتو ہمنی کے اب کہاں جائے کے با؟ اب تو اپنا گھر بار چھوڑ کے اِدھر آ گئیلی۔ باپ دادا کی جو تھوڑی بہت جر جمین تھی اُو کر بھی کوئی پتہ کھبر نہیں...اب تو جو ہے سو اِیہی ہے۔''

''ابھی جو چناؤ ہوا، اُس میں آپ نے کس کو ووٹ دیا؟''یوگیشور نے اچانک ایک غیر متعلق سوال کر دیا۔

''ہم بوڑھ آدمی، ہم کہاں جاتے؟ پرنتو ہمار بھوٹ پڑ گئیل با۔ ای ہم جانت ہیں۔''

''آپ نہیں جاتے مگر گھر کے لوگ؟''

''گھر کے لوگ؟''موسا بڑی عجیب سی ہنسی ہنسے۔ گھر میں اے گو بوڑھوا اور بڑھیا کو چھوڑ ہئی کون؟''

''کاہے، بال بچہ۔''اسمٰعیل نے پوچھا۔

''ہاں بچوا۔''موسا ٹھنڈی سانس لے کر بولے۔''اے گو بُٹروا ورائے گو بچیا ہے۔ بچیا کے تو تین سال بھئل بیاہ دیہلیں۔ بیٹی جات پرایا دھن، اپن سسرارے گئی تو گئی، اور ہم ہوں کون برتے پر اوکر بلاوے کی بتیا سوچیں، بیٹی کے میکے آوے کا مطلب ہے کہ اوکرا کے دے دِلا کے واپس کرے کے چاہی، تو ایہاں تو اپنے ایک وکت کھاؤ تو دوسرے وکھت کے بارے میں سوچے کے پڑے ہے۔''

''اور بیٹا؟''راکیش نے پوچھا۔

''مت پوچھا اُو سور کے جنا کے۔''موسا اچانک غصّے میں آ گئے۔''سسرے کو کیسا جوکھم دیہہ کے پالا پوسا، اپنے آدھی روٹی کھئلیں، اُو سور کے کدھی بھوکا نہیں سوئے دہلیں، جب بڑا ہو ملے تو حرمجادہ جاستی کمائے کا بہانہ کر کے جو ہمارے پاس جمع جتھا تھا سب لے دے کے بمبئی چل دہلس، اور جو گئیل تو گئیل، گاؤں کے ہری نرائن سے بمبئی میں اوکر ملاکات ہوئی رہے، ہری نرائن بتائن کہ اُو بہتے پیسہ کمائے لہس ہے۔ پھٹپھٹوا پر اڑل چلے ہے، بیل پکا تو کوے کے باپ کا کا (کیا)، ہم کو تو نیکھے پوچھت، ہمار جیون ایہاں نرک بنل ہے اور اُو کمینہ موج اُڑاوت ہے۔ سب بھاگ کے لکھل با، بابو اور کا۔''

پھر کوئی کچھ نہ بولا، آپ ہی آپ فضا پر اُداسی کی ایک پرت سی جمتی محسوس ہوئی۔ موسا اپنی چلم کی آگ پھونک مار مار کر تیز کرنے کی کوشش کر رہے تھے، مگر شاید آگ بالکل بجھ چکی تھی، سو چلم سے اُڑنے والی گرد یا راکھ موسا کے حلق میں گھس گئی اور موسا کھانستے کھانستے بے دم ہو گئے۔ اسی بیچ نرنجن بھی باہر آ گیا، ایک تھالی میں کچھ لٹّی اور ایک لوٹے میں پانی لیے ہوئے، اسمٰعیل کو یاد آیا۔ سب نے دوپہر کو کھایا تھا اور اَب رات کے نو بج رہے تھے، بھوک اپنے شباب پر تھی، مگر لٹّی کھانے کی پھر بھی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ پتہ نہیں یہ موسا کے حصے کی تھی، یا موسی کے۔ دوستوں نے سوالیہ انداز میں نرنجن کو دیکھا، نرنجن نے آنکھ سے اشارہ کیا کہ ''کھالو۔'' سبھی نے محسوس کیا کہ نہ کھایا گیا تو

شاید اِن کا دل دُکھے گا، مگر سچی بات یہ ہے کہ ایک ایک نوالہ زہر کی طرح اندر اُتر رہا تھا۔ ایسا زہر جسے پینے میں تکلیف بھی ہو اور ممنونیت کا احساس بھی جی کو بے کل کرتا رہے۔

کھانے کے دوران کیا، کھانے کے بعد بھی کوئی گفتگو کے موڈ میں نہیں تھا، حالاں کہ نیند کسی کو نہیں آ رہی تھی، مگر سب چپ تھے۔ اسمٰعیل اور راکیش کھاٹ پر، یوگیش اور نرنجن زمین پر اور ایک کنارے ہلکا سا پیال بچھا کر کبھی کھانستے، کبھی ''ہے رام'' کرتے موسا جی!

اسمٰعیل کھاٹ پر چت لیٹا ہوا تھا اور اُس کے سر کے عین اوپر الف ب ج (۸) کے زاویے والی چھپر ایک سیدھی شہتیر کے سہارے ٹکی ہوئی تھی، اسمٰعیل پتہ نہیں کیوں اس شہتیر کو دیکھنے لگا اور دیکھتے دیکھتے اِردگرد کا سارا منظر بدل گیا۔ اُس کی نگاہیں بلا ارادہ شہتیر کے ایک سوراخ پر ٹک گئیں۔

بچھو اور کنگوجر سی مشابہت والا کوئی جانور بار بار اندر جاتا تھا، باہر آتا تھا، اور پھر اندر جاتا تھا۔ ابتدا کے چند پل شہادت اور بیچ والی انگلی کے فاصلے پر محیط تھے، پھر فاصلہ بڑھتا گیا۔ لمحوں کا بھی اور انگلیوں کا بھی، پھر چند لمحوں بعد بچھو اور کنگوجر دونوں صلیب (✝) کی صورت ایک دوسرے میں پیوست تھے!

اور پھر اچانک گھر کے باہر ہواؤں کا زور بڑھ گیا، شاید طوفان کی آمد آمد تھی... اور ہوا کے طوفان کے عقب میں عجیب سی سنسناہٹ، سرگوشی، احساس... وہ آ رہا ہے... وہ آ رہا ہے!

اسمٰعیل نے بغل میں لیٹے راکیش کو دیکھا، اُس پر اَب نیند غالب آ رہی تھی۔ آہستہ سے سر موڑ کر یوگیش اور نرنجن کو جھانکا، اُن دونوں کا بھی تقریباً وہی عالم تھا۔

اچانک اندھیرے کا سینہ چیرتی ہوئی ایک چیخ، میں پتھر کی طرح اپنی جگہ ساکت... پہاڑی کے دامن میں تین چار آدمی کسی ایک آدمی کو ذبح کر رہے تھے... اور اُس ایک بے سہارا شخص... نہیں، معصوم اور تنہا بچے... نہیں، تنہا اور بے سہارا فاختہ کی اُس ایک چیخ میں نہ جانے کیا تھا کہ ہزاروں لاکھوں آدمیوں... معصوم تنہا اور بے سہارا فاختاؤں کی چیخیں گونج اُٹھیں... بچاؤ، بچاؤ، بچاؤ [میں چیخیں سن رہا تھا، اور سوچ رہا تھا] اس سارے خرابے میں میرا کتنا حصہ ہے، میری کیا حیثیت ہے، کیا مفہوم ہے

میرے وجود کا؟ کیا مقصد ہے میری پیدائش کا؟ میں پسینے سے شرابور ہو رہا ہوں، تپش اور جلن میرے وجود کو جلا کر راکھ کر دینے پر تُلی ہوئی ہے (اور چراغ والے طاق سے ذرا ہٹ کر جو طاق ہے، اُس پر) بہت پرانا... ۱۹۶۷ء کا... رانچی سے آیا ہوا ایک خط: ''اُنھوں نے مکان کے دروازے پر تالا لگا کر مکان کے چاروں طرف پٹرول چھڑکا، اور ایک جلتی تیلی مکان پر پھینک دی۔''

اچانک مجھے احساس ہوتا ہے کہ میں ہونے کے باوجود نہیں ہوں، یا شاید ہر جگہ ہوں، یا شاید کہیں نہیں ہوں... لوبھی، کائر، کمینہ۔ میں بار بار سر جھٹک کر اپنے آپ کو خالی الذہن کرنا چاہتا ہوں لیکن ایک تصویر بڑی ہوتی جاتی ہے، پھیلتی جاتی ہے اور پھر میرے پورے وجود پر چھا جاتی ہے۔

ایک چھوٹی تصویر: ایک کتا زمین کے جس حصے پر بیٹھا ہوا ہے، اُس حصے پر جھپٹتا ہوا، ایک دوسرا، اس سے زیادہ تنومند اور خونخوار کتا... اور اُن دونوں سے بہت دور حسرت سے زمین کے ایک حصے کو دیکھتی ہوئی ایک بلّی، اور اُس کے پنجوں میں دبا، ایک مردہ خرگوش!

آخری منظر: جبّار صاحب، شرما جی اور راحیل صاحب اپنے گھروں کے پاس سے مہتروں کی جھونپڑیاں اُٹھوا کر کہیں پھنکوا رہے ہیں، اور مہتر چیخ رہے ہیں اُن کے بچے رو رہے ہیں اور بلک رہے ہیں۔''

اور ہوا کی سنسناہٹ، طوفان اور اُن سب کے درمیان، ایک سرگوشی، ایک اِحساس... وہ آ رہا ہے!

ساری رات اِسی خوف میں گزر گئی، نگاہ کبھی دروازے کی طرف جاتی کبھی سوئے ہوئے دوستوں کی طرف اور کبھی موسا کی طرف جو نیند میں بھی کھانس رہے تھے، اور ہے رام، ہے رام کر رہے تھے۔ اسی عالم میں صبح ہو گئی اور چاروں وہاں سے سرپٹ بھاگ کھڑے ہوئے۔

''وہ ایک آدمی جو اُردو بول رہا تھا وہ کون تھا؟'' راستے میں اسمٰعیل نے نرنجن سے پوچھا۔

''محمد قربان نام ہے اُس کا، پہلے ہم لوگوں کے ساتھ تھا۔ اب وہ بھی اُدھر ہی چلا گیا ہے۔''

نرنجن نے بتایا تھا۔

واپس لوٹنے کے کئی دنوں بعد تک موسا یاد آتے رہے ...آواز سنائی دیتی رہی: ''وہ آرہا ہے۔'' اور اسمٰعیل کامریڈ اکھلیش کی باتوں کا جواب تلاش کرتا رہا۔ مگر شاید جواب تلاش کرنے کا موسم گزر چکا تھا۔ نیا منظر نامہ، نئے نئے سوالات سامنے لا رہا تھا۔ اور سارا علاقہ لاقانونیت کی زد میں تھا۔ آج اُس کا قتل، کل اُس کا اغوا، پرسوں اسکوٹر کی چوری، پھر کسی دن خبر ملتی کہ فلاں بس جلا دی گئی۔ جب کسی صوبے کا وزیر اعلیٰ کسی علاقے کے نامی گرامی مجرم کو اسٹیج پر ہار پہنائے اور کسی علاقے کا ایم ایل اے بھرے مجمع میں ریوالور سے بلا وجہ ہوائی فائرنگ کرے تو باقی جنتا کو کون روک سکتا ہے؟ پانی جب ڈھلان پر بہنے لگتا ہے تو پھر کسی کے روکنے سے نہیں رُکتا۔

اُن دنوں اسمٰعیل شدید قسم کی گھٹن محسوس کر رہا تھا۔ وہ جس دوڑ میں شامل ہو چکا تھا، اُس میں منزل تک پہنچے بغیر رکنا یا مڑ کر دیکھنا پتھر ہو جانے کے مماثل تھا۔

مگر اُن ہی دنوں ایک اژدہا بھی پھنکارتا تھا... ''تیری منزل کیا ہے؟''

''نظام کی تبدیلی!'' کہیں سے کسی آواز کی بازگشت بار بار اُس پر وار کرتی۔

سوال جواب کے ایسے ہر مرحلے میں اسمٰعیل کو اپنے آپ پر ہنسی آجاتی۔ ایسا لگتا جیسے وہ اپنے آپ سے مذاق کر رہا ہے ...اندر اندر وہ خود کلامی میں مصروف ہو جاتا ... چالیس پینتالیس برس میں بڑے بڑے جو کام نہ کر سکے کیا وہ مجھ سے ہو سکے گا؟ اور پھر میں کیا ہوں؟ میری اوقات کیا ہے؟ خود پارٹی میں میری کیا اہمیت ہے؟ پرولتاریہ کی ڈکٹیٹر شپ کی آڑ لے کر جو آمرانہ نظام جاری وساری تھا، میں تو اُس آمرانہ نظام کا ایک معمولی سا پرزہ بھی نہیں تھا۔ پرولتاریہ کی حکومت کا خواب چکنا چور ہو چکا تھا اور اُس کے ملبے پر کھڑا ہوا تھا پارٹی لیڈر کی ڈکٹیٹر شپ کا نظام! اور میں!

اس کے کام آنے والے ایندھن کا ایک تنکا!

بیسک کیڈر اور اُس کی یونٹیں کرتی کیا تھیں؟ قومی مجلسِ عاملہ میں جو تجویز منظور ہوتی، اُس کو انڈورس کرنے کے علاوہ ہمارا مصرف کیا تھا؟

شاید اسمٰعیل کی خود کلامی مزید کچھ دنوں، کچھ مہینوں یا کچھ سالوں جاری رہتی —

مگر وہ عمارت ہی ڈھہ گئی جس کا خواب اسمٰعیل اور اُس جیسوں نے اپنی آنکھوں میں بسا رکھا تھا۔ زوالِ روس!

خوابوں کا انہدام، ناسٹلجیا کی شکست، یوٹوپیا کی گم شدگی، موقف سے پُر زندگی کا بکھراؤ، نظریے کی موت...''

روس میں اشتراکی نظام کے خاتمے نے اسمٰعیل کو اندر سے ہلا کر رکھ دیا تھا، پھر بھی بہت دِنوں کا ایک تعلق تھا جس نے کسی نہ کسی طور اسمٰعیل کو پارٹی سے جوڑے رکھا، حالاں کہ کالج کی مصروفیتیں بڑھنے لگی تھیں اور شادی کا دن مہینہ طے ہو چکا تھا۔ ذہنی خلفشار کے بوائلنگ فرنیس میں ایک چھوٹے سے نقطہ ارتکاز نے بھی قرار پکڑ لیا تھا۔

پھر یہ بھی ہوا کہ کامریڈوں کی محفلیں اُجڑنے لگیں۔ محفل اگر کبھی سجی بھی تو نئے خواب کے بجائے، پرانے خوابوں کی غلط تعبیر کی وجوہات تلاش کرنے کا بہانہ بن گئیں۔ دوسری طرف مذہبی آوازیں زیادہ سنائی دینے لگیں، مذہبی چہرے اِردگرد جمع ہونے لگے، گفتگو کے موضوعات اور محاورے بدلنے لگے۔

جماعتِ اسلامی والوں نے زوالِ روس کے اسباب پر گفتگو کے بہانے زوالِ روس پر خوشیاں منانے کا اہتمام کیا۔ ظفر عالم نے اسمٰعیل کو بھی دعوت دی، ویسے بھی اب تبلیغی جماعت کا گشت بڑھ گیا تھا، سیرت کے جلسوں کا زیادہ اہتمام ہونے لگا تھا۔ درسِ حدیث اور درسِ قرآن کا چرچا بڑھ گیا تھا، پھر یہ بھی کہ بھجن کیرتن کی محفلوں کی آواز زیادہ سنائی دینے لگی تھی۔ ہندوؤں کے یہاں مختلف جگہوں پر، پروَچن کا خوب خوب اہتمام کیا جانے لگا تھا۔ اور کمیونسٹ پارٹی سے جڑے عام ہندو اور مسلمان کو ہندو اور مسلم جماعتیں خوب خوب دعوت دے رہی تھیں۔ طرح طرح کے بینر پوسٹر جگہ جگہ نظر آرہے تھے۔ کہیں نظر آتا: ''جاہلیت سے اسلام کی طرف آؤ...'' کہیں دکھائی دیتا: ''گرو سے کہو ہم ہندو ہیں۔''

ماحول کے اس بدلاؤ سے اسمٰعیل پر کیا اثر پڑا تھا، اس کا کوئی بہت صاف اثر تو نہیں نظر آرہا تھا مگر ظفر عالم نے جب دعوت دی تو وہ جماعتِ اسلامی کے مرکز میں چلا گیا۔

وہاں اچھا خاصا مجمع جمع تھا، بھانت بھانت کے لوگ، ایک سے بڑھ کر ایک قابل لوگ... سب کی زبان پر بس ایک ہی بات: ''حق ظاہر ہو گیا، اور باطل بھاگ گیا... ہر وہ نظام جس کی بنیاد اسلام پر نہیں ہے وہ باطل ہے ...تاریخ گواہ ہے کہ فرعون اور نمرود سے مارکس اور لینن تک، اللہ کے ہر باغی کو بالآخر ایک دن شکست نصیب ہوئی ہے...اور یہ...اور وہ...اور وہ!

''میں بھی کچھ کہنا چاہتا ہوں۔'' سنتے سنتے اچانک اسمٰعیل نے ظفر عالم سے کہا۔

"تم؟" ظفر عالم نے اُسے حیرت سے تکا۔

"ہاں میں!"

پتہ نہیں اسمٰعیل کے لہجے میں کیا بات تھی کہ ظفر عالم خموشی سے اُٹھے اور صدرِ مجلس تک اُس کا نام پہنچا آئے۔

جب اُس کا نام پکارا گیا تو وہ بالکل خالی الذہن تھا، مگر ذہن میں خلفشار ضرور تھا، اُسے محسوس ہورہا تھا کہ بات کھل کر اور ایمانداری کے ساتھ نہیں کی جارہی ہے... اِسی خالی الذہنی اور خلفشارِ ذہنی کے ساتھ وہ مائیک کے سامنے آ گیا۔

"وجود خیال کی وجہ سے وجود ہے، جب احترامِ آدم کی بات کی گئی، تو اُسی میں آدم اور بنی آدم کے خیال وفکر کے احترام کا پہلو بھی شامل ہے، یہیں سے آزادیِ اظہار کے احترام کے خوشے پھوٹتے ہیں، شریف انسان اور شریف قومیں مرنے والوں کا مذاق نہیں اُڑاتیں۔ ہم دوسرے خیال وفکر سے اختلاف کرسکتے ہیں مگر ہمارا مذہب اُن کا مضحکہ اُڑانے کی اجازت نہیں دیتا۔ ستّر (۷۰) سال تک قائم رہنے والے نظام کے ناکام ہوجانے پر بغلیں بجانے سے پہلے ہمیں یہ بھی تو دیکھ لینا چاہیے کہ ایک نظام تیس سال ہی میں عمل کے پیمانے پر ناقابلِ عمل قرار دے دیا گیا۔ اگر اُس نظام کی ناکامی کے لیے نظام کو نہیں، اشخاص کو ذمہ دار قرار دیا جاتا ہے تو پھر یہی سلوک اِس نظام کے ساتھ کیوں نہیں روا رکھا جارہا ہے؟

کیا یہاں کوئی شخص یہ کہنے کی پوزیشن میں ہے کہ چودہ سو سال پہلے مساوات اور برابری کی بات ناپسندیدہ بات تھی؟ اگر اس کا جواب انکار میں ہے تو پھر مساوات اور برابری کا نعرہ "کلمہِ باطل" کیوں قرار دیا جارہا ہے؟

یہ بات مان لینے میں کیا برائی ہے کہ دنیا میں جہاں جہاں جتنی جتنی اچھی بات اور اچھا عمل کیا گیا، وہاں وہاں حق تھا، باطل نہیں تھا۔

صورتِ حال پر اگر اس طرح غور کیا جائے تو احساس ہوگا کہ روس میں اشتراکیت کا زوال دراصل سرمایہ داری اور سامراج واد کے عروج کا اینٹینا (قطب نما) ہے اور یہ ہمارے اپنے مشن کی روح کا حصہ نہیں ہے۔ مگر ع

"اس کو کیا جانیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام"

اسمٰعیل کی اس تقریر کا بہت دِنوں تک بہت برا مانا گیا۔

لیکن جماعت کے جلسے میں شرکت کے بعد خود اسمٰعیل کے سامنے سوالات کا ایک انبار سا کھڑا ہوگیا۔ اُسے محسوس ہوا کہ سماج ایک بحرانی دَور سے گزر رہا ہے اور اس میں دیوبندی، بریلوی کی کوئی قید نہیں تھی۔ بس اتنا فرق تھا کہ تہذیبی رسوم کے سلسلے میں بریلوی علما Status quo (جوں کا توں) والی صورتِ حال کے ساتھ چل رہے تھے مگر اُس میں وہ بھی دیوبندیوں سے کم متشدّد نہیں تھے۔

اسمٰعیل کو خانقاہوں میں چین نظر آیا اور وہ صوفی مزاج حضرات سے زیادہ جڑنے لگا۔ اِس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ عوامی سطح پر وہ سنّی یا غیر وہابی سمجھا جانے لگا اور عوامی سطح پر اُس نے اپنے آپ کو زیادہ "قابلِ قبول" بھی محسوس کیا۔

اِس کا ایک ثبوت اُس کو اُس وقت مل گیا جب ایک مدرسے کی صدارت کے لیے اُس سے درخواست کی گئی۔

یہ اُس کے مزاج سے میل کھاتی ہوئی بات نہیں تھی پھر بھی اُس نے اِس دعوت کو ردّ نہیں کیا۔ عمر کے جس حصّے میں وہ پہنچ چکا تھا اور زوالِ روس کے بعد، کمیونسٹ پارٹی سے "لاتعلق" ہونے کے نتیجے میں وہ جس ذہنی اور تنظیمی بکھراؤ اور فشار کو جھیل رہا تھا اُس میں اُسے یہ "ربط" غنیمت محسوس ہوا۔

ڈھلان سے اُترتے ہوئے وہ یادوں کی کائی پر پھسلا تو بہت دور تک اور بہت دیر تک پھسلتا چلا گیا۔ اور جب گاؤں کی مسطح زمین پر اُس کے پیر ٹکے تو اُس نے دیکھا کہ وہ مسلمانوں کے محلے میں داخل ہورہا ہے۔

کچے پکے، بے ترتیب بنے مکانات کا ایک سلسلہ سا کچھ دور تک پھیلا دکھائی دیا۔ زیادہ تر مکانات بند ڈبہ نظر آئے، جس میں باہر سے روشنی، ہوا کے جانے کا کوئی انتظام نہیں تھا، قدِ آدم سے زیادہ بلند چہار دیواری کے بیچ ایک آنگن عموماً ہوا کرتا ہے، جس میں تھوڑی ہوا اور تھوڑی روشنی مقید تو کر لی جاتی، مگر کراس وینٹیلیشن کے ذریعہ تازہ ہوا اور تازہ روشنی کے آدان پردان کا کوئی تصور مسلمانوں میں پنپ سکا، نہ گھر کے لیے نہ دماغ کے لیے۔

جب وہ مدرسے میں پہنچا تو سورج ابھی ڈھلا نہیں تھا۔

لڑکے عصر کی نماز کے بعد تفریح کے طور پر فٹ بال کھیل رہے تھے۔ مدرسوں میں پتہ نہیں کیوں ابھی تک ہاکی، کرکٹ یا بیڈمنٹن وغیرہ متعارف نہ ہوسکا۔ اُسے یاد آیا کہ اُس کے باپ بتاتے تھے کہ ہم لوگ مدرسے کے میدان میں فٹ بال کھیلتے تھے، اور اَب یہ سامنے کے بچے جو باپ کے لحاظ سے تیسری پیڑھی کی نمائندگی کر رہے تھے، یہ بھی اُسی فٹ بال میں مگن تھے۔

اسمٰعیل نے کسی کو خبر نہیں کی تھی اس لیے صدر مدرس اور دیگر حضرات اُسے دیکھ کر اچنبھے میں پڑے، فوراً ایک لڑکے کو سکریٹری اور خازن صاحبان کے گھر بھیجا گیا۔ میدان میں کھیلتے لڑکوں کو بھی اندازہ ہوا کہ کوئی غیر معمولی مہمان آگیا ہے، اس لیے انھوں نے بھی اپنا کھیل جلد سمیٹ لیا، ویسے بھی مغرب کا وقت قریب ہو چکا تھا، اسمٰعیل نے وضو کی خواہش ظاہر کی، ایک صاحب اُسے لئے ہوئے میدان کے اُتّری کنارے کی طرف بڑھے، بیت الخلاء، استنجا گاہ، غسل خانہ اور وضو خانہ سب اُسی طرف تھے۔

نماز کے بعد سبھی لوگ صدر مدرس کے کمرے میں آگئے۔ مدرسہ والوں نے ناشتے کا انتظام کیا تھا، دورانِ ناشتہ معلوم ہوا کہ میدان میں کھیلنے والے زیادہ تر لڑکے گاؤں کے تھے۔

''بیرونی لڑکے کتنے ہیں؟'' اسمٰعیل نے پوچھا۔

''بہت کم ہیں جناب۔''

''پھر بھی... کتنے؟''

''اصل میں ایسا ہے کہ صدر مدرس تو گاؤں ہی کے ہیں۔ ہندی، انگریزی اور حساب کے لیے بھی گاؤں ہی سے ایک صاحب مل گئے ہیں، باہر کے لڑکے تو بس حافظ صاحب ہی لاتے ہیں، یہ ابھی سات ہی لا سکے ہیں۔''

''لیکن ہمیں تو بتایا گیا تھا کہ باہر کے پچیس تیس لڑکے ہیں۔'' اسمٰعیل نے حیرت جتائی۔

''آپ کو جب خبر ملی تب یہاں دوسرے حافظ صاحب تھے، وہ اپنے ساتھ پندرہ بچے لائے تھے مگر پاس کے ایک گاؤں کے لوگوں نے اُن کو بہکایا، نتیجتاً وہ یہاں سے چلے گئے اور اپنے بچے بھی ساتھ لے گئے۔''

''تو آپ پڑھاتے کیا ہیں؟''

''قرآن شریف پڑھنا سکھاتے ہیں اور حفظ کراتے ہیں۔'' صدر مدرس بولے۔

''نہیں بھائی اردو ہندی، انگریزی اور حساب بھی پڑھایا جاتا ہے۔'' سکریٹری نے جلدی سے بات کاٹی۔

''ہاں، ہاں! وہ سب تو خیر ہے ہی۔'' صدر مدرس نے اُکتائے ہوئے لہجے میں ہاں میں ہاں ملائی۔

عشا کی نماز کے بعد ایک آدمی خوانچے میں کھانا لایا۔ اسمٰعیل نے اندازہ لگایا مدرسے کے مطبخ میں کھانا پکنے کی کوئی سن گن نہیں سنائی دی، وہ پانچ سات لڑکے بھی نظر نہیں آرہے تھے۔

''کھانا باہر سے کیوں آیا؟ لڑکوں کے ساتھ مطبخ میں ہی کھا لیا جاتا۔'' اسمٰعیل نے کہا۔

''ایسا ہے حضرت کہ تھوڑے سے لڑکے رہ گئے ہیں، دو لڑکے میرے یہاں کھا لیتے ہیں، ایک سکریٹری صاحب کے یہاں ایک خازن صاحب کے یہاں، باقی تین بچے گاؤں کے تین گھروں میں کھا لیتے ہیں۔'' صدر مدرس نے آہستہ سے وضاحت کی۔ [بعد میں پتہ چلا کہ جو صدر مدرس تھا اُسی نے تعلیم سے فراغت کے بعد یہ مدرسہ شروع کیا تھا] ''تو پھر آپ لوگ جو اتنا سارا زکوٰۃ اور چمڑے وغیرہ سے پیسہ جمع کرتے ہیں، اُس کا مصرف کیا ہے؟''

''حضور! یہ مدرسے کی تعمیر کا خرچ اور مدرسین کی تنخواہ وغیرہ اُسی سے تو دی جاتی ہے۔'' سکریٹری بولا۔

''کیا ان مصارف میں زکوٰۃ کے خرچ کی کوئی مذہبی اجازت ہے؟''

اس سوال پر سب خاموش رہے۔ اسمٰعیل نے اپنے اندر ایک اُکتاہٹ سی انکرتی محسوس کی۔

دوسری صبح، سورج نکلنے کے بعد آہستہ آہستہ گاؤں کے بچے بھی آنے لگے اور دس ساڑھے دس کے آس پاس بچوں کی پڑھائی کا سلسلہ شروع ہوا۔ بچوں کا پڑھنے اور پڑھانے کا طریقہ دیکھ کر اُسے اپنے بچپن کا زمانہ یاد آگیا، ساٹھ برس سے زیادہ کی مدت گزر چکی تھی، مگر مدرسوں کے ''طرزِ تعلیم'' میں ترقی تو دور کی بات ہے تبدیلی بھی نہیں آسکی تھی۔ حیرت اس بات پر تھی کہ بہار سے ہزاروں کلومیٹر دور مہاراشٹر اور کرناٹک کے علاقوں میں بھی طریقۂ تعلیم نہ تو مختلف رہا اور نہ اُس میں کوئی بدلاؤ آیا۔

''یہ جُوں کی توں والی کیفیت کیوں ہے؟''

اُسے درخت یاد آئے جو ہر سال اپنی چھال بدلتے ہیں، پرندے یاد آئے جو اپنے پر جھاڑتے ہیں، جاندار جسم یاد آیا جو اندر سے باہر تک لگاتار اپنے کو ادلتا بدلتا رہتا ہے۔ مگر یہ لوگ؟

اُسے شترمرغ یاد آیا، جو ریت میں سر چھپا کر سمجھتا ہے کہ طوفان ٹل گیا، یا وہ مینڈک جو کنویں میں رہتا ہے اور کنویں ہی کو سمندر سمجھتا ہے۔

وہاں موجود لوگوں کی باتیں بھی اُس کے سر کے اوپر سے گزرتی رہیں... مسلمان کے علاوہ سب جہنمی ہیں... جس مذہب و مسلک کے وہ پیرو ہیں وہی حق ہے، باقی سب باطل... مسلمانوں کے سب دشمن ہیں... ساری دنیا میں اسلام کے خلاف سازش کی جا رہی ہے۔ مذہبی عالم وہی ہے جو کرتا پاجامہ ٹوپی پہنے اور داڑھی رکھے۔

وہ اُوب گیا اور شام ہونے سے پہلے ہی گاؤں سے نکل آیا، اور پھر کبھی کسی مدرسے کا رُخ نہیں کیا۔

• • •

14

کوچنگ سے اُس کو مالی فائدہ تو ضرور پہنچ رہا تھا، مہینے میں پانچ سات ہزار کے آس پاس اُسے مل جاتے تھے جس سے کم از کم باورچی خانے کی ضرورت پوری ہو جاتی تھی، مگر باقی مسائل تو ویسے ہی منھ پھاڑے کھڑے رہتے تھے۔ بیٹا انٹر کر چکا تھا، ظاہر ہے اِس کے بعد مڈیکل نہیں بھی تو کم از کم انجینئرنگ کے مقابلے کے امتحانات، اور اگر وہ کامیاب ہو جاتا ہے تو انجینئرنگ کالج کا خرچ، بیٹی بھی کالج میں آ چکی تھی۔

یہ سیکولر اور فرقہ پرست طاقتوں کے اتحاد کا زمانہ تھا۔

نتیش کمار اور سوشیل کمار مودی کی دوستی!

عجیب و غریب زمانہ، جس میں سامنے کچھ نظر آتا تھا مگر جو نظر آتا تھا اُس پر یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا کہ یہ واقعی وہی ہے جو نظر آ رہا ہے اور جو نظر نہیں آتا تھا احساس ہوتا تھا کہ وہ ہے کہیں ضرور!

لالو پرشاد جیل جا چکے تھے، نتیش لالو کی دشمنی اپنے عروج پر تھی۔ بہار میں کہیں کوئی فرقہ وارانہ فساد نہیں ہو رہا تھا، فضا میں فرقہ وارانہ تناؤ بھی نہیں تھا، مگر بھارتیہ جنتا پارٹی والوں کے حوصلے بہت بلند تھے، اب ایک نئی چیز ''شیو چرچا'' شروع ہوئی تھی۔ ہر گاؤں میں، پنچایت میں، کنارے کے محلوں میں شیو چرچا ہوتی، لوگ جوق در جوق جمع ہوتے، اُس میں مسلمانوں کے خلاف کوئی بات نہیں کی جاتی مگر پراچین سنسکرتی کا خوب چرچا ہوتا، مسلمانوں کے خلاف کچھ نہیں بولا جاتا البتہ وِشو ہندو پریشد اور ہندو واہنی والے جب نہ تب گائے بھینس لے جاتے کسی آدمی کو پکڑ لیتے، اُسے مارتے پیٹتے یا اگر مارتے نہیں تو پولیس کے حوالے کر دیتے، پولیس اُن پر ایف آئی آر درج کر کے اُن کو حوالات میں ٹھونس دیتی، جانور سب آزاد کرائے جاتے، کچھ جو پسند آتے وہ وی.ایچ.پی. اور ہندو واہنی کے رضاکار اپنے ساتھ لے جاتے، جو باقی بچتے گئو سرکھچا سمیتی کے حوالے کر دیے جاتے۔

بات جب آگے بڑھتی تو بی جے پی والوں کا بیان آتا: ''غلط بات ہے، قانون اپنے ہاتھ میں

نہیں لینا چاہیے۔''

بجلی کا نظام پہلے سے بہتر ہو رہا تھا، سڑکیں بنائی جا رہی تھیں، بی جے پی والوں نے نتیش کمار کو ''سوشاسن بابو'' کا خطاب دے رکھا تھا۔ بھارتیہ جنتا پارٹی والوں سے نتیش کی دوستی اتنی گہری تھی کہ ۲۰۰۲ء کے گجرات فسادات کے بعد بھی نتیش کمار نے نریندر مودی سے ہاتھ ملایا تھا، مگر بہار میں امن چین تھا۔

۲۰۱۰ء کے انتخاب میں بھی نتیش کمار ہی کامیاب ہوئے، البتہ بھارتیہ جنتا پارٹی کے اتنے زیادہ ارکان اسمبلی میں منتخب ہو کر آ گئے کہ سوشیل کمار مودی کو نائب وزیر اعلیٰ بنانا ہی پڑا۔

کئی جگہوں پر بی جے پی والے یہ کہتے سنائی دیے: ''بس اب وزیر اعلیٰ کی کرسی باقی ہے۔''

صوبے میں چاروں طرف امن وسکون براجتا تھا۔

ماموں کے انتقال پر اسمٰعیل پٹنہ گیا تو دیکھا کہ اسٹیشن پر واقع مہاویر مندر کا احاطہ اور چوڑا ہو گیا ہے اور جگہ جگہ جو گوالے ''کھٹال'' کھڑا کیے ہوئے تھے، وہ ہٹ گئے ہیں۔ مسلمان نتیش کمار کی پارٹی میں جوق در جوق داخل ہو رہے ہیں۔

لالو پرشاد کا کباب منتری وقت کی گہری دھند میں چھپ گیا تھا۔

نتیش کمار کی طرح داڑھی رکھنے والا اِتراتا پھرتا تھا کہ ''میں تو نتیش کی طرح لگتا ہوں۔''

سوئم کی قرآن خوانی اور فاتحے کے بعد وہ ٹہلتا ہوا پٹنہ یونیورسٹی کی طرف بڑھا تو پٹنہ میڈیکل کالج کے باہر شمشان گھاٹ لے جانے والے لکڑیوں کے ہلکے تابوت اور بطورِ کفن پہنائے جانے والے گیروے وَستروں کی دکانیں نظر آئیں، ذرا اندر جھانکا تو کارڈیالوجی ڈپارٹمنٹ کے آس پاس مندر میں بھجن سنائی دیا اور دربھنگہ ہاؤس سے ہو کر گھاٹ تک جانے والا راستہ چڑھاوے کے پھولوں اور مٹھائیوں کی دُکانوں میں چھپتا نظر آیا۔

شعبہ اردو ''دربھنگا ہاؤس'' سے باہر آ چکا تھا۔ اقبال ہوسٹل کی ''عبادت گاہ'' کے آس پاس اُس کی نئی عمارت بن گئی تھی—— ''تم یہیں رہو!''

اردو اکیڈمی، انجمن ترقی اردو، سنّی وقف بورڈ، شیعہ وقف بورڈ کے سالانہ بجٹ میں اضافہ کیا گیا، خانقاہوں کو فروغِ علم وتصوف کے لیے خطیر نذرانے دیے گئے، قبرستانوں کی چہار دیواری کا سلسلہ دراز ہوا، حکومت کی طرف سے اقلیتی ہوسٹل بنائے گئے۔

مہاویر مندر کے چڑھاوے سے ہندوؤں نے کینسر اسپتال قائم کیا۔

اُسی دن شام ڈھلے، سسرال کی بیٹھک میں گپ شپ چل رہی تھی، اُسی وقت بڑے سالے کا بیٹا ایک فارم لے کر بڑے سالے کے پاس آیا۔

''ابا! اس کو دیکھ لیجیے، ٹھیک بھرا ہے نا!''

''کیا ہے یہ؟'' اسمٰعیل کے منھ سے یونہی نکل گیا۔

''پاسپورٹ بنوانے کے لیے فارم جمع کرنا ہے۔'' بیٹے نے جواب دیا۔

''الیکشن آئی ڈی ہے نا؟''

''جی! وہ تو ہے ہی!''

''تو پھر پاسپورٹ کیوں؟''

''ارے بھائی، نوکری کہاں ملتی ہے، باہر تو جانا ہی پڑے گا۔'' سالے نے جواب دیا۔

''اب ایسا بھی کیا کہ تعلیم ختم ہونے کے ساتھ ہی باہر جانے کے بارے میں سوچا جانے لگے۔''

''نہیں بھائی۔ صورتِ حال تو کچھ ایسی ہی ہے۔'' پاس ہی بیٹھے مرتضیٰ بھائی بولے۔ ''بی. پی. ایس. سی. اور آئی. اے. ایس. تو کچھ ہی بچّے نکال پاتے ہیں۔ لکچررس کی جگہیں ڈھیر ساری خالی پڑی ہیں، مگر ۲۰۰۳ء کے بعد نئی تقرریوں کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ اسکول کی نوکری میں بھی ایسی مارا ماری ہے کہ خدا کی پناہ!''

''اور پھر اُس دوڑ میں اگر شامل ہوا جائے تو ریزرویشن کا چکر ایک الگ مصیبت۔'' قسیم الدین صاحب نے مرتضیٰ صاحب کی ہاں میں ہاں ملائی۔ ''اگر سو جگہیں نکلتی ہیں تو ریزرویشن، روسٹر اور اسٹافنگ پیٹرن کا خیال کرنے کے بعد جنرل کوٹے میں پچیس تیس سے زیادہ جگہیں باقی نہیں بچتیں اور اِن پچیس تیس جگہوں کے لیے ہزاروں ہزار درخواستیں ٹپک پڑتی ہیں، اور اس کے بعد بھی نہیں کہا جا سکتا کہ جو اسامی نکلی ہے اُس پر تقرری ہو ہی جائے گی، کوئی بندہ کوئی نکتہ نکال کے عدالت چلا جائے گا اور سارا معاملہ کھٹائی میں پڑ جائے گا۔ بہت مشکل ہو گئی ہے صاحب!''

شام گہری ہو چکی تھی، اسمٰعیل نے کھڑکی سے باہر دیکھنا چاہا تو کچھ نظر نہ آ سکا۔

رات میں اُسے سوتے سوتے یاد آیا کہ فیضان رسول بھی تو اِن دنوں یہیں ہے۔ پٹنہ میں!

❖

فیضان اُس نے جب ایم اے کیا تھا تب بحیثیت لکچرر تقرری کے لیے پی ایچ.ڈی.کی شرط نہیں تھی، اُس زمانے میں تو ہر سال وائس چانسلر کے ذریعہ کچھ نہ کچھ تقرریاں کی جاتی تھیں، جن میں ٹاپ کرنے والوں کو کہیں نہ کہیں پروانۂ تقرری مل ہی جاتا تھا۔ جو بچتے تھے اُنہیں یو.جی.سی. سے فیلوشپ مل جاتی تھی اور پی ایچ.ڈی. کرتے کرتے کہیں نہ کہیں تقرری ہو جاتی تھی۔

فیضان ٹاپ تو نہیں کر سکا تھا مگر فرسٹ کلاس میں اچھے نمبر حاصل کئے تھے، سبھی کو اُمید تھی کہ شعبہ سماجیات میں اُس کی نوکری کوئی مسئلہ نہیں بنے گی۔

مگر کچھ باتیں عجیب ہوتی ہیں، سمجھ میں نہ آنے والی۔ ایم.اے. کرنے کے دو مہینے کے اندر اُس کے والد کا انتقال ہو گیا، وہ اچھے بھلے تھے، کوئی حادثہ نہ کوئی بیماری، ایک رات سوئے تو پھر جاگ نہ سکے۔

جب والد کے چہلم کے بعد فیضان نے اپنے اردگرد دیکھا تو اُسے پتہ چلا کہ چار بھائیوں اور تین بہنوں کی ذمہ داری اُس کے سر ہے۔

کھلے آسمان میں، جلتی زمین پر، بھری دوپہر میں ننگے پاؤں چلنے کا احساس!

زمینیں بچی ہوئی تھیں، شہر میں باپ نے ایک زمین خریدی تھی اور اُس نے مکان بنوانا بھی شروع کر دیا تھا، کام ادھورا ہی سہی مگر ایک سرمایہ تو وہ بھی تھا۔

فیضان نے جس زمانے میں ایم.اے. پاس کیا، اُس وقت کالج میں نوکری کا ملنا بہت مشکل نہیں تھا، مگر ہیڈ، پرنسپل یا سکریٹری کے آس پاس رہنا، اُن کو نظر آتے رہنا، اور اُن کی خدمت میں حاضری تو لگاتے ہی رہنا پڑتا تھا۔

فیضان یہ سب کیسے کرتا؟؛

فیضان تو ایک چکرویو میں گھر گیا تھا، باپ ساری زندگی زمینداری کے بل پر جی گئے، زمینداری ضبطی کے بعد بھی اتنی زمین بچ گئی تھی کہ سال بھر کے لیے گھر کا خرچہ نکل آتا تھا، مگر اس ''آمدنی'' کے لیے فیضان کے والد صبح سے شام تک کھیتوں سے جڑے رہتے، کب دھان لگنا ہے، کب دلہن کی بوائی ہونی ہے، کھیت کے کس حصے میں سبزی لگوانی ہے، دھان کب پکے گا اور کیسے پکے گا، کھیت

کو کب کھاد اور پانی کی ضرورت ہے، آب پاشی کا انتظام کیسے کرنا ہے، کمیا اور مزدور کیسے جڑا رہے گا، کون ساتھ ہے کون بھاگ کے دوسرے کاشتکار کے پاس چلا گیا، گھر میں غلّہ آیا تو اُس کی حفاظت کیسے ہوگی؟

فیضان کے والد کی ساری زندگی اِنہی خرخشوں میں گزر گئی۔ آدمی عقل مند تھے محسوس کر رہے تھے کہ یہ سارا سلسلہ بہت دنوں تک نہیں چل سکے گا، اس لیے انہوں نے فیضان کو تعلیم کی طرف راغب کیا، فیضان نے بھی تعلیم حاصل کر لی مگر!

دیکھیے قسمت کی خوبی کہ ٹوٹی کہاں کمند
دو چار ہاتھ جب لبِ بام رہ گئے

فیضان نے اچانک اپنے آپ کو ایک پرشور سمندر میں ہچکولے کھاتے پایا۔

اُس نے میٹرک تو گاؤں کے پاس کے ایک اسکول سے کیا مگر میٹرک کے بعد آگے کی تعلیم کے لیے جو باہر نکلا تو پھر وہ گاؤں کی ساری باتوں اور کھیتی زمینداری کے سارے مسائل سے تقریباً کٹ سا گیا۔

پھر ایک دن اچانک اُسے محسوس ہوا کہ ساری ذمہ داری تو اُسی کے سر ہے۔

والد کی موت پر ایک بڑا ہجوم اِردگرد جمع ہوا، چالیس کے فاتحے تک بڑی ہمہ ہمی رہی۔ نولیش کے ماں باپ اور اُس کی بہن بھی آئی تھی۔ نولیش کی ماں، اُس کی موسی نے اُسے گلے لگایا تھا اور بہت گلوگیر لہجے میں کہا تھا: ''بیٹا میں ہوں، تیری موسی نہیں ماں ہوں، تیری دو مائیں زندہ ہیں، اپنے کو اکیلا مت سمجھنا۔''

پاس ہی نولیش کی بہن رَما کھڑی تھی۔

موسی کے گلے ملتے ہوئے فیضان کی نگاہ اُس تک پہنچ گئی۔

پس منظر میں اِکتارے پہ میرا گا رہی تھی۔

وِش کا پیالہ رانا **بھیجیا**
امرت کر آروگی رے
امرت کر آروگی رے
امرت کر آروگی رے

پھر یک بارگی سامنے کا ہر منظر بجھ گیا۔ نہ موسی، نہ گھر، نہ غم کا وہ پل، نہ اردگرد جمگھٹا لگائے لوگ، نہ در، نہ دیوار، نہ مکین، نہ مکان، نہ زمان، عجب ایک سلسلہ تھا، عجب ہمہمہ تھا، عجب زمزمہ تھا، کہیں کوئی باغ تھا، اُسی باغ میں، کوئی کنج تھا، اُسی کنج میں کوئی خواب تھا...اُسی خواب میں...اُسی خواب میں...نرم شگوفوں کی سیج پہ مخمل کی چاندنی...اُس چاندنی پہ کوئی چہرہ جیسے...زرتار کے گوٹوں سے بنے دوپٹے کی گھونگھٹ کاڑھے...کن انکھیوں سے اُس کی جانب دیکھتا تھا...اُس کی آنکھیں ...اُس کی آنکھیں...

وہ آنکھیں مجھ سے کہتی ہیں/ کہ میں جھوٹی نہیں ہوں/ مگر لب سے/ مرامدت سے یارانہ نہیں ہے/ وہ آنکھیں مجھ سے کہتی ہیں/ سمندر ساحلوں سے/ پرے ہو کر بھی ساحل کی حدوں کا راہرو ہے/ سمندر، ریگ ہے/ ساحل ہے پیاسی سیپ ہے/ سمندر درد ہے/ ہجرت ہے/ سمندر!/ تسلسل ہجر کے بے اِنتہا غم کا/ سمندر بس وہ نقطہ ہے/ جہاں ساحل اُداسی سے/ خود اپنے ہی کناروں کے/ سمندر میں کٹ کٹ کے گرنے کا منظر دیکھتا ہے/ وہ آنکھیں مجھ سے کہتی ہیں/ یہ لمحہ اک سمندر ہے/ میں ساحل ہوں/ سمندر سے ملن کی موہ مایا میں/ ازل سے سمندر کے کناروں پر/ ہر کنارے پر/ ہر اک جانب/ میں ساکت/ بس کھڑی ہوں/ خود اپنے ہی کناروں کے/ سمندر میں کٹ کٹ کے گرنے کا منظر دیکھتی ہوں/ میں کٹتی جا رہی ہوں/ سمندر میں گرتی جا رہی ہوں/ مگر لب سے/ مرامدت سے یارانہ نہیں ہے/ وہ آنکھیں مجھ سے کہتی ہیں...
وہ آنکھیں...
وہ آنکھیں...

رَما کی آنکھیں ایک لمحے کے لیے فیضان کی طرف اُٹھی تھیں، پھر جھک گئی تھیں۔
موسی چلی گئیں، وہ مہربان لمحہ بیت گیا، فیضان پھر ایک مرتبہ لق ودق صحرا کے مقابل تھا۔

❖

فیضان زندگی کے جلتے سلگتے صحرا کے مقابل آیا تو مدتوں اُس کی مثال کڑاہ میں جلتے بھنتے اور باربار اُچھلتے اور اُچھل اُچھل کر کڑاہ میں ہی گرتے دانے کی رہی—

باپ کے چالیسویں کے دوسرے یا تیسرے دن وہ گھر ہی میں تھا کہ ایک اسامی بلاس کی آواز آئی۔ ''مالک ہیں؟''
''کیا بات ہے؟'' وہ باہر آیا۔
''گوڑ لگے ہیں مالک!''
''کیا بات ہے؟ سویرے سویرے آئے ہو، کشل منگل تو ہے؟''
''کرپا ہے مالک کی۔ کھیت پر گئے تو دیکھا کہ اپنے کھیت میں رہٹ سے پانی جائے کے جو کیاری بنی تھی، اُوکو بیچے سے کاٹ کے منگلو کھاں اپنے کھیت میں پانی پٹار ہے ہیں۔''
''منگلو خاں ہمیشہ یہی سب کرتے ہیں، آتے ہیں دیکھیں گے۔''
بلاس کو رخصت کرکے فیضان اندر آیا تو ماں نے اُسے اپنے پاس بلایا اور کہنے لگیں۔ ''بیٹا جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا، تمہارے ابا تو رخصت ہو گئے، اب گھر میں تو تمہیں بڑے ہو، سب بھائی بہنوں کے سرپرست ہو، اب ذرا باہر نکلو، سب کھیت باڑی دیکھو، گیا میں جو مکان بننا شروع ہوا تھا وہ بھی ادھورا رہ گیا۔ بھائی بہنوں کی پڑھائی کا مسئلہ ہے، بڑی کے لیے رشتہ بھی دیکھنا چاہیے، میرے پاس کچھ پیسہ ہے وہ لے لو، ابا کی صندوقچی میں دیکھو، پاس بُک اُسی میں ہوگی، کتنا پیسہ ہے، کھیت کا لگان وغیرہ بھی تو دینا پڑے گا، اُس کا بھی وقت قریب ہے۔''
اماں ایک ہی سانس میں اتنی بات کہہ گئیں کہ وہ اماں کو یہ بھی یاد نہیں دلا سکا کہ میں نے ایم.اے. فرسٹ کلاس سے پاس کیا تھا تو ابا نے کہا تھا کہ پی ایچ.ڈی. کرلو اور اِسی بیچ کسی کالج میں لکچر شپ کے لیے پتہ چلاؤ۔''
اُس نے ایک نظر آنگن کی طرف کی، گھر کے ماحول میں ابا کی غیر موجودگی تو محسوس ہو رہی تھی مگر گزشتہ کچھ دنوں سے جو اُتھل پتھل تھی اُس میں اب ٹھہراؤ آتا محسوس ہو رہا تھا۔ گھر میں کام کرنے والا عملہ اپنے اپنے کاموں میں مشغول تھا، ایک بھائی نہا رہا تھا، ایک اپنے جوتے پالش کر رہا تھا، ایک بھائی بہن سے گفتگو میں مصروف تھا، دوسری بہن ریڈیو پر کچھ سن رہی تھی، بڑی ماں کا بستر تہہ کر رہی تھی۔
فیضان کو یہ سب کچھ عجب اَٹ پٹا سا محسوس ہوا، زندگی کے رنگ ڈھنگ بھی عجب ہیں ایک موسم گزر جاتا ہے، دوسرا سہج سہج سارے منظر نامے پر حاوی ہو جاتا ہے، جانے والا زندگی کے منظر

نامے سے کیا غائب ہوجاتا ہے؟ زندگی حرکت کے سہارے قائم ہے اور تحرک کا فلسفہ عجیب کہ کائنات کا ہر زندہ مرحلہ ایک نقطے پر ٹھوس صورت میں دکھائی دیتا ہے اور بغیر محسوس کیے اُس آخری نقطے تک پہنچ جاتا ہے جس کے بعد اُس کا ''ٹھوس پن'' اُس کی نظر آنے کی صلاحیت ختم ہونے لگتی ہے۔ ہر شے ہلاک ہونے والی ہے، استہلاک کا فلسفہ یہی ہے کیا؟

ابا بھی منزلِ ہلاکت تک پہنچ گئے!

اندر اندر اُداسی اپنے پر پانکھ پھیلانے لگی، ابا بہت زور سے یاد آ رہے تھے۔

ناشتے کے بعد وہ کھیت پر گیا، اپنی کٹی ہوئی کیاری دیکھی اور بلاس سے کہا: ''اسے بند کر دو اور جس وقت بھی منگلو خاں اِسے دوبارہ کھولنے کی کوشش کریں، مجھے فوراً خبر کرو۔''

وہاں سے وہ کھیتوں کے دوسرے رقبے کی طرف چلا گیا، دیہات کے لوگوں کی زندگی تو کھیت پر منحصر رہتی ہے، اُسی کے پرکھوں نے سیکڑوں ایکڑ کی جائیداد چھوڑی تھی، مگر نسلوں میں بٹتے بٹتے وہ مختصر ہوتی گئی، اُس کے باپ کے حصے میں صرف پچاس بیگھے کھیت آئے تھے، جینے کے لیے یہ کافی تھا، اُس کے باپ نے پشتینی جائیداد کی حفاظت بھی کی تھی، مگر کچھ ہی دنوں بعد اُسے احساس ہوا کہ یہ اتنا آسان مرحلہ نہیں ہے، کھیت سے پوری طرح جڑنا ہوگا، اُسے یاد آیا اس کے باپ کی تو صبحیں اور شامیں انہیں کھیتوں کی فکر میں گزر جاتی تھیں، کھیتوں کی حفاظت، دیکھ بھال او رمالکانہ حیثیت بنائے رکھنے کی ہوش مندی تو بنیادی مسئلہ تھی ہی، اُس کے ساتھ ساتھ کھیتوں کو اُپجاؤ بنائے رکھنے کے لیے صحیح وقت پر کھاد کا انتظام، بارش نہیں ہوئی تو پانی کا انتظام، کس کس موسم میں دھان لگنا ہے، کس موسم میں گیہوں، دلہن، سبزی، اُسے احساس ہوا کہ وہ تو کچھ بھی نہیں جانتا، پھر منگلو خاں جیسے لوگوں کا معاملہ، ایک منٹ کیلئے وہ گھبرا سا گیا، کیسے ہوگا یہ سب؟ پی ایچ. ڈی. کے لیے اُسے پٹنہ جا کر صدرِ شعبہ اور دوسرے اساتذہ سے ملنے کی ضرورت تھی۔ مگر گھر کس پر چھوڑ کر جائے، نکسل تحریک اپنے عروج پر تھی، کس وقت کیا ہوجائے کہا نہیں جاسکتا۔ اُس پر اُس کے سوتیلے چچا لوگ، وہ تو باپ کے زمانے میں بھی دادا کے کئے ہوئے بٹوارے پر سوال اُٹھاتے رہتے تھے، کئی مقدمے کئے، اُسے یاد آیا ایک مقدمہ تو ابھی تک کچہری میں چل رہا ہے۔

دن پر دن گزرتے گئے، فیضان اپنے حالات میں ایسا گھرا کہ گاؤں سے باہر قدم ہی نہیں نکال سکا، برس اوپر گزرتے گزرتے پی ایچ. ڈی. کا خیال بھی اُس کے ذہن سے نکل گیا، اِسی بیچ رَما کی

شادی ہوگئی۔ وہ کیا کرسکتا تھا۔ شادی کے دن اُس کی عجیب کیفیت تھی، سب سے زیادہ خوش وہی نظر آرہا تھا۔ کئی دنوں تک نولیش کے ساتھ ایک پیر پر کھڑا رہا، ایک موقع پر نولیش کے پتا جی نے لوگوں کے درمیان ہنستے ہوئے کہا بھی کہ ''نولیش اور فیضان دونوں بھائیوں نے مجھے تو کوئی کام کرنے ہی نہیں دیا۔''

رخصتی کے وقت اُس کی ہمت نہیں ہوئی کہ وہ رما سے نظریں ملا سکے۔

گھر آنے کے بعد وہ سارا دن اور ساری رات سوتا رہا، پتہ نہیں سوتا رہا یا جاگتا رہا، مگر دماغ عجب بے خیالی کے حصار میں تھا جس میں ہیولے بنتے ہیں ٹوٹ جاتے ہیں، شبیہیں ایک دوسرے سے ٹکراتی ہیں اور ایک دوسرے میں تحلیل ہوتی رہتی ہیں، کبھی کبھی اُسے گمان ہوتا کہ وہ رما کو دیکھ رہا ہے، وہ لمحہ جب وہ باپ کے انتقال پر اُس کے گھر آئی تھی، رخصت ہوتے ہوئے رما کی آنکھیں، کبھی سرخ، کبھی آنسوؤں سے بھری، کبھی کبھی تمسخر سے دیکھتی، کبھی گھبرائی گھبرائی... پھر رما کے اِردگرد اُس کی اپنی بہنیں کھڑی نظر آتیں، اُن کے پیچھے اس کے بھائی نظر آتے، وہ خواب ہی میں اُچک اُچک کر رما کو دیکھنے کی کوشش کرتا، مگر وہ کہیں نظر نہیں آتی، پھر کہیں دور سے سیاپے کی آواز سنائی دیتی اور پھر ایسا محسوس ہوتا کہ گھر میں اُس کی ماں بہنیں نہیں صرف رودالیاں ہیں...سیاہ لباس پہنے، ماتم کرتی، رودالیاں سارے منظرنامے پر چھا جاتیں!

آہستہ آہستہ وہ فیضان رسول ایم. اے. کے بجائے ایک دیہاتی کسان بن گیا۔

اسمٰعیل فیضان سے ملا تو ایک لمحے کے لیے فیضان کو پہچان بھی نہ سکا۔

''تمہیں کیا ہوا؟''

''اتفاقات ہیں زمانے کے۔'' فیضان ذرا سا مسکرا کر آہستہ سے بولا۔

''اتفاقات تو سبھی جھیلتے ہیں۔ تم نے کوئی نیا تو نہیں جھیلا۔''

چھوڑو۔ اپنی سناؤ، پروفیسری کیسی چل رہی ہے؟''

''میں اپنی بھی سناؤں گا، مگر تم میری بات ہوا میں نہ اُڑاؤ۔''

''کیا سناؤں یار۔ حالات کا مارا ہوا آدمی کیا بتائے؟''

''کیا اتفاقات اور حالات وغیرہ کی رٹ لگا رکھی ہے۔ دنیا تو دھوپ چھاؤں کے رنگوں سے بنی ہی ہے۔''

''میرے لیے ایک مسلسل جلتی تپتی سلگتی دوپہر مقدر کردی گئی ہیں۔''

''یہ فراری بیان ہے اور قنوطی طرزِ فکر ہے، یہاں ہر صورتِ حال پا سنگِ فیز ہے۔''

''یہ تمہارے سوچنے کا انداز ہے۔''

''میں یہی تو جاننا چاہتا ہوں۔'' اسمٰعیل جھلاّ کر ذرا زور سے بولا۔ ''کہ یہ تمہارا اندازِ فکر کیوں نہیں ہے؟''

''اسمٰعیل! تم نہیں سمجھ سکو گے، تم ایک کالج میں پروفیسر ہو، شہر میں رہتے ہو، چھوٹا سا خاندان ہے، تم نے کبھی دیہات کی زندگی نہیں گزاری ہے، ابا کے انتقال نے ایک پنڈورا بکس کا ڈھکن کھول دیا، ساری بلائیں مجھ پر نازل ہوگئیں، بات منگلو خاں کے کیاری کاٹنے سے شروع ہوئی، پھر میرے ایک سوتیلے چچا نے جھوٹی گواہی کی بنیاد پر میرا کئی کھیت ہڑپ لیا، گاؤں میں اعلیٰ ذات اور پسماندہ کا معاملہ تو پہلے سے تھا، اس بھس میں چنگاری ڈالنے کا کام ہمارے رشتہ داروں میں سے ایک صاحب نے کیا کہ مسجد کے امام کو یہ کہہ کر نکال دیا کہ ''ہم لوگ سیّد امام کے پیچھے نماز پڑھیں گے۔'' نتیجہ یہ ہوا کہ دو مسجد ہی نہیں بنی، گاؤں کی درگاہ پر الگ الگ چادریں بھی چڑھنے لگیں۔ دو گروپ بن گئے، دونوں میں مار پیٹ ہوگئی، پھر پتہ نہیں کس کمبخت نے مسجد میں سور کے گوشت کا ایک ٹکڑا پھینک دیا، فارورڈ، بیک وارڈ کے مسئلے نے فرقہ وارانہ رُخ اختیار کرلیا، اور اِن سب کا سب سے افسوس ناک انجام یہ ہوا کہ گاؤں کے اِردگرد کے گوالوں نے گاؤں والوں کو جمع کر کے باضابطہ دھمکی دی کہ ''تم لوگ اگر اب لڑو گے تو ہم لوگ لاٹھی سے تم لوگوں کی خبر لیں گے۔'' ساری ہیکڑی نکل گئی، کل تک خانقاہ اور مدرسے کے لوگ ثالثی کے لیے بلائے جاتے تھے اور اَب آج وہ دوسروں کی نظرِ کرم کے محتاج ہیں۔ مدرسہ کا انتظام تو ابا ہی کے ذمہ تھا، نتیجہ یہ کہ مدرسہ بند ہوا تو اِس کی پھبتی بھی مجھ پر کسی گئی۔

اِدھر نکسل ازم کا مسئلہ الگ دردِ سر ہے، ٹھیک ہے۔ مسلمانوں سے کوئی خاص ٹکراؤ نہیں ہے، مگر علاقے میں سیّد شیخ اور خان صاحبان نے بھومیار اور راجپوت سے تعلقات بنا کر رکھے، اُس کا نتیجہ اب یہ سامنے آرہا ہے کہ سارے انصاری، راعین، ادریسی اور منصوری نکسلائٹوں سے قریب آرہے ہیں، جو بات کبھی نہیں ہوئی، اب ہو رہی ہے کہ گاؤں میں پارٹی کی میٹنگیں ہو رہی ہیں۔

ایک عجب قسم کی گھٹن، خوف، شک وشبہ بلکہ نفرت انگیز ماحول پورے گاؤں پر چھایا ہوا ہے،

بچوں کو اسکول بھیجتے ہوئے ڈر لگتا ہے، شہر میں پڑھانے کے لیے زیادہ پیسہ چاہیے، جو ابھی ممکن نہیں، گھر چھوڑ کر نکلنے کو جی نہیں چاہتا کہ جانے کب کیا ہو جائے، ایک بہن شادی کے لائق ہے، مگر کہیں آیا جایا جائے تب تو کوئی صورت نظر آئے، کوئی بات آگے بڑھے۔ نتیش کی حکومت میں امن و امان تو نسبتاً بہتر ہے مگر ایسا نہیں لگتا کہ نکسلی کمزور ہو پائے ہیں۔ میں ایک ایسے چکرویو میں گھر گیا ہوں کہ اُس سے نکلنے کا راستہ نہیں مل رہا ہے، خود سے تو کاشتکاری میرے بس کی بات نہیں، نقدی اور بٹائی پر دیا مگر اسامیوں کو بھی اندازہ ہوگیا ہے کہ فیضان میں وہ دَم خم نہیں کہ اپنی بات منوا سکیں، لہٰذا اُن کی بات بھی ماننی پڑتی ہے اور اُن کی بے ایمانی اور جھوٹ کو صاف صاف محسوس کرنے کے باوجود خاموش ہونا پڑتا ہے۔

میں ایک ہارا ہوا جواری ہوں، میرے سب مہرے پِٹ چکے ہیں، مگر مجھ میں یہ ہمت بھی نہیں ہے کہ بساط سمیٹ کر یا چھوڑ کر الگ ہٹ جاؤں، وقت مجھ سے ہارا ہوا کھیل لگاتار کھلوا رہا ہے، میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں ختم ہو چکی ہیں، میرا حوصلہ مر چکا، مجھے اب کوئی شوق نہیں ہے، میری سوچیں اب خیالات کی کوئی نئی جوت نہیں جگاتیں، ایسا لگتا ہے میں ہارا ہوا ایسا سپاہی ہوں جو اپنے ٹھکانے تک بھی نہیں پہنچ پا رہا ہے۔''

اس درمیان کئی بار فیضان کا لہجہ بھاری ہوا، آنکھیں بھر آئیں، غصّے اور مایوسی کے کئی رنگ آئے اور گئے۔ فیضان سب کچھ بہت صبر وسکون سے سنتا رہا۔ اُسے محسوس ہوا کہ آج اس کا برسوں کا چپ اور صبر کا بندھ ٹوٹا ہے۔

وہ آہستہ سے اُٹھا، اس کے بالکل پاس آکر بیٹھا، اس کا ہاتھ ہاتھوں میں لے لیا، فیضان اچانک بے قابو سا ہوگیا اور رونے لگا، اسمٰعیل نے اُسے چپ نہیں کرایا۔

دونوں ایک دوسرے کے قریب بیٹھے تھے، فیضان کا ہاتھ اسمٰعیل کے ہاتھوں میں تھا اور فیضان رو رہا تھا۔

فیضان بہت دیر تک روتا رہا اور اسمٰعیل بہت دیر تک چپ بیٹھا رہا۔

''جاؤ منھ دھو لو'' جب بہت دیر کے بعد فیضان پُرسکون ہوا تو اسمٰعیل نے کہا۔

فیضان چپ چاپ اُٹھا، واش بیسن میں جا کے منھ دھویا۔

''چلو، چائے پی کے آتے ہیں۔''

”تم کب آئے اور کیسے آئے؟“ چائے پی کر دونوں کمرے میں پہنچے تو اسمٰعیل نے پوچھا۔

”کل آیا، وہی بہن کی منسوب کے سلسلے میں، یہاں میرا ماموں زاد بھائی رہتا ہے اُسی نے خبر دی تھی۔“

”یہ کمرہ اُسی کا ہے؟“

”ہاں!“

”وہ کہاں گیا؟“

”وہ یہاں کسی کمپنی میں ملازم ہے۔ نو دس بجے نکلتا ہے تو شام ہی میں آتا ہے۔“

”منسوب کا کیا ہوا؟“

”آج شام میں جانا ہے، دیکھو کیا ہوتا ہے؟“

”سب ٹھیک ہو جائے گا، تم اپنے کو زیادہ ہلکان مت کرو، ایک اچھی، دھلی ہوئی، نکھری ہوئی، خوب صورت صبح کی آس کبھی نہیں چھوڑنی چاہیے۔“

اسمٰعیل نے محسوس کیا، فیضان کے چہرے کا تناؤ کچھ کم ہوا۔

”فارسی کا محاورہ ہے ’ہر کہ بر اولادِ آدم آید می گزرد۔‘ آدم کی اولاد پر جو آتا ہے گزر جاتا ہے۔“

فیضان کے چہرے پر کوئی ردِّ عمل نہیں آیا۔

تمہارے صرف والد کا انتقال ہوا ہے، لیکن تم نے کبھی میرے بارے میں نہیں سوچا؟ میں تو باپ، ماں، بہن، بیوی، بچے سب کھو چکا، میں کس کرب سے گزر رہا ہوں گا؟ تم کو اندازہ ہے؟ تم منگلو خاں اور کھیت ہڑپنے والے چچا کی وجہ سے تناؤ میں ہو لیکن میرا تو پورا گھر کارخانہ سب لُٹ گیا، ختم ہو گیا، تم اگلی پچھڑی ذات والوں کے رویّے سے پریشان ہو، میں نے تو بھیانک فرقہ وارانہ فساد جھیلا ہے، تم شکر ادا کرو کہ ابھی تک اپنے گھر میں ہو، تمہارے سامنے والے کو تو شہر نہیں پورا صوبہ چھوڑنا پڑا، تمہاری طرح میرے باپ کے سوتیلے بھائی بھی بہار میں موجود ہیں، میرے باپ دادا کا حصہ دبائے بیٹھے ہیں، تم کو نہیں لگتا میں جب اُن کھیتوں، کھلیانوں اور مکانوں کے بارے میں سوچتا ہوں گا، تو مجھ پر کیا گزرتی ہوگی اور یہ جو تم گاؤں کا بدلتا ہوا منظر نامہ دکھا رہے ہو، یہ تمہارا ذاتی مسئلہ نہیں ہے، مجھے یاد آتا ہے کسی مولانا صاحب نے بتایا تھا کہ قرآن شریف میں لکھا ہے کہ ”ہم دنوں کو اسی طرح لوگوں کے درمیان ادلتے بدلتے رہتے ہیں۔“ مذہبی لحاظ سے بھی

بدلاؤ کا یہ سلسلہ ایک فطری عمل ہے اس کے لیے تم اپنی جان کیوں جلا رہے ہو؟“

”مگر اثر تو مجھ پر بھی پڑ رہا ہے۔“ فیضان ہلکے سے بولا مگر اَب اُس کا انداز جھلّاہٹ بھرا نہیں تھا۔

”ہاں پڑوس میں آگ لگے تو دائیں بائیں اُس کی آنچ تو پہنچتی ہی ہے اور اُس کا تو دو ہی راستہ ہے، آگ بجھائی جائے، یا آگ کے رینج سے باہر آ جایا جائے۔“

”رینج سے باہر کیسے آیا جائے؟“

”اس پر بعد میں سوچیں گے، مجھے کچھ اور کہنے دو۔“

”کہیے پروفیسر صاحب، کہئے۔ میں سننے کے لیے تیار ہوں۔“ فیضان ہنستے ہوئے بولا۔

”شاباش! اب تم نے اچھا بچہ ہونے کا ثبوت دیا۔“ اسمٰعیل قہقہہ مار کر ہنسا۔

فضا خوش گوار ہو گئی تھی، اسمٰعیل نے محسوس کیا، اب کھل کر بات کی جا سکتی ہے۔

”دیکھو فیضان! جو سانس لے رہا ہے وہ سر اُٹھانا چاہتا ہے اور جو جتنا زیادہ روندا جاتا ہے وہ اتنا ہی زیادہ اکڑتا ہے۔ دُوب سامنے کی مثال ہے، آدمی جہاں ایک طرف جانور سے بدتر ہے وہیں دوسری طرف فرشتوں سے بہتر ہے، مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ، جو ڈوب گیا سو پار ہوا، جو بیٹھ رہا سو ڈوب گیا۔ اس پورے ہندوستان میں اور خصوصاً بہار میں نکسل جدوجہد کوئی بہت سادہ یا جدید جدوجہد نہیں ہے، تنظیم کی سطح پر یہ جدوجہد بائیں بازو کا رجحان رکھنے والوں نے شروع کی۔ کمیونسٹ پارٹی کا جھنڈا لے کر اور لال سلام کا نعرہ بلند کرتے ہوئے سارے مزدور کسان اُس کے ساتھ ہو لئے، وہ زمانہ یاد کرو جب بہار میں لفٹسٹوں کے ۴۵-۴۰ نمائندے اسمبلی میں پہنچتے تھے، اور وہ دن بھی یاد کرو جب جیوتی باسو کو وزارتِ عظمیٰ کی کرسی پر دیکھنے کو پورا ہندوستان منتظر تھا، خیر ہندوستان کی بات چھوڑو، بہار کی بات ہو رہی ہے۔ جس دَور کی بات ہو رہی ہے، اُس دور میں مزدور کسان ہی نہیں پسماندہ ذات کے زیادہ تر لوگ، دلت کو چھوڑ کر کہ وہ اُس وقت کانگریس کا مضبوط حصہ تھی، سب کے لیے کمیونسٹ پارٹی اُمید کا ایک ستارہ تھی، مگر ۱۹۷۴ء کے بعد سب سے پہلے کمیونسٹوں کا یادو کیڈر چھٹک کر سماجی انصاف کے نعرے پر لالو پرشاد یادو کے ساتھ ہو گیا۔ اس کے بعد بھی کمیونسٹ پارٹی کو ہوش نہیں آیا۔ اُن کی لیڈر شپ پسماندہ ذات کے اندر سے اُبھرنی چاہیے تھی، مگر پہیہ اُلٹا گھوم گیا، بھومیہاروں کے ہاتھ میں قیادت آ گئی۔ بعد میں یہ خراب دن بھی

دیکھنے کو ملا کہ مسلم اکثریت کے علاقے میں اُردو فارسی نام والے لوگ کھڑے کیے گئے۔ اندر اندر جس بے چینی نے جنم لیا، اُس کا اِن لوگوں کو اندازہ ہی نہیں ہو سکا۔ نکسل ازم کا عروج کمیونسٹوں کی بدعملی اور ذہنی افلاس کا نتیجہ ہے۔ دوسری طرف اعجاز علی اور علی انور وغیرہ نے انصاریوں کے علاوہ باقی پسماندہ مسلمانوں کو سماجی انصاف کی لہر کے ساتھ جوڑنے کی کوشش کی، اس کا فائدہ لالو، نتیش کو ملا یا نہیں، یہ گفتگو کا الگ موضوع ہے، مگر نکسلی جدوجہد کو بھی اس کا فائدہ بہرحال پہنچا۔ اب مسلم دیہاتوں میں بھی پارٹی کی میٹنگ ہونے سے کوئی روک نہیں سکتا۔ اس زمینی سچائی کو قبول تو کرنا ہی ہوگا۔''

''لو پانی پی لو۔'' اسمٰعیل ذرا سا رُکا تو فیضان نے جلدی سے پانی کا گلاس بڑھایا۔

اسمٰعیل نے مسکراتے ہوئے گلاس منھ سے لگا دیا۔

''اور کچھ باقی ہے؟'' اسمٰعیل پانی پی چکا تو فیضان نے پوچھا۔

''ہاں.... بہت کچھ...''

مگر اسمٰعیل نے محسوس کیا کہ فیضان ابھی ابھی تناؤ میں ہے۔

اُسے یہ بھی احساس ہوا کہ اب مزید اُس کو ذاتی مسائل پر کریدنا، یا اُسے مزید اُسی مسئلے پر بولتے رہنے دینا اُس کو اور زیادہ ذہنی تناؤ میں مبتلا کرنے جیسا عمل ہوگا۔

''اچھا! اِس پر ہم لوگ پھر باتیں کریں گے، چلو اسٹیشن کی طرف چلا جائے، روائل ہوٹل کی فیرنی اور کباب کھائے بہت دن ہو گئے ہیں۔'' اسمٰعیل گفتگو بیچ میں کاٹتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا۔

فیضان نے حیرت سے اُسے دیکھا... ''کیا ہوا اِس کو؟ اچانک بات بدل دی۔''

دونوں کربیگھیا کے اُس مکان سے نکلے، جہاں وہ ٹھہرے ہوئے تھے، دن ڈھلان کی طرف آ چکا تھا، ہوا میں ہلکی ہلکی خنکی تھی، موسم خوش گوار محسوس ہو رہا تھا، پاس کے کسی گھر سے ایک مشہور غزل کے اشعار ہوا کے دوش پر اُن دونوں تک بھی پہنچے... زندگی دھوپ تم گھنا سایہ... بلاوجہ اسمٰعیل کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

دونوں ساتھ ساتھ چل رہے تھے، اسمٰعیل نے قصداً پٹنہ یونیورسٹی کا ذکر چھیڑ دیا۔

نولیش کہاں ہے؟

رما کی کوئی خبر ہے؛؟

پتہ نہیں شری واستو جی ابھی ہیں یا ریٹائر کر گئے؟

سنا کہ اقبال ہوسٹل کے بغل میں ایک اور ہوسٹل بن گیا؟

حسن عسکری صاحب کے انتقال کی تم کو خبر ملی؟

دونوں کربیگھیا کی طرف والے پلیٹ فارم کی طرف آ چکے تھے۔

اسمٰعیل نے محسوس کیا کہ اب اس پلیٹ فارم پر بھی خوب چہل پہل رہنے لگی تھی ورنہ جب یہ دونوں پٹنہ میں رہتے تھے اور فیضان کے ایک رشتہ دار منور بھائی کی طرف آتا تو اس سمت کافی اُجاڑ پن محسوس ہوتا تھا۔ زیادہ تر لوگ صرف کربیگھیا سے مرکزی پٹنہ کی طرف جانے کے لیے ہی ریلوے کے اِس پُل کا استعمال کرتے تھے... پھر بعد میں جب گیا کی طرف جانے والی ٹرین اِس پل کے قریب ٹھہرنے لگی تو چہل پہل کچھ زیادہ بڑھ گئی۔

اب دونوں پلیٹ فارم کے اُس احاطے میں آ گئے تھے، جہاں سے سیڑھیوں پر چڑھ کر پُل پر پہنچا جاتا تھا۔

''اسمٰعیل رُکو۔'' فیضان نے رُکتے ہوئے اسمٰعیل کو آواز دی۔

''کیا بات ہے؟''

''ذرا جوتے پر پالش لگوا لوں۔''

''خیر تو؟''

''ارے یار، بہت دن ہو گئے۔ دیہات میں پالش والش کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔''

اسمٰعیل مسکرا کر رُک گیا، فیضان ایک موچی کے پاس کھڑا ہو گیا تھا۔ یہ پلیٹ فارم کے اندر کا احاطہ تھا... ویٹنگ روم!''

''آج لوگوں کی بھیڑ بہت زیادہ ہے؟'' اسمٰعیل خود کلامی کے انداز میں بولا، مگر موچی نے سن لیا۔

''آج مودی جی آئے ہیں، سب لوگ اُن کا بھاشن سننے جا رہے ہیں۔'' موچی نے پالش لگاتے لگاتے سر اُٹھا کر کہا۔

'مہاشے کافی گیانی ویکتی ہیں۔'' فیضان مسکرا کر بولا۔

موچی نے خوش ہو کر بتیسوں دانت باہر نکالے۔

یہ ہاڑ مانس کا پُتلا جو کوکھ کے اندھیرے میں نہیں سے ہاں بنتا ہے، اس کا سفر بے خبری سے شروع ہوتا ہے اور بے خبری پر ختم ہوتا ہے، لذت کا بے ارادہ عمل، حیض کا گندہ خون، سیپی کے منھ میں سیواتی کا ایک قطرہ، قطرے کو خود کیا خبر کہ وہ کیوں کر سیپی تک پہنچا... ساٹھ سیکنڈ، سانسوں کی ساٹھ آمد ورفت، تب ایک منٹ، ساٹھ منٹ کا ایک گھنٹہ، چوبیس گھنٹے کا ایک دن، تیس دنوں کا ایک مہینہ، رنوّے دنوں کا تین مہینہ، تین مہینوں تک وہ قطرہ ''نہیں'' کا استعارہ، سیپی کی اتھاہ اور اننت گہرائیوں اور اندھیریوں میں کسی اور کا منصوبہ، یا بے ارادہ، انجانے پن کی لامتناہی گونج کی دُھند میں بس ہونے کے ایک مدہم شائبے کی طرح، سیپی کے لیے اپنے اَن گنت اوّلین لمحوں میں کسی کنمناہٹ کا احساس کرانے سے انکاری۔

پھر ہولے ہولے کہیں کچھ ہونے کا گمان سا۔

ساری دِشاؤں پر ازل سے ابد تک، کچھ ہونے کا گمان... اور اِس سے آگے کچھ نہیں!

اِس سے آگے اگر کچھ ہے تو وہ عشق کا کرشمہ، جس کا آخری مرحلہ ہے: چوں پردہ برافُتد نہ تو تو مانی و نہ من! اس کے آگے سالک مقامِ تحیر پر حیرت کا شکار ہو کر ایک ''لمبی چپ'' کا استعارہ بن جاتا ہے۔

اسمٰعیل اور فیضان رسول کاہے کا استعارہ تھے؟

ایک سننے کا مشتاق اور دوسرا سنانے کا شائق!

مگر شاید سناؤنی آ گئی تھی۔

یا شاید سنامی آ گئی تھی۔

اسمٰعیل اور فیضان کے علاوہ، وہاں اُن کے پاس کوئی تیسرا نہ تھا، ورنہ شاید گمان آخری چارہ کار بنتا کہ جب زندگی ہارتی ہے، جب زمین میں رینگتا چیونٹا گمان کرتا ہے کہ کوئی بھاری چیز، پتھر یا پیر اُس پر آن پڑا ہے تو اُسے محسوس کی گئی مٹھاس، مادہ کا لمس، انسان یا کسی جاندار کو ڈنک مارنے کی لذت، اور اُس کے ساتھ کسی گھر کے طول وعرض میں امن اور شانتی کے ساتھ ''دوسراتھ'' کرنے والی چیونٹیاں اور پتنگے اور چھپکلیاں، اور وہ چوہے اور چھچھوندر جو دبے پاؤں آتے اور اپنا رزق ڈھونڈتے ڈھونڈتے ''حالِ دل'' بھی بیان کر جاتے... سب بری طرح یاد آتے ہیں، اور یقین سے گمان میں بدلتے جاتے ہیں۔

زمین اپنے سینے پر ہفت افلاک کی بلائیں، برق و رعد کے بے پناہ ڈراؤنے پن کے ساتھ گمان کرتی ہے، گمان کرتی ہے کہ یہ دُکھ بسر جائے گا۔ مگر جب سے دنیا خلق ہوئی، زمین کا گمان، گمان ہی رہا، شاید اوٹا کوٹھا، باغ بغیچہ، اُپجاؤ مٹی، زرخیز کوکھ، بہار رُت، انگ انگ میں سرمستی پیدا کرتی بارش کی بوچھار کے لیے سخت گرمی، پت جھڑ، زمین کا دراڑوں بھرا پھٹا پھٹا سینہ، گرتی عمارتیں اور بے یارو مددگار دُکھ سہتے، اور مرتے بچے ضروری ہیں۔ کھاد کے بغیر کوئی کھیتی نہیں لہلہاتی... آنے والے کل کے لیے زمین سارا دُکھ برداشت کرتی ہے، مگر کبھی کسی نے دھرتی یا آدمی یا فاختہ یا بلبل سے نہیں پوچھا:

جو دُکھ تو سہتی ہے، جو گولی تجھے چھیدتی ہے اُس میں تیری رضا کتنی شامل رہتی ہے؟

اسمٰعیل اور فیضان پر آئی ہونی یا اَنہونی یا گمانی میں اُن کی کوئی ہوں، ہاں شامل تھی؟

مانو سنامی جیسا درد اور اندھیروں کا چنگھاڑیں مارتا طوفان جیسا بھیانک پن دَر آیا تھا... یہ سنامی اسمٰعیل اور فیضان کے لیے درد اور حیرت کا کوئی ایک طوفان لے کر نہیں آئی تھی.. برفیلا طوفان جس میں برف کے گولے تابڑ توڑ پتھراؤ کرتے ہیں، اندر سے باہر تک آسمان سے زمین تک کفن رنگ منظر نامے پر حاوی سوچ کے ہر موڑ پر برف باری کے اختتام پر طاری انجماد جیسا کچھ... یا پھر مرتے ہوئے آدمی کے دماغ کے بالکل آخری لمحوں میں ...زندگی کے بالکل آخری پَل میں کسی بھولی بسری آواز کو سننے یا چہرے کو دیکھنے کی آخری خواہش، یا کسی صحرا میں گرم جھکڑوں والا بھیانک طوفان، یا دل دہلا دینے والی بھیانک گڑگڑاہٹ کے ساتھ سر پر گرتا آسمان....''

''کیا ہے؟ یہ سب کیوں ہے؟''

اسمٰعیل اور فیضان اگر اپنے آپ میں ہوتے تو اتنا ضرور سوچتے۔

مگر اسمٰعیل اور فیضان اپنے آپ سے پرے تھے!

ہر لمحہ تعاقب میں ہے
اِک لمحہ بے خبری کے
جس لمحہ بے خواباں کے
گھنگھور گھنے کہرے میں
سب دید سمٹ جاتی ہے

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاتا ہے
ہر خواب دھرا رہ جاتا ہے
ہر یاد خبر بن جاتی ہے
وہ لمحہ بے خبری
ہر ٹھاٹھ پہ چھا جاتا ہے
ہر خواب چرا جاتا ہے
ہر بات اُلٹ کر جاتا ہے
ہر یاد پہ تن جاتا ہے
تن تن تنا نا نا... یا ہو
تن تن تنا نا نا... یا ہو

کوچ نگاڑہ باجت ہے

اسمٰعیل اور فیضان کو کچھ سوچنے کا موقع بھی نہیں ملا... بم کا ایک زوردار دھماکہ... اسٹیشن پر افراتفری مچ گئی۔ لوگ اِدھر اُدھر بے تحاشہ بھاگ رہے تھے۔ ویٹنگ ہال میں دھواں سا پھیل گیا تھا... کچھ نظر نہیں آرہا تھا... دھوئیں کی کثرت اور حجم سے ویٹنگ ہال میں موجود لوگوں کا سانس لینا دشوار، بھگدڑ سی مچ گئی... لوگوں کی پلیٹ فارم سے کسی بھی طرح نکلنے کی کوشش اور ہسٹیریا کے انداز میں حلق سے نکلنے والی خرخراہٹ کے بیچ دم توڑتے ہوئے اسمٰعیل اور فیضان کی چھٹپٹاہٹ کون دیکھتا؟

یہ وہ زمانہ تھا، جب ملک بھر میں اچھے دنوں کی آس کا بہت چرچا تھا۔
بے خبری سے شروع ہونے والا سفر دوبارہ بے خبری تک پہنچ گیا۔

❖

زندگی انجمن آرا و نگہبانِ خود است!
زندگی والوں کے درمیان اس انجمن آرائی اور نگہبانی میں مکر کا کوئی دخل نہیں ہوتا، ہر جاندار کا دفاعی نظام خود کار ہوتا ہے اور بے اختیارانہ!

اس سے پہلے کہ ڈھیلا یا کوئی کنکر یا کوئی ہاتھ آنکھ تک پہنچے، پلک جھپک جاتی ہے۔
بہت سے جانور زلزلے اور طوفان یا سیلاب کی آہٹ بہت پہلے سے محسوس کر لیتے ہیں اور چوکنا ہو جاتے ہیں۔
مچھر غذا حاصل کرنے کے لیے جسم پر بیٹھتا ہے اور اتنا چوکنا رہتا ہے کہ انسانی ہاتھ اُس تک پہنچے، اس سے پہلے وہ اُڑ کر بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ مگر اسی مچھر کو اگر موقع دے دیا جائے اور خود اپنے جسم کو ذرا ساکت کر لیا جائے تو نظر آئے گا کہ ابتدا میں وہ کسی ایک جگہ بیٹھتا ہے تو وہیں ٹِک نہیں جاتا، وہ ایک جگہ بیٹھتا ہے پھر اُڑ جاتا ہے، پھر دوسری جگہ بیٹھتا ہے اور چند ثانیہ بعد وہاں سے بھی اُڑ جاتا ہے دراصل وہ جسم کا ایسا حصہ تلاش کرتا ہے، جہاں اُسے زیادہ محنت نہ کرنی پڑے اور خون آسانی سے مل جائے... سافٹ ٹارگیٹ کی تلاش!
پھر جہاں اُسے جسم کا سافٹ، نرم حصہ میسر آجاتا ہے وہاں وہ بیٹھتا ہے مگر اس کے باوجود جسم کی ذرا سی بھی حرکت اُسے چوکنّا کر دیتی ہے اور وہ اُڑ جاتا ہے۔ البتہ جسم اگر بالکل ساکت ہے اور جسم نے یہ احساس دلا دیا کہ وہ ایک بے حس و حرکت جسم ہے تب وہ اُس جسم کے اپنے پسندیدہ حصے پر بیٹھتا بھی ہے اور بیٹھ کر کچھ دیر بعد اپنے جسم میں چھپا ارّہ نکالتا ہے، اُس آری سے وہ جسم کے اُس مخصوص حصّے کو کاٹتا ہے، کبھی آری کے بجائے ایک لمبی سی سوئی نکالتا ہے اور اُس مخصوص حصے میں وہ سوئی یا نوکیلی سونڈ گڑا دیتا ہے اور جب وہ خون پینے کے مراحل میں ہوتا ہے تو گویا وہ اپنے وجود میں شراب کشید کر رہا ہوتا ہے، پینے والا پینے کے لمحے میں جس سرور سے گزر رہا ہوتا ہے وہ سرور اُسے دنیا و ماورا سے بے خبر اور بے نیاز کر دیتا ہے، ایک مستی و سرمستی کا عالم جس میں وجود موجود ہو کر بھی ناموجود کا استعارہ بن جاتا ہے، وصل کی کئی صورتیں ہیں، ایک تو جسم کا اِتصال دوسرا خیال کا اِتصال اور تیسرا جسم سے کشید کئے ہوئے خون سے اتصال، یہ وصل کی عجیب و غریب قسم کی کیفیت ہے، جس میں ایک جسم دوسرے جسم سے تو من شدی من تو شدم کی منزل پر وصل آشنا ہوتا ہے مگر اس میں دلچسپ بات یہ ہے کہ مفعول صعوبت سے گزرتا ہے اور فاعل کیف سے، شاید وصل کے ہر لمحے میں واصل کیف سے گزرتا ہے اور موصول کو صعوبت برداشت کرنی پڑتی ہے۔ ڈاک سے ایک ادنیٰ سا لفافہ کسی کو موصول ہوتا ہے تو اُس موصول لفافے کو بھی چیر پھاڑ کی صعوبت برداشت کرنی پڑتی ہے اور لفافے سے واصل ہونے والا اُس چیر پھاڑ کے نتیجے میں مسرت، حزن یا

بے دلی کسی نہ کسی مرحلے کے کسی نہ کسی درجے سے ضرور گزرتا ہے اور ہر حال میں واصل اُس لمحہ وصل میں کسی نہ کسی درجے کی بے خبری کا شکار ضرور ہوتا ہے۔

مچھر بھی خوں کشیدنی کے اُس کیف کے سبب جب نشہ وصل کی بے خبری سے دوچار ہوتا ہے تو اَب اُس کو جس طرح جیسے اور جب چاہو مار ڈالو، وہ اُف نہ کرے گا، بس شرط یہ ہے کہ تمہیں اُس نشہ وصل کے ٹھہراؤ یا تسلسل کے جگر مگر تازہ کٹے گوشت کے لوتھڑے کے دھک دھک کرتے حیاتی پل کا پتہ ہو—

مگر ہر دفاعی نظام پہ کوئی جارحانہ نظام غالب آ جاتا ہے۔

شاید

ہم کس حصار میں ہیں؟

پتہ نہیں؟

مگر آدمی کے ہیولے میں سانسیں لیتا ہاڑ مانس کا پُتلا شاید کچھ اور بھی اپنے اندر پوستا پالتا ہے۔

پتہ نہیں؟

یہ جو کچھ ہوا یہ کیا ہے؟

میں سمجھا نہیں۔

''ہم کیوں مارے گئے؟ ہمارا قصور کیا ہے؟ آدمی بلا وجہ کیوں مر جاتا ہے۔''

وہ اپنے آپے سراپے میں ہوتے تو شاید اتنا ضرور سوچتے ...مگر اسمٰعیل اور فیضانِ رسول منھ پھاڑے، بے جان پڑے تھے۔

بس آنکھیں کھلی تھیں ... پتہ نہیں بے جان تھیں یا اُن میں کوئی جوت جلتی تھی!

● ● ●

15

قیدار محمد ولد محمد اسمٰعیل انڈیا گیٹ سے لال قلعہ جانا چاہتا تھا۔

قیدار ایک بھری دوپہر کے مقابل تھا، اُسے لگا اُس کے اندر بھی دور دور تک ایک چلچلاتی دھوپ چاروں اور تانڈو ناچتی تھی۔

آنکھوں کے آگے کچھ سائے سے لہرائے۔

اس کا باپ اسمٰعیل، جس نے اپنے باپ کی قربانی دی اور جس کی قربانی کسی کام نہ آئی۔

اسمٰعیل کیوں مارا گیا؟ اس کا جواب قیدار کو کبھی نہ مل سکا... بم کہاں سے پھینکا گیا؟ یہی دونوں بم کا شکار کیوں ہوئے؟ کیا یہ حملہ منصوبہ بند تھا؟ کیا یہ یہ دونوں دہشت گرد تھے؟ دہشت گرد نہیں تھے تو یہ کیوں مارے گئے؟ اور وہ کون تھا جس نے وہاں بم رکھا؟ اگر وہی اِن دونوں کا قاتل تھا تو اِن دونوں سے اُس کی دشمنی کیا تھی؟

سائے بھی لہراتے تھے اور سوال کا سانپ بھی سرسراتا تھا اور قیدار محمد انڈیا گیٹ سے لال قلعے کی طرف بڑھتا جاتا تھا۔

سارے میں ایک گھمسان کا رَن پڑا ہوا تھا۔

اِندر پرست میں وہ ہاہا کار مچی کہ بھیشم پتامہ بھی تراہ تراہ کرنے لگے، قیدار محمد کو مدّتوں اس سوال کا سامنا کرنا پڑا کہ وہ اگر اسمٰعیل محمد کا بیٹا ہے تو دہشت گرد کیوں نہیں ہے؟

''آپ پہلے یہ طے کر لیجئے کہ میرا باپ دہشت گرد تھا اُس کے بعد مجھ سے سوال کیجئے۔''

''بیٹا، پولیس والوں کو اتنا تیکھا جواب نہیں دینا چاہیے۔'' پولیس والوں کے جانے کے بعد بنسی دھرنے اُسے سمجھانے کی کوشش کی تو وہ اور بپھر گیا۔

''چاچا! ہم جہاں پر کھڑے ہیں، اور جس واتاورن (صورتِ حال) کو جھیل رہے ہیں، اس میں مقابلے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہے۔''

''ہاں بیٹا! مقابلہ کرو مگر ذرا سوجھ بوجھ سے۔'' بنسی دھر نے اُسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

قیدار بھی محسوس کر رہا تھا کہ جذباتیت سے کام نہیں چلے گا، بنسی دھر کی باتیں اُسے صحیح لگیں، ویسے بھی بنسی دھر، بھاٹیہ، کرپاشنکر نے اسمٰعیل کی موت کے بعد قیدار کا بہت ساتھ دیا، ورنہ اسمٰعیل کی موت کے بعد تو وہ بالکل تنہا تھا، ماں تو باپ کے بعد ایسا ٹوٹی کہ جب تک زندہ رہی، نہ رہنے کی مثال ہی نظر آئی۔ بہن رمیش ارورا کے ساتھ ممبئی جا چکی تھی اور قیدار اس کے حال سے بے خبر تھا۔ رمیش کی بہن ارچنا اپنے شوہر محمد حسّان کے ساتھ دوبئی میں رہتی تھی، حسان کو سعودی عرب میں زیادہ تنخواہ پر ایک نوکری ملی مگر ارچنا سعودی جانے کے لیے کسی طور پر تیار نہیں ہوئی، کہنے لگی، ''بس دُبئی تک قبول ہے۔''

پولیس والوں نے اندر اندر بہت کھوج خبر لی، مگر کہیں کچھ ہاتھ نہیں لگا، دوسری طرف بھاٹیہ اور بنسی دھر کی وجہ سے تھانے کو بھی نرم ہونا پڑا، اور ویسے بھی صورتِ حال بدل چکی تھی، تنیش بی۔جے۔پی۔ کو ایک زور کا جھٹکا دے چکے تھے۔

مگر پورا ملک ایک بوائلنگ فرنیس کے اوپر کھڑا ہوا تھا۔

قیدار کی نظروں کے آگے مناظر فلیش بیک میں جھماکے کر رہے تھے۔

❖

دلّی کی جنگ اب مجاہدین اور انگریزوں کی جنگ نہ رہ کر عوامی سطح پر پہنچ چکی تھی، دیہات دیہات سے لوگ ہتھیار بند چلے آ رہے تھے، اُس وقت دلّی میں قریب قریب چالیس ہزار کا لشکر برسرِ پیکار تھا، اور اتنے بڑے لشکر سے مقابلہ کرنا انگریزوں کے لیے ناممکنات میں سے تھا لیکن اُن کی خوش قسمتی اور مجاہدین کی بدقسمتی یہ تھی کہ غدار چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی ہر خبر انگریزوں تک پہنچا رہے تھے۔ ان غداروں میں مرزا الٰہی بخش، گوری شنکر، رجب علی، تراب علی، جیون لال وغیرہ کی ایک بڑی فہرست تھی جو اپنی جان پر کھیل کر انگریزوں کے انعام کی لالچ میں اُن کی مدد کر رہے تھے۔

دوسری طرف نانگلی کے عوام نہ صرف مجاہدین کی ہر طرح سے مدد کر رہے تھے بلکہ اُن کے شانہ بشانہ جنگ بھی لڑ رہے تھے۔ مغل شہزادوں کے علاوہ امراء، جن میں بطورِ خاص امین الدین

خاں اور تاج الدین خاں اپنے لشکروں کے ساتھ شریکِ جنگ تھے، ہر روز ایک دوسرے پر حملے ہوتے، دونوں طرف کے فوجی مارے جاتے، زخمی ہوتے لیکن ان کے ساتھیوں کے حوصلے اُسی طرح برقرار رہتے، دو بدو کی جنگ میں شہزادہ غلام مصطفٰی بھی زخمی ہو گیا تھا۔ شہزادہ عظیم بیگ جو ہانسی میں تھا، وہ بھی اپنے لشکر کے ساتھ دلّی آ گیا تھا اور بادشاہ سلامت کے لشکر میں ضم ہو گیا تھا، نجف گڑھ کے زمینداروں نے بخت خاں کی حمایت کا صرف اعلان ہی نہیں کیا تھا بلکہ وہ اُن کے ساتھ شامل بھی تھے۔ اسی طرح پانی پت اور سونی پت کے زمیندار بھی مجاہدین کے حامی بن گئے تھے۔ بہادر گڑھ کے بہادر علی خاں بھی ہر طرح سے بخت خاں کے حامی و ناصر تھے۔

عوام پورے جوش و خروش کے ساتھ انگریزوں پر حملے کرتے اور اُنہیں پسپا ہوتے ہوئے دیکھ کر خوشی سے پھولے نہ سماتے، سب کو کامل یقین تھا کہ انگریز دلّی میں داخل نہ ہو سکیں گے، قلعہ معلّٰی کے آسمان پر چیلیں منڈلا رہی تھیں۔ (ایوانوں کے خوابیدہ چراغ، صفحہ 337)

❖

اعظم گڑھ سے کچھ دور (بلیا کے قریب) کنور سنگھ اور کرنل ڈیگلس میں جنگ ہوئی...اعظم گڑھ کو فتح کر کے اپنی فوج کے ایک دستہ کو اعظم گڑھ کے قلعہ کو محاصرہ کے لیے چھوڑ کر کنور سنگھ اب (بلیا کی جانب سے) بنارس کا طرف بڑھا...اپنی باقی فوج لے کر کنور سنگھ غازی پور کی طرف بڑھا ...مورخ مالے سن نے کنور سنگھ کی اس چال اور (بلیا ضلع میں واقع) تونس ندی کے اوپر لڑنے والے، کنور سنگھ کے سپاہیوں کی بہادری کی خوب تعریف کی ہے...(بلیا ضلع کے) نگھئی نام کے گاؤں کے پاس ڈگلس اور کنور سنگھ کی فوجوں میں جنگ ہوئی...کنور سنگھ اپنی فوج سمیت حیرت انگیز تیزی کے ساتھ چل کر سکندر پور (ضلع بلیا) پہنچا...گھاگھرا ندی پار کی اور (بلیا ضلع کے) منوہر گاؤں میں کچھ دیر آرام کیا...کنور سنگھ وہاں سے سات میل نیچے شیوپور گھاٹ (بلیا تحصیل) سے رات کے وقت گنگا پار کر گیا۔ (سن ستاون، پنڈت سندر لال، انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ، صفحہ 200-195)

گھٹتے چاند کی راتوں میں سے ایک رات خبر ملی کہ کنور سنگھ بانس ڈیہہ کی طرف لوٹ رہے ہیں، علی کی زندگی کی یہ سب سے اہم رات تھی، اُس رات علی حق ساری رات جاگتے رہے۔ ان کے آدمی گھٹا ٹوپ اندھیرے میں گاؤں گاؤں پہنچتے رہے، اور تین بجتے بجتے چاروں طرف سے

قاضی علی حق کے آدمیوں نے بانس ڈیہہ کی طرف بڑھنا شروع کیا، پھر چھا (صبحِ کاذب) ہوتے ہوتے لگ بھگ ڈیڑھ دوسو جاں نثار، علی کی ایک پکار پر بانس ڈیہہ کے نکاسی کے راستے پر، طے کئے ہوئے کسی مقام پر جمع ہو گئے۔

چاروں طرف طوفان سے پہلے کا سنّاٹا تھا، دور دور تک پھیلے درختوں کا سلسلہ اور آم کے باغات اور ٹنڈ منڈ کھیت اور دیہاتوں کے اِردگرد جیسے جنگل ہوا کرتے ہیں، اُن سب کے سائے میں آدھے چھپے آدھے کھلے سیکڑوں افراد...

کنور جب اعظم گڑھ کی طرف بڑھ رہے تھے تو اُن کے پاس پچیس تیس ہزار کی تازہ دم فوج تھی، لیکن یہ جس وقت کی بات ہے اُس وقت کنور پیچھے ہٹ رہے تھے۔ اب ان کے پاس بہت تھوڑی فوج بچی تھی... نگھئی میں جو صورتِ حال سامنے آئی اُس کے بعد کنور نے واپسی کا ارادہ کر لیا... واپسی کی اِسی اسٹریٹجی کے مطابق کنور سنگھ بانس ڈیہہ کی طرف بڑھ رہے تھے مگر کرنل ڈگلس نے ایک مرتبہ پھر بانس ڈیہہ میں اُن کی راہ کاٹی اور وہاں بھی گھمسان کا رَن پڑا۔

علی بے زین کے گھوڑے پر سوار تھے اور اُن کے میمنہ اور میسرہ پر اُن کے آدمی تھے، یوں تو ساری فوج کنور سنگھ کی قیادت میں کرنل ڈگلس کا مقابلہ کر رہی تھی، مگر علی کے ڈیڑھ دوسو افراد علی کے اشارے پر جنگ میں اپنے جوہر دکھا رہے تھے اور خود علی کے جوش کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنے معاون میمنہ اور میسرہ کے قلب سے جوش میں باہر نکل کر حملے کر رہے تھے۔ کرنل ڈگلس نے علی کو تاک لیا اور اُس کے اشارے پر انگریز فوج کا ایک دستہ آہستہ آہستہ علی اور اُن کے آدمیوں کے گرد اپنا گھیرا تنگ کرنے لگا۔ (آثارِ بغاوت، صفحہ 107-109)

❖

اوراق ہوا میں پھڑ پھڑا رہے تھے۔ خطوطِ غالب... اسبابِ بغاوتِ ہند... جامع مسجد کی سیڑھیوں پر مولانا آزاد کی فریاد... آگ کا دریا... Freedom ....A train to Pakistan ...Last Moghal....at mid night آنگن۔

یہ سب کچھ قیدار نے پڑھا نہیں تھا، مگر اوراق کو پھڑ پھڑانے سے کون روک سکتا ہے۔

درد جو سینے پر اور جان پر جھیلا گیا... خواب جو دیکھا گیا، اُس کی تعبیر بھاگل پور، مالیگاؤں،

بھیونڈی، گجرات... یہی ہے وہ حاصل جو ہم چاہتے تھے، قلعہ معلّٰی کے آسمان پر چیلیں منڈلا رہی تھیں۔

قیدار تو اِس بات پر راضی ہو گیا تھا کہ سب دوست لال قلعہ میں جمع ہوں اور وہیں بیٹھ کر آگے کی رَن نیتی طے کی جائے۔

اسمٰعیل... قیدار... علی... یہ کیا چاہتے ہیں؟

دھوکا ہو گیا۔

ایک بھری دوپہر مقابل تھی۔ لگا اندر اندر دور دور تک ایک چلچلاتی دوپہر تانڈو ناچتی تھی اور آوازوں کا ایک بھیانک، زہریلا اور گردن تک غلاظت میں لت پت سیاہ شور تھا، گھر واپسی... لوجہاد، دیش دروہی... فخر سے کہو ہم... غیر مسلم جہنمی... ہم طے کریں گے کافر کون ہے... قبر پوجا... بدعتی... کافر... مشرک...

شور یہیں پر تھم جائے، ایسا نہیں تھا۔

گئو رکھچھا... وَندے ماترم... رام مندر... انہی آوازوں میں کچھ اور آوازیں گڈمڈ ہو رہی تھیں ...اسلام واحد راہِ نجات... کافروں سے قتال کارِثواب...

پھر فضاؤں میں جھنڈے لہراتے ہیں۔

ہندوواہنی... بجرنگ دل... گئو رکھچھا سمیتی... شیوسینا... آر ایس ایس... جھنڈوں کے چیختے چلاتے رنگوں میں... بیچ بیچ سے کچھ مدھم ہم رنگ سر اُٹھاتے... مجلسِ اتحاد المسلمین... سیمی... انڈین مجاہدین...

قیدار ایک طرف سے نظر چراتا تو دوسری سمت کچھ ایسا تھا جو راستہ روک کے کھڑا ہو جاتا... ہر طرف اونچی اونچی دیواریں... ہر دیوار پر جھنڈے... ہر دیوار کی ہر اینٹ سے گندا خون اُچھلتا کودتا باہر آتا...

اُس کا جی چاہا وہ سرحدیں پھلانگ جائے۔

مگر وہ کہاں جاسکتا ہے؟

اس بے آب و گیاہ وادی کے باہر بھی کون سا چین ہے؟

اگر چین ہوتا، تو اُس کے باپ کا باپ ابراہیم کیوں آگ میں جھلستا؟

اُس کا باپ اسمٰعیل ایسے جاندار کی مثال کیوں بنتا جس کا بدل پسند کیا جاتا ہے۔

کہیں بہت دور سے ... ہزار ہا ہزار کوس کی دوریاں طے کرتے ... بے زین کے گھوڑوں، اونٹوں، جادوئی خول میں گھری مشینوں کی پشت پر، فاصلے پر فاصلہ طے کرتے، گھنٹوں کو منٹوں میں اور منٹوں کو سیکنڈوں میں بدلتے اُس تک پہنچتے، اندیشے، شبیہیں، جھنڈے اور آوازیں...القاعدہ، طالبان، داعش، جیش محمد، لشکر طیبہ، حزب المجاہدین، لشکر صحابہ، سپاہِ جھنگوی، حزب اللہ...اور جانے کیا کچھ...''

قیدار ایک عام آدمی، نہ پیغمبر، نہ ولی، نہ رِشی مُنی، نہ انقلابی اور نہ ہی کارپوریٹ گھرانے کا کوئی ادنیٰ سا ریزہ۔

صرف ایک عام آدمی!

جس کے سامنے رہتا ہے اُس کا گھر، اُس کے بچے، خاندان، محلّہ، زیادہ سے زیادہ اُس کے اِردگرد کا اُس کا اپنا سماج...

اُسے موت سے ڈر نہیں لگتا تھا مگر موت سے یاری کا کوئی شوق بھی نہیں تھا، موت کب کسی کے بلاوے پر آئی ہے اور کب کسی کے روکے رُکی ہے، اُس کے باپ نے کیا موت کو بلاوا دیا تھا؟ اور اُس کی ماں جب باپ کی موت کے بعد ڈپریشن کا شکار ہوئی اور پھر فالج کو ڈیڑھ دو برس جھیلتے ہوئے دن رات موت کی تمنا کیا کرتی تھی تو موت نے کب اُس کی سنی؟

وقت ایک بے حس عنصر، جسے خود اپنی کارکردگی کا شاید علم نہیں کہ وہ آگے کیا کرے گا، گزران کا استعارہ، مٹھی میں ریت، اور یہ وقت جس خلا میں گزران کرتا چلا جاتا ہے، یہ خلا؟ کیا یہ وجود ہے یا عدم؟

قیدار کے ماں باپ عدم کے خلا سے وجود کے سانچے میں فرض کئے گئے اور صرف اسم کے سبب پہچانے گئے، مگر ہر اسم اپنی اصل، عدم کی طرف لوٹنے کے لیے بے تاب و بے قرار...عدم کی اندھیری وادیوں میں قطرہ قطرہ گرتا ہوا۔

قیدار عدم سے، موت سے کیوں یاری کرتا؟

پس وہ زندہ رہنا چاہتا تھا۔

وہ کچھ دن تو باپ کے پسند کئے ہوئے اُس چھوٹے سے شہر میں رہا، رہنا ضروری بھی تھا، باپ کی موت کے سال بھر بعد عدالت کا فیصلہ آیا، دوسرے اساتذہ کی طرح اُس کے باپ کی تقرری کو

بھی عدالت نے صحیح مان لیا تھا، جب عدالت کا فیصلہ آیا تو باپ مر چکا تھا، مگر اس کے زیادہ تر ہم پیشہ زندہ تھے، اُن میں بہتیرے سبک دوش ہو چکے تھے اور چند ایک سال چھ ماہ میں سبک دوش ہونے والے تھے۔ سب نے اپنی خاطر دوڑ دھوپ کر کے حکومت اور یونیورسٹی سے بقایہ رقم وصولی، اسمٰعیل کے باپ کے کھاتے میں بھی تقریباً پچیس تیس لاکھ روپے آئے۔

ایک مرتبہ پھر بنسی دھر اور بھاٹیہ وغیرہ نے اُس کو سنبھالا دیا، طرح طرح سے سمجھایا: ''پیسے کی اہمیت سمجھو، سوچ سمجھ کر خرچ کرو، اِن پیسوں کے لیے تمہارا باپ زندگی بھر ترسا، تمہاری ماں کو پیسوں کی کمی کی وجہ سے گھٹ گھٹ کر جینا پڑا، پیسوں کو تو پیر ہوتا ہے، تم اُنہیں کھلا چھوڑو گے تو وہ یوں تمہارے پاس سے بھاگ کھڑے ہوں گے کہ چھ ماہ کے اندر کوسوں کوس دور تمہیں ان کا پتہ نشان نہیں ملے گا۔''

''میرا آپ لوگوں کے علاوہ کون ہے؟ اب تو ماموں لوگ بھی پلٹ کر نہیں پوچھتے۔''

''بیٹا! دنیا ایسے ہی چلتی ہے۔ اِس کے لیے زیادہ اموشنل ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔''

بنسی دھر کی بات اُس کی سمجھ میں بھی آ گئی۔

کچھ پیسہ زمین کی خریداری میں خرچ ہوا اور باقی کو فکسڈ ڈپازٹ میں جمع کر دیا گیا۔

اندازہ ہوا کہ اس فکسڈ ڈپازٹ سے سات آٹھ ہزار روپیہ مہینہ مل جایا کرے گا۔

جب اسمٰعیل مارا گیا اُس وقت قیدار انجینئرنگ کے لیے دہلی میں کوچنگ کر رہا تھا اور باپ کے کالج میں گریجویشن کے لیے داخلہ بھی لے رکھا تھا، پروفیسر کا بیٹا ہونے کا اتنا فائدہ تو حاصل ہو ہی جاتا تھا کہ کالج آئے بغیر بھی حاضری بن جاتی تھی، چھوٹے شہروں میں ویسے بھی جتنی بڑی تعداد میں داخلے ہوتے تھے، اُس تناسب سے طلبا، کالجوں میں حاضر نہیں دکھائی دیتے تھے۔

تو یوں ہوا کہ لڑکے بغیر کلاس کئے امتحان میں بیٹھتے رہے اور پیروی خوشامد کے بَل پر بی.اے. اور ایم.اے. کرتے رہے۔

اُس زمانے میں ایم.اے. کی بنیاد پر لکچرشپ مل جایا کرتی تھی۔

کالج میں ایسے لکچر صاحبان داخل ہوئے جنھوں نے کالج میں پڑھا ہی نہیں تھا۔

اُن کا بھلا اِسی میں تھا کہ آگے بھی لڑکے داخلہ لیں مگر کلاس نہ کریں۔

گویا بے پڑھی لکھی مگر سندوالی کھیپ کی کھیپ لکچرر بننے کو تیار ہوگئی، اور لکچرر ہوتی گئی۔ ایسا معاملہ صرف کالج میں نہیں تھا، اسکولوں میں بھی ایسے ہی جاہل اساتذہ ''مسندِ درس'' پر جلوہ گر ہوگئے۔

اکبرالہ آبادی کی نگاہ کسی اور وجہ سے پردہ اُٹھنے کی منتظر تھی، مگر ۸۰-۱۹۷۵ء کے بعد پردہ اُٹھا تو نگاہوں نے صرف وہی منظر نہیں ہر منظر دیکھ لیا۔

قصہ مختصر یہ کہ قیدار دہلی میں کوچنگ کر رہا تھا اور کالج کا طالب علم تھا۔

مگر جب باپ ماں دونوں مر گئے اور بہن رمیش کے ساتھ ممبئی چلی گئی تو اورنگ آباد میں رہنے کا اُسے کوئی جواز نظر نہیں آیا۔

بلکہ اُسے زیادہ بھلا معلوم ہوا کہ وہ اورنگ آباد سے دور ہو جائے۔

باپ کی موت نے اُسے مسلسل ذہنی جھٹکے دیے۔ اپنی قانونی پوزیشن صحیح ثابت کرنا ناکوں چنے چبانے کے برابر تھا، اگر بنسی دھر اور بھاٹیہ اُس کی پیٹھ پر نہ کھڑے ہوتے تو وہ کہاں رہتا، گھر میں یا جیل میں یہ کہنا مشکل تھا۔

مگر اس چکر میں برس چھ مہینے تو ایسے ضرور گزرے جب وہ صبح میں گھر سے نکلتا تو سورج ڈوبنے کے بعد اس گھر میں داخل ہوتا، اور اِدھر گھر میں ڈپریشن کی شکار ماں، وہ تو بہن تھی جو ماں کو سنبھالے رہتی تھی اور قیدار کو باہر کے معاملات سنبھالنے کا موقع مل جا رہا تھا۔

بہن بھی باپ کے کالج کی ہی طالبہ تھی، اسمٰعیل حجاب کا قائل تھا، مگر برقعے کا قائل نہیں تھا، اس لیے بیٹی کالج جاتی تو چہرہ کھلا ہی رہتا۔ کالج میں لڑکی لڑکے دونوں پڑھتے تھے، بنسی دھر بھاٹیہ، کرپاشنکر کے علاوہ بھی زیادہ تعداد تو غیر مسلموں ہی کی تھی، جن سے اسمٰعیل کا صبح و شام کا تعلق تھا اور اس لیے قیدار کے یا بہن کے بھی اگر غیر مسلم دوست کبھی کسی ضرورت سے گھر آتے تو اسمٰعیل کو اعتراض نہیں ہوتا تھا، ایسے میں قیدار کو کیا ہچکچاہٹ ہوتی اور کیوں ہوتی؟

اسمٰعیل کے انتقال کے بعد بھی یہ انداز جاری رہا۔

یہ نہیں کہ اسمٰعیل کوئی مسلم بیزار یا ہندو نواز آدمی تھا، اس کے ملنے والوں میں ڈھیر سارے مسلمان تھے، شام کی محفل میں سبھی جمع ہوتے مگر وہ مزاجاً سیکولر تھا اس لیے علما، خطیب، امام اور مبلغ قسم کے لوگ اُس سے ذرا احتیاط ہی برتتے اور اسمٰعیل کی موت کے بعد جس طرح اس کے کالج

کے ہندو دوستوں نے اس کے بقیہ معاملات کے سلسلے میں خصوصی دلچسپی دکھائی، اس نے ایک طرف تو قیدار کو بنسی دھر اور بھاٹیا سے بہت قریب کر دیا اور دوسری طرف بہن اپنے کالج کے ایک سینئر رمیش کی طرف زیادہ جھکنے لگی۔

قیدار اپنے معاملات کی وجہ سے دن دن بھر باہر، ماں ڈپریشن کا شکار، ایک تنہا لڑکی گھر دیکھتی یا بیمار ماں کو دیکھتی یا ڈاکٹر کے یہاں جاتی دوا لاتی، رمیش اُس کا سہارا بن گیا، ضرورت کے ہر لمحے میں حاضر، ایک دو مرتبہ اُس کی موجودگی کا احساس قیدار کو بھی ہوا مگر اس کی اپنی پناہ کی متلاشی جبلّت بنسی دھر اور بھاٹیہ میں ہمدرد تلاش کر چکی تھی، رمیش کے بارے میں اُس کا احساس کچھ زیادہ کھوجی نہیں ہو سکا۔

پھر ماں پر فالج کا حملہ اور بالآخر ماں کا انتقال۔

ڈھنڈھار تنہا گھر، اکیلی لڑکی...

ایک رات قیدار کو کھانے کے ٹیبل پر ایک رقعہ ملا۔

''رمیش میرے لیے ایسا سہارا بن گیا ہے کہ اُس پر اعتبار کرنے کو جی چاہ رہا ہے۔
میں اُس کے ساتھ جا رہی ہوں۔''

آپ کی بے سہارا بہن
نائلہ

بعد میں کسی سے پتہ چلا کہ دونوں ممبئی میں ہیں اور خوش ہیں۔

مگر قیدار کے لیے اورنگ آباد اب ایک بے آب و گیاہ خطہ بن گیا تھا، اُس نے اس شہر میں ہوش کی آنکھیں کھولیں، بچپن گزرا، نوجوانی دیکھی، باپ کو اِسی شہر میں لگاتار جیتے، اپنے اور اپنے گھر والوں کے لیے تگ و دو کرتے دیکھا، ایک چھوٹا سا گھر، جس میں فرشتہ صفت ماں اور سیماب صفت باپ کا سایہ موجود تھا، باپ کی پریشانیاں دیکھیں، مسکراہٹیں دیکھیں، محفلیں دیکھیں، تنہائیاں دیکھیں، گھر میں وہ اور اُس کی بہن، یہاں اس کے باپ کی رشتہ داری کا نام و نشان تو کب کا مٹ چکا تھا، ننہال پٹنہ میں نانا نانی کے بعد ماموں لوگ کسی نہ کسی حد تک پرسانِ حال رہے مگر بہن کے رمیش کے ساتھ ممبئی چلے جانے کے بعد اُن لوگوں نے بھی کنارہ کشی اختیار کر لی اور شہر کا مسلم طبقہ

بھی کنّی کاٹنے لگا، ایسے میں جب بنسی دھر نے مشورہ دیا کہ تم دہلی میں کوچنگ کر رہے تھے، تقریباً ڈیڑھ برسوں تک دہلی میں رہ چکے ہو، یہاں ابھی تمہارا گریجویشن مکمل نہیں ہوا ہے، تم کیوں نہیں وہیں داخلہ لے لیتے؟ تو اسمٰعیل کو بھی مشورہ صحیح لگا۔

''مگر وہاں میرا داخلہ کیسے ہوگا؟''

''وہاں میرے ایک دو آشنا پروفیسر صاحبان ہیں، بھگوان نے چاہا تو کام ہو جائے گا۔''

''مگر میرا تو یہاں ایڈمیشن ہے۔''

''یہاں سے ٹی.سی. لے لو، تمہارے سارے کاغذات نکل آئیں گے، وہاں نئے سرے سے داخلہ لے لو۔''

''سال برباد ہو جائے گا۔''

''مگر زندگی ایک نئے انداز سے شروع بھی تو ہو جائے گی۔''

''کچھ پیسہ زمین میں لگ گیا، باقی فکسڈ ڈپازٹ میں چلا گیا، خرچ کیسے چلے گا؟''

''فکسڈ ڈپازٹ سے ہر ماہ تقریباً سات آٹھ ہزار تو مل ہی جائیں گے۔''

''یہ تو شاید سال بھر بعد ممکن ہوگا۔''

''ابھی بھی تمہارے پاس لاکھ ڈیڑھ لاکھ بچا ہوگا، اُسی میں سے تھوڑا تھوڑا خرچ کرنا۔''

قیدار دہلی منتقل ہو گیا۔

• • •

16

جس رات نائلہ اور رمیش ممبئی کے لیے روانہ ہوئے اُس رات نائلہ اندر سے بہت بے چین تھی۔

پروگرام کئی دنوں پہلے سے بن رہا تھا... یہاں سے انوگرہ نرائن روڈ چلا جائے، وہاں سے گیا اور گیا سے ممبئی کے لیے ٹرین پکڑ لی جائے... نہیں، انوگرہ نرائن روڈ سے مغل سرائے... نہیں کسی بس سے گیا چلا جائے... اس میں بھی خطرہ ہے... ٹیکسی سے مغل سرائے... مگر ٹیکسی والے کو تو خبر ہوگی کہ ہم لوگ گاڑی لے کر کہاں گئے...

ہر اِرادے میں خطرہ محسوس ہوتا اور دونوں اُس پلان کو رد کر دیتے۔

''میرا ایک دوست ہے گوتم، اُس سے بات کی جا سکتی ہے۔''

''ایسا بالکل مت کرو۔'' نائلہ نے کپکپا کر رمیش کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''کیوں؟ کیا سمسّیا ہے؟''

''کسی تیسرے کو خبر نہیں ہونی چاہیے۔''

''کسی نہ کسی کا تو ساتھ لینا ہی پڑے گا۔''

کئی دنوں کی ماتھا پچّی کے بعد رمیش نے اپنے ایک دوست بھوپیندر کو اپنا ہم راز بنایا، بھوپیندر کے پاس جو گاڑی تھی، اُس کا شیشہ بھی کالا تھا، اُس نے کسی نہ کسی طرح نائلہ اور رمیش کو مغل سرائے پہنچا دیا۔ مغل سرائے سے دونوں کسی بس سے الٰہ آباد پہنچے اور الٰہ آباد سے ممبئی کے لیے کوئی ایسی ٹرین پکڑی جو ممبئی تو جاتی ہو مگر بہار سے نہ آ رہی ہو۔ سفر کے لیے دونوں نے عام ڈبّے کا استعمال کیا کہ اتنی بھاگ دوڑ اور راستہ بدلنے کی تگ و دو کے سبب ریزرویشن لینا تو بہت مشکل تھا، دوسری مشکل یہ بھی تھی کہ اب ریزرویشن ٹکٹ کے لیے آئی.ڈی. ضروری ہو گیا تھا۔

اورنگ آباد سے ممبئی تک کا راستہ چار دنوں میں طے ہوا۔

پہلے سے بنے پروگرام کے مطابق ممبئی میں رمیش کے بچپن کا ایک گہرا دوست اروِند اسٹیشن پر

موجود تھا۔ جس نے اِن لوگوں کے لیے پہلے سے ایک ٹھکانہ تلاش کر رکھا تھا۔ اسٹیشن سے تینوں اُسی ٹھکانے پر پہنچ گئے۔

اروِنداپنے گھر نہیں لے گیا کیونکہ اورنگ آباد سے کوئی کھوجتا ہوا اُس کے گھر بھی پہنچ سکتا تھا۔

نائلہ اور رمیش کا ٹھکانہ دھراوی میں تھا۔

دھراوی کسی زمانے میں ایشیا کی سب سے بڑی جھونپڑپٹّی مانی جاتی تھی۔ ممبئی آدمیوں کا جنگل تھا، اور اس جنگل میں دھراوی کی مثال اُس گودام کی تھی جہاں سے مختلف کاموں میں استعمال ہونے والا خام مال برآمد ہوتا ہے۔

شہر خواب اور بدخوابی کا سنگم ہوا کرتے ہیں، عام آدمی جس کا پیدا ہونے پر کوئی اختیار نہیں، جسے اپنی بھوک، غصّے، شہوت، خوف کیا شاید اپنے دُکھ سکھ پر بھی کوئی اختیار نہیں، کیوں کسی کو اچانک غصہ آجاتا ہے۔ کیوں خوف کی کوئی تیز درانتی اُس کا آپا سراپا کاٹتی اُس کے اندر اندر کہیں بہت دور تک اُترتی چلی جاتی ہے، گھپ اندھیری راتوں میں سہج سہج قدم رکھتے، اچانک اِردگرد جگمگ جگمگ کرتے ننھے ننھے جگنو، کسی باغ بغیچہ کے اِردگرد سے گزرتے کسی بلبل کا نغمہ، کوئل کی کوک، فاختہ کی پی کہاں پی کہاں، شام کے دھندلے منظر میں بھک سفید بگلوں کی کوئی قطار، ایک دوسرے کو پیار کرتے جاپانی طوطے، لوبرڈس، عشق پرندے من کے برآمدوں، گلیاروں اور برجیوں پر سر نہوڑائے کنڈلی مارے بیٹھے کسی انتہائی اُداس سناٹے اور تنہائی کو اِس بات کا احساس کیوں کرا دیتے ہیں کہ کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے...

ممبئی بھی شاید کسی نیم خواب کا استعارہ ہے جس میں کبھی کبھی بدخوابی بھی کسی سانپ کی طرح کنڈلی مارے بیٹھی رہتی ہے، کسی آکٹوپس کی طرح آہستہ آہستہ اپنے پنجے گاڑتی محسوس ہوتی ہے، کسی اندھیری سیاہ رات کی مثال بن جاتی ہے۔

''ابو نے بھی اس ممبئی کی دو تین سیاہ راتیں جھیلی تھیں۔'' نائلہ کو اُس کا باپ اسمٰعیل یاد آگیا تھا۔

جنگل اور رات... رات اور جنگل... جنگل میں رات... نائلہ جب ذرا اپنی کھولی کے آس پاس دیکھتی تو اُس کے اندر سہراون اور خوف کی ایک سرد لہر سی دوڑ جاتی، بعد میں اُسے معلوم ہوا کہ وہ کھولی میں نہیں جھونپڑپٹّی میں رہتی ہے، اُس کا ٹھکانہ تو بانس اور پلاسٹک سے بنا ہوا تھا، کھولی تو اِس سے مختلف ہے۔ اس کی دیواریں پختہ ہوتیں... کچھ دور پر کھولیاں نظر آئیں، ایسا لگا کھولی والے

جھونپڑپٹّی والوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں... تم ہم سے کم تر ہو، ہم تم سے بہتر ہیں۔

پھر اُس کی نگاہ نئی بنتی ہوئی فلک بوس عمارتوں کی طرف جاتی جو اِسی جھونپڑپٹّی اور کھولی باڑی والوں کی حدِ نگاہ کے اندر موجود تھی۔

کون کس سے بہتر ہے کون کس سے کم تر ہے۔

اسمٰعیل کی زبان سے سنا ایک جملہ یاد آگیا: ''تو من شُدی من تو شدم۔''

''کیا مطلب ابو!'' بیٹی نے بے ساختہ باپ سے پوچھا تھا۔

''فارسی کا کوئی شعر سنا تھا بیٹا، اُسی کا ایک ٹکڑا ہے۔

''مطلب کیا ہوا؟''

''میں تُو ہو جاتا ہوں تو میں ہو جا۔''

''یہ کیا بات ہوئی... آپ بھی ابو بالکل پہیلی بجھوانے لگتے ہیں!''

''نہیں بیٹا، پہیلی وہیلی نہیں ہے حقیقت ہے۔''

''کیسے؟ کیسے ابو؟''

تو ابو ہنس کر یہ کہتے ہوئے کسی طرف چلے گئے تھے کہ ''سمجھ میں آجائے گا بیٹا!''

ممبئی آنے کے بعد پہلی ہی شام کو اسمٰعیل کی یہ بات یاد آگئی تھی، نائلہ اُس وقت تنہا تھی، رمیش خورد و نوش کا انتظام کرنے باہر گیا تھا، نائلہ کو محسوس ہوا کہ ممبئی بہار سے بہت مختلف ہے، کچھ کولکتہ جیسی کیفیت، پسینہ زیادہ نکلتا ہے، جاتی گرمیوں کا موسم تھا مگر پسینے کی کمی نہ تھی، اُس کے اپنے شہر میں گرمیاں اور سردیاں خوب خوب پڑتی تھیں مگر اتنا پسینہ نہ چھوٹتا، اُس کا جی چاہا وہ نہا کر کپڑے بدلے، اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا... کہیں غسل خانہ نظر نہیں آیا... پھر اُس نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی... ارے! یہاں تو لیٹرین بھی نہیں ہے؟ اُس نے گھبرا کر اپنے اِردگرد نگاہ کی... ایک کمرہ، اُسی کے کنارے گیس کا سلنڈر... کمرے کے باہر پیر رکھنے بھر جگہ... پھر دروازہ... وہ چپکی بیٹھی رہی، نیا شہر، انجان علاقہ، پڑوسیوں سے ملاقات نہیں، وہ کیا کرے اُس کی سمجھ میں نہیں آیا...

سورج ڈوبنے کے آس پاس رمیش آگیا۔

پسینے میں تر بتر دونوں ہاتھوں میں کچھ پڑے پکڑے ہوئے۔

''یہاں تو بڑی سمسّیا ہے بھائی!''

''کیا ہوا؟''

''یہاں کی بھاشا سیکھنی پڑے گی، ہم جو بولتے ہیں یہاں والے سمجھتے ہی نہیں، انڈے کو بیضہ بولتے ہیں، کراسن تیل کو گھا سلیٹ، پیاز کو کاندا، مچھلی کو مچھّی، آلو کو بٹاٹا... It is nonsense یار۔'' رمیش جھلّا کر بولا۔

''بولی تو ہر جگہ کی الگ الگ ہوتی ہی ہے۔'' نائلہ سامان سنبھالتی ہوئی ہنسی۔ ''یہاں تو موسم بھی عجیب ہے، اتنا پسینہ نکلا، میں تو نہانے کو سوچ رہی تھی مگر کہیں غسل خانہ تو ہے ہی نہیں۔''

''ہم تو اشنان کریں گے بھائی۔'' یہ کہتے ہوئے رمیش نے تولیہ اُٹھائی اور دروازے سے باہر نکل گیا۔

نائلہ گیس سلنڈر کی طرف چلی گئی، کھانے کا انتظام تو کرنا ہی تھا۔

جیسے جیسے رات گزرتی گئی، ممبئی کا موسم خوب صورت ہوتا گیا۔

شہر بھی آدمیوں جیسے ہوتے ہیں، سانس لیتے ہیں، چھوٹے سے بڑے ہو جاتے ہیں، پھر کوئی دَم آتا ہے کہ مر جاتے ہیں۔ نالندہ، پاٹلی پترا، تغلق آباد، عظیم آباد، کیسے ہولے ہولے جنم لیا، عدم سے وجود میں آئے، آدمی تو گوشت، ہڈّی، خون پانی رگوں اور ریشوں کا پتلا ہوتا ہے، شہر کا ہے کا پتلا ہوتا ہے، شاید سانس لیتے آدمیوں کا، جانداروں کا، عمارتوں کا، باغ بغیچوں کا، آدمی کی بنائی مشینوں کا اور خوابوں کا بھی، شاید صرف آدمی خواب نہیں دیکھتا، شہر کے آپے سراپے میں بھی خواب خون اور پانی کی طرح تیرتے رہتے ہیں، تہذیب کا خواب، علم کا خواب، محبت کا خواب اور پھر وہ جذبہ؟ جس کا شہر اظہار کرتا ہے، یہ اظہار عہد بہ عہد اپنا چولا بدلتا رہتا ہے، شیر خاں کا سہسرام کبھی حکمرانی کے جذبے کا اظہار کرتا تھا مگر آج شیر خاں کا بسایا شہر محکومی کی بولی بولتا ہے، شہر وقت کی پلکوں کے اشارے سمجھتا ہے۔

ممبئی کی رات آہستہ آہستہ محسوس ہونے لگی تھی۔

نائلہ اور رمیش دونوں تھکے ہوئے تھے، مگر موسم دونوں کے سراپے میں قطرہ قطرہ اُتر رہا تھا، کھانے کے بعد دونوں کمرے میں آئے تو پنکھے کی ہوا نے راحت کا احساس کرایا، دن بھر کی اُمس اب ٹھنڈی ہوا میں تبدیل ہو رہی تھی اور مساموں میں کچھ سکبکاہٹ اور کنمناہٹ محسوس ہو رہی تھی، دونوں نے دیکھا کمرے میں ایک ہی بستر تھا، نائلہ کچھ بولی نہیں، وہ کیا بولتی، گزشتہ گیارہ بارہ

مہینوں میں اُس نے رمیش کو پور پور دیکھا تھا، اندر باہر سارا کچھ، اُسے ایسا لگتا تھا وہ جب بھی ٹوٹی، اُداس ہوئی، آنکھیں بھر آئیں تو وہ رمیش ہی تھا جو کسی اَن دیکھی دِشا سے اچانک اُس کے سامنے آن کھڑا ہوتا، اُسے سمجھاتا، ہمت بڑھاتا، اُسی کے ماں باپ کی بات کرتا، اُس کے اپنے آپ کا ایک اٹوٹ اَنگ بنتا محسوس ہوتا اور اُس پر بھی دونوں کے درمیان وہ پل کبھی نہ آیا تا جب برداشت ختم ہو جاتی ہے، جذبہ ہار جاتا ہے اور جذباتیت جیت جاتی ہے، جسم حاوی ہو جاتا ہے۔

وہی رمیش آج بھی سامنے تھا، دونوں اکیلے تھے، بستر ایک تھا، رات آہستہ آہستہ کچھ عجیب سے سُر میں گاتی گنگناتی اُن دونوں کے آپے سراپے پر چھاتی چلی جا رہی تھی۔

''یہ کیا ہے؟'' نائلہ کے من میں ایک سوال نے سر اُٹھایا۔

''یہ وہی ہے جو تم نے اپنے آگے پروسا ہے۔''

''نہیں میری تھالی تو خالی تھی۔''

اس نے کہنا چاہا لیکن کہہ نہ سکی، وہ اندر ہی اندر گڑبڑا گئی تھی، بیتے مہہ و سال لپ چھپ کرتے اُس کے سامنے فلیش بیک میں، جھماکے کرنے لگے تھے، وہ دوبدھے میں پڑی... اُسے لگا اُس نے رمیش کو اپنا خوف سونپا، آشائیں اَرپت کیں، تنہائی بانٹی، گریہ میں ساجھا کیا، بدلے میں رمیش نے اعتماد دیا۔

اُسے گزرے ہوئے ایسے کئی گھنٹے یاد آئے جب وہ دونوں تنہا تھے، تب بھی تو رمیش بس ایک ٹھنڈی، نرم، سکون بخش ہوا کی طرح اُس کو بس تنہا نہ ہونے کا احساس دلاتا رہا۔

رمیش سامنے کرسی پر بیٹھا تھا۔

نائلہ بستر کے ایک حصے پر سکڑی سمٹی موجود تھی۔

کچھ تھا جو دونوں محسوس کر رہے تھے اور محسوس کرنا نہیں چاہ رہے تھے۔

''تم تھک گئی ہو گی، اب سو جاؤ۔''

''تم؟''

''میں یہیں پر، کہیں سو جاؤں گا۔''

''کہاں سوؤ گے؟ کیسے سوؤ گے؟ ہم تو ایک بستر لے کر بھی نہیں چلے۔''

''تم سوؤ، ہم سماچار پتر لے آئے ہیں، ذرا دیکھتے ہیں یہاں بھی تو نوکری کا وِگیاپن نکلتا

ہوگا۔‘‘

رمیش اُٹھ کر اخبار لے آیا اور کرسی پر ہی بیٹھا بیٹھا پڑھنے لگا۔

نائلہ سمٹی سمٹائی بستر کے ایک کونے میں لڑھک گئی۔

اِدھر نائلہ نے بستر سے پیٹھ ٹکائی اور آنکھیں بند کیں تو دماغ میں آندھیاں چلنے لگیں۔

پاگل ہوا لمحوں کی کترنیں اُڑائے پھرتی تھی۔ چار دن تو ایسی بھاگ دوڑ میں گزرے کہ رُک کر سوچنے یا پیچھے دیکھنے کی فرصت ہی نہ ملی، مگر اَب جو وہ بستر پہ لیٹی اور آنکھیں بند کیں تو اسمٰعیل پورے کا پورا اُس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔

نائلہ ہڑ بڑا کر بستر چھوڑ کر کھڑی ہو گئی۔

’’کیا ہوا؛؟‘‘ وہ دوڑ کر نائلہ کے پاس پہنچا۔

’’ابو!‘‘ اُس نے پھٹی پھٹی آواز میں جواب دیا۔ اُس کی آنکھوں میں وحشت کا رنگ گہرا تھا اور وہ اپنے سامنے ایک ٹک تکے جا رہی تھی۔

’’ابو کہاں سے آجائیں گے؟ ان کو مرے دو برس گزر گئے۔‘‘ اُس نے نائلہ کو شانت کرنے کی خاطر اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

’’تھے... ابو تھے... یہاں پر کھڑے تھے۔‘‘ وہ سسک سسک کر رونے لگی۔

رمیش نے اُسے دلاسہ دینے کی خاطر اپنے قریب کر لیا۔

’’تم کو بھرم ہو گیا ہو گا، تم پچھلی باتیں یاد کر رہی ہوں گی۔ ایسے میں ایسا کبھی کبھی ہو جاتا ہے۔‘‘

’’رمیش وہ تھے۔ وہ عجیب انداز میں مجھے دیکھ رہے تھے۔‘‘ اتنا کہتے کہتے وہ رمیش کے گلے لگ گئی اور سسک سسک کر رونے لگی۔

اور تب یوں ہوا کہ جنت اور جہنم دونوں کے دَر بیک وقت کھل گئے۔

کہیں آفاق کے پرے آنسوؤں میں بھگوئی، مسرتوں سے لپٹی، وجود کے اندر باہر پور پور کو سرمست و بدمست کرتی، سوئی کی نوک کی طرح ہولے ہولے چبھتی، مور پنکھ کی طرح بہت شریف و رحیم ہلکی ہلکی، سوئی سوئی شرم سے لجاتی، جھجک جھجک کر آگے بڑھتی شیتل ہوا دونوں کے آپے سراپے کو ہلکے ہلکے چھونے لگی، سونا بھٹّی کے قریب آنے لگا، سُنار نظر نہیں آ رہا تھا مگر کہیں تھا، دوں گی میں کانوں کا مونڈل، کاہے کرو ہتھ جوری، با جو بند کھل کھل جائے، نہ کرو تکرار، پیّاں پروں میں توری،

سیّاں مورے... سیّاں مورے... سائیں سنار نظر نہیں آ رہا تھا، سونا آتش دیدہ ہوتا جاتا تھا، کوئی شراب تھی کہ زراب تھی، یا زرِ رومی تھا، کچھ تو تھا، جو مثالِ آتشِ تر سر سے پیر کے انگوٹھے تک سرایت کرتا جاتا تھا، دونوں جلتے جاتے تھے اور دونوں بھیگتے جاتے تھے، کوئی جنت تھی پتہ نہیں سچّی کہ جھوٹی مگر تھی، محفل طرب آراستہ تھی، مغنچے ہاتھوں میں کچھ لیے ہوئے تھے، پتہ نہیں دُف تھا کہ کھنجڑی تھی کہ جھانجھر تھا یا پھر اکتارا، طنبور، ستار، خیال، کچھ تھا، کچھ بجتا تھا، دھمال مچا ہوا تھا، برہما کنکھیوں سے پاروتی کو دیکھتے تھے، منوسمرتی میں لکھا ہے کہ کرشن کی پسلی سے رادھا پیدا ہوئیں اور پھر کرشن نے رادھا کے ساتھ راس رسا، پھر رادھا کرشن میں سما گئیں... برہما پاروتی کی طرف جھک آئے ہیں، نائلہ اور رمیش کہاں تھے؟

موطنِ قیامت تو عالمِ ناسوت ہی کے اجزاء سے ہے اور عالمِ ناسوت میں ذات مرئی نہیں ہوتی، غفلت سے شہوت پیدا ہوتی ہے اور شہوت سے غفلت، غفلت و شہوتِ کلّی مشکوک ہے، حضوری کے مراحل میں ایک مرحلہ یہ بھی ہے کہ وہ شخص بالکل قریب موجود ہو مگر اُس کے تصورِ دیدار میں اس قدر محویت ہو جائے کہ نہ اُس کی خبر رہے، نہ اپنی خبر رہے، اور پھر آگے کے مراحل میں یوں بھی ہوتا ہے کہ بے خبری کی بھی خبر باقی نہیں رہتی، یہ ’’نومِ غرق‘‘ ہے جس میں ’’صاحبِ نومِ غرق‘‘ کو اِس کا بھی علم نہیں ہوتا کہ میں نوم میں ہوں۔

نائلہ اور رمیش ایک دوسرے سے بے خبر تھے۔

ایک دوسرے سے بے خبر تھے اور ایک دوسرے سے قریب آتے جاتے تھے، سلطان الاذکار، رنگوں اور آوازوں کا ہجوم، چڑیاں چہچہا رہی تھیں، پھر یک بارگی سب کچھ بدل جاتا، خوف ناک آوازیں، گڑگڑاہٹ، رعد و باراں، صاعقہ بر دوش، کڑکتی بجلیاں آپا سراپا جلانے کے درپے... بارش... جھما جھم بارش... ہہاس... طوفانوں کی آمد کا احساس۔

نائلہ بے تحاشہ ڈری ہوئی، سہم سہم کر رمیش سے لپٹ جاتی، نائلہ کے آپے سراپے میں ہاڑ مانس کے پُتلے میں، ناڑیوں میں، پور پور میں کچھ عجیب سی اَن دیکھی، اَن جانی، اَن چھوئی کیفیت، مسرت، لذت....

پہاڑی ندیاں بھی عجیب ہوتی ہیں، مانو اپنی دُھن میں، اپنے سوانگ میں، اپنے نشے میں گم،، پانی سمندر کا بیٹا، اُسے چاہیے سمتل ہموار، دباؤ والی نرم نرم زمین، ایسا من موجی کہ جن گلیوں کو چوں

کونوں کھدرے سے گزرے، جیسے انگلی سے کھود کھود کر سب اوبڑ کھابڑ نشان مٹا دے، باقی بچے بس اُس کی اپنی نرم نرم اسفنج، ریشم اور دلدل جیسی زمین۔ مگر یہی پانی جب پہاڑی ندی کا من میت تو پھر یاری کا انداز بھی بدل جائے، سخت چٹانوں پر اپنا رستہ بناتا اور ٹوہ میں رہتا کہ کہیں تو ڈباؤ ہو، دور دور تک چٹیل پتھریلے سخت کھردرے پہاڑی سلسلے، وِندھیا چل سے کیمور اور روہتاس کے سہسرام تک کیسا فلک بوس پہاڑوں کا عظیم الشان اور ہیبت ناک سلسلہ اور اُس کے عین مین چھاتی پر اُگے خوف ناک جنگل، اور اُن جنگلوں میں اَنگنت بھانت بھانت کے جانور اور بھر روپ انوپ کیڑوں مکوڑوں کی، راہ چلتے سرسراہٹ محسوس ہوتی، کبھی ڈگر ڈگر پگ پگ کے ساتھی، کبھی چپکے سے جانگھوں میں سرسرانے والے، اور پھر ترل ترل بہتے پانی کا جھرنا، کہاں سے آتا ہے کہاں جاتا ہے، پانی کے سنگ سنگ آگے بڑھتے چلے جاؤ، سر بفلک پہاڑ، پر کون کس اور کس موڑ سے آیا، موڑ پر موڑ کاٹتے کاٹتے یکایک غائب... کہاں گیا... پتہ نشان نہیں... پھر چلتے چلو... چلتے چلو... چٹیل پتھریلی زمین پر... یکا یکی ایک جگہ پیروں میں کچھ نمی کا احساس... ہاں ہاں... پانی... مانو کسی سرنگ سے نکل رہا ہے... پتلی سی منحنی سی لکیر... چپکے چپکے سیدھ میں بڑھتی جاتی، پھیلتی جاتی... لو پھر ایک جھرنا، ایک کنڈ...

نائلہ اور رمیش دونوں کو اُس پل میں لپ چھپ کرتی، کبھی کمزور، منحنی اور کبھی بہت زور آور ہوتی اِس پہاڑی ندی کا گیان نہیں ہوا، مگر کچھ ایسا ضرور تھا جو اُن میں ہونکاریں بھرتا تھا، سر پٹختا تھا، چپ ہو جاتا تھا، چھپ جاتا تھا مگر جگر جگر کرتا عین مین اُن کے سامنے آ کر ہو نکلنے لگتا... کوئی سرنگ جو رمیش کے اندر اندر سے ڈر، بھئے، دوبدھے اور ہاں نہیں کے پتھروں کو کاٹتی نائلہ کے آپے سراپے میں پھیلی بے اَنت پیاسی صحرا سمان دھرتی پر شانتی اور سُکھ اور چین اور کچھ اَدھورے کو پورا ہونے کا احساس کراتی، بغیر کسی شور کے پسری چلی جاتی تھی اور دونوں بسرتے چلے جاتے تھے۔

پھر آخری منزل!

پہاڑی ندی اب اُپھان پر ہے، پہلے ملگجا پیلا پانی، پھر پھین جیسے ٹنوں ٹن صابن گھول دیا گیا ہو... بھاگو... بھاگو... باڑھ آ رہی ہے... ندی اب جوش میں ہے، اپنے ساتھ سب بہائے لئے چلی جا رہی ہے، چھوٹے چھوٹے اِرد گرد کے پودے، دلیل کے یا منطق کے؟ بڑی بڑی شہتیریں، خوف کی، بے اعتمادی کی، وسوسے کی، پورے کا پورا درخت عقیدے اور آستھا کا۔

نائلہ اور رمیش پور م پور بہتے چلے جا رہے تھے۔

اور پھر آسمان کی بے اَنت اونچائیوں پر اُڑتے عقابوں نے دیکھا، سن سفید جامہ پہنے بگلوں نے دیکھا، طوطا مینا، کوا گوریا، فاختہ بلبل مور، سب نے نیلگوں آسمانی فضاؤں میں اپنی اپنی منزلوں کی اور اُڑتے ہوئے ایک بار پلٹ کر دیکھا، اَدھ موئے ماس سے تھوڑا پرے پرے گندھ لینے والی چیلوں نے دیکھا۔

نائلہ اور رمیش دھواں کنڈ کی انتہائی گہری کھائی میں گرتے نظر آ رہے تھے۔

چاروں طرف دھواں پھیلا ہوا تھا، مانس نین سامنے کا درشئے دیکھنے یوگی نہیں، ہر چیز دھند کی ایک گہری اور پراسرار وادی میں گرتی محسوس ہوئی، ایسا لگا جیسے سامنے ہمالہ کی گپھاؤں میں کسی بدھ لاما کا اسرار خانہ ہے، چاروں طرف عود و عنبر کی لپٹیں سی اُٹھ رہی تھیں، اور ایک سمفنی سی گونجتی تھی، نغمہ تھا مگر بے لفظ، سر تھا مگر نا قابل فہم، نائلہ تھی مگر یوں جیسے خواب میں کسی شئے کا وہم، رمیش تھا مگر یوں جیسے خلاؤں میں کسی لاشئی کا ہیولی... پہاڑی پُر شور ندی کا پانی ہزاروں فٹ گہری کھائی میں گر رہا تھا اور پانی کو ندی سے ملتے کوئی نہیں دیکھ پاتا... گہری راتوں میں پہاڑوں کی چٹانوں پر... یا مور کے پیروں کی بنی سیج پر آدم اور حوا کسی خیالی جنت کا خواب دیکھتے ہوئے۔

نائلہ اور رمیش بستر پر بے سُدھ سو رہے تھے، جیسے آدم اور حوا سوئے ہوں گے۔

بھور کے دھندلکے میں کوئی ٹٹہری جیسی آواز نکالتا پرندہ گزرا، نائلہ بھولی بسری کسی مانوس و محبوب آواز کے مکر جال میں گھری اور تڑپی۔

''جائے جو اُس پار، کبھی لوٹ کے نہ آئے۔'' جانے کب کا سنا ایک بول یاد آ گیا۔

''بھیا کہاں ہوگا؟'' وہ ایسے تڑپی جیسے مچھلی کو جلتی تپتی سلگتی ریت پر رکھ دیا گیا ہو!

● ● ●

17

قیدار کو دہلی آئے چند دن ہی گزرے تھے کہ اُسے اپنے دہلی کے ایک دوست عبدالجبار کے ساتھ بستی حضرت نظام الدین جانے کا موقع ملا۔

اُس رات اُس نے اپنی کاپی میں لکھا:

قصائی نے کہا: ''ابھی اِس میں جان باقی ہے۔''

میں کپکپا کر وہاں سے ہٹ گیا... ویسے بھی مجھے کون سی خریداری کرنی تھی؟

بغل میں چائے کی دوکان، دوسری طرف پان بیڑی، پیچھے بڑا نالہ، کنارے پر بھکاریوں اور بنجاروں کے بچے... کوڑی کھیلتے ہوئے یا پیشاب پیخانہ کرتے ہوئے...

''خیر یہ تو تمہاری طبیعت کی گندگی کا ثبوت ہے۔'' میرا دوست عبدالجبار مسکرا کر بولا، ورنہ اِسی علاقے میں غالب اکیڈمی بھی ہے، اُدھر دیکھو سامنے کیا صاف ستھرے ہوٹل ہیں، بڑی بڑی کتابوں کی دوکانیں، اور پھر سب سے بڑھ کر... سلطان جی... حضرت محبوب الٰہی!''

ہوا کچھ یوں کہ عبدالجبار کو ایک بچی کے علاج کے سلسلے میں وہاں جانے کا موقع ملا اور اُس نے مجھے بھی ساتھ لے لیا، ویسے جب میں کوچنگ کی خاطر دہلی میں مقیم تھا تو اُس درمیان بھی کئی بار حاضر ہونے کا موقع ملا تھا، مگر اِس مرتبہ کا معاملہ کچھ اور تھا۔

قصائی نے کہہ دیا تھا ابھی اس میں جان باقی ہے اور ہمارا دوست عبدالجبار بنگلے والی مسجد بھول گیا تھا۔

بچی عبدالجبار کی بھتیجی ہے اور بے چینی کا شکار ہے، کئی کئی شب و روز گزر جاتے ہیں اور وہ سو نہیں پاتی، اختلاج بھی ہے، رونا آتا ہے تو روتی چلی جاتی ہے، چپ کا دورہ پڑتا ہے تو دو دو تین تین دن چپ اوڑھ لیتی ہے، دروازے پر کھڑی جانے کس کی راہ تکتی ہے، پوچھو تو بس ایک جواب... ''نہیں کچھ نہیں!'' دیکھو تو سوال، انتظار اور اُداسی کے بوائلنگ فرنیس پر بیٹھی چپ اُداس لڑکی۔

اِس اُداس لڑکی کے گھر والوں کو یقین ہو گیا ہے کہ اِس پر آسیب کا سایہ ہے۔

ایک آسیب سے تو میں بھی واقف ہو، جو حضرت اشرف جہاں گیر کچھوچھوی کے علاقے سے سلپ کر گیا، اور بعد میں اُس کا ایک ہم زاد بھی اُسی میں سے برآمد ہو گیا، یہ آسیب اب پورے ہندوستان میں دندناتا پھر رہا ہے، مگر اس بچی کا آسیب اُس کے باپ اور گدی نشین دونوں کی نگاہ میں اُس سے بھی بڑا آسیب ہے، اور اِس سے نجات کے لیے اُس بچی کو چالیس دن تک درگاہ میں، حجرے کے باہر، پائنتی میں ہر روز تین گھنٹوں تک بیٹھنا ہوگا۔

عبدالجبار واقف تھا کہ میں اورنگ آباد چھوڑ کر دہلی منتقل ہو چکا ہوں، انجینئرنگ کا ارادہ ترک کر دیا ہے اور یہ کہ کالج میں ابھی میرا داخلہ نہیں ہوا ہے... گویا راہِ فرار مسدود تھی... دہلی میں عبدالجبار ہمیشہ میرے دُکھ کا شریک رہا، اُن دنوں بھی جب بہار میں ابو زندہ تھے، میں دہلی میں رہتا تھا اور بہار میں امن و قانون بہت بڑا مسئلہ بنا ہوا تھا، مختلف علاقوں سے مسلسل وحشت ناک خبریں ملتی تھیں، میرے شہر پر بھی جیسے کوئی آسیب طاری تھا، شام ہوتے ہی بازاروں میں ہُو کا عالم... مغرب کی اذاں کے بعد سڑکیں بالکل ویران... لوگ محلے کی گلیوں میں اور ''محفوظ مقامات'' پر چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں ہراساں، چوکنا اور مصروف... اور ہر صبح اخبار میں ایک نئے شہر کا نوحہ!

قصائی کہہ رہا تھا، ابھی اس میں جان باقی ہے۔

تاریخ بتاتی ہے: ہسپانیہ میں مسلم اقتدار کا دور بدامنی اور افراتفری کا دور تھا۔

میری اِن باتوں پر عبدالجبار بگڑتا ہے: ''تم قنوطی ہو، فراری ہو، تمہاری نگاہ تاریک پہلوؤں پر زیادہ ٹھہرتی ہے۔''

مجھے عجب سا احساس ہوا، کچھ حبس جیسا، لگا دم گھٹ جائے گا، سر میں کافی درد ہو رہا تھا، شاید مسلسل سوچنے کا نتیجہ ہو، میں نے سر جھٹکا اور آگے بڑھ گیا... بازار کی رونق عروج پر تھی، بس اسٹاپ کے پاس ہی سے خاص قسم کی ٹوپی اور پائجامہ بتا دیتا تھا کہ یہ بستی حضرت نظام الدین ہے اور یہاں بنگلے والی مسجد...

عبدالجبار کہتا ہے، یہاں غالب اکادمی بھی ہے جس میں ہر دوسرے تیسرے دن کوئی نہ کوئی ادبی یا سیاسی یا مذہبی جلسہ ضرور ہی منعقد ہوتا ہے، اور تب ایسے میں مجھے مور (Moore) یاد آتے ہیں جو قشطالہ کے حاکم فرڈی ننڈ سے الفانسو تک ادب و شعر کا دفتر کھول کر بیٹھ گئے۔

قصائی کہتا ہے...

میں دیکھتا ہوں، مسجد اور درگاہ کے آس پاس دور دور تک، فٹ پاتھی دوکانیں جن میں طغرے، ٹوپیاں، جانماز، چھوٹی بڑی مذہبی کتابیں، کچھ اور آگے... فٹ پاتھ ہی پر... اور کہیں کہیں ٹھیلے پر، چائے کی دُوکان، کڑاہ، بڑی بڑی کیتلیاں، شیشے کے چھوٹے چھوٹے گلاس، بیچ بیچ میں گوشت کی دوکانیں... ''یہاں بھینس کا گوشت ملتا ہے۔'' اور پھر پھول، نُقل، چادر کی دوکانیں... درگاہ کی سرحد شروع ہوتی ہے... بائیں طرف ایک پتلی سی گلی جو محلے کے اندر چلی گئی، اور سیدھے چلے جایئے تو درگاہ... آیئے جناب! چادر لے جایئے... پھول چاہیے جناب؟ اللہ کی راہ پر... خواجہ صاحب کا صدقہ... مولا دین دنیا کی بھلائی نصیب کریں... کچھ دیتے جایئے...''

مجھے اپنے آپ پر ہنسی آ گئی... کان بجنے کی بھی حد ہوتی ہے، اب ایسا بھی کیا کہ چاروں طرف سے یہی سنائی دے... ڈیوڑھی ڈیوڑھی آواز لگاتے کسی منگتا فقیر سے بازار میں بیٹھی کسی ناظمہ اغضب اللہ تک ایک ہی آواز... کچھ دیتے جایئے... کچھ ملے بابا... مانگنے والا گدا ہے، صدقہ مانگے یا خراج... پتہ نہیں کس کا شعر ہے کب سنا تھا... مگر خراج فقیری کیسے ہو گیا؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا، شاید عبدالجبار ٹھیک کہتا ہے، میری طبیعت ہی مراقی ہو گئی ہے، ہر سوچ گھوم پھر کر فٹ پاتھ، گندگی اور بھکاریوں تک جا پہنچتی ہے، مگر میں کیا کروں... شنت ماریہ کا حاکم جب الفانسو کے لیے کچھ چیزیں تحفے کے طور پر لایا تو الفانسو اس وقت ایک بندر سے کھیل رہا تھا، اس نے شنت ماریہ کے حاکم کی طرف وہ بندر بڑھایا... ''تم اسی بندر کے مستحق ہو!''

بندر کو معمولی سی پھنسی نکلتی ہے، تو پوری قوم اُسے نوچتے نوچتے ناسور بنا دیتی ہے۔

امینہ... بانو... باقی...

بنگلے والی مسجد میں جماعت داخل ہو رہی ہے، وہاں سے جماعت نکل رہی ہے... اللہ کافی!

عبدالجبار کا بھائی اپنی بچی کا آسیب اُتروانے کے لیے درگاہ کی پائنتی میں بیٹھا ہوا ہے... اللہ؟

تِس پر عبدالجبار کی بات یاد آتی ہے۔ ''یار! یہ فیصلہ کیسے ہو کہ کس پر آسیب سوار ہے؟''

اور تب اُس پل میرے جی میں ایک بات آئی: ''کس پر آسیب سوار نہیں ہے؟''

میں پھر ٹریک سے باہر ہو رہا ہوں۔ میں نے سوچا اور ہوٹل میں داخل ہو گیا، بھوک شباب پر تھی۔

ہوٹل زائرین اور مبلّغین سے بھرا ہوا تھا... طرح طرح کے لوگ، طرح طرح کی باتیں...

''بھائی! ہدایت تو تقدیر کی بات ہے، ورنہ ''فضیلت کامل'' میں تو صاف لکھا ہوا ہے ...''ایک چلّہ برابر ایک حج کے!''

''ہم لوگوں کی حج کی تو اوقات نہیں کم از کم دہلی، کچھو چھ اور اجمیر ہی سہی۔''

''درگاہ میں شرک، مسجد میں ذہنی افلاس، قوم کا خدا حافظ ہے۔''اقامتِ دین'' کے بغیر کچھ نہیں ہوسکتا۔''

گھر سے مسجد ہے، بہت دور چلو یوں کر لیں
کسی روتے ہوئے بچے کو ہنسایا جائے

کوئی شعر گنگناتا ہوا گزرا اور اُسی پل ایک تحریر جھلملائی:

''مدرسوں اور خانقاہوں میں چند درجن کتابوں کے سوا کچھ نہ تھا، استاد شاگرد کو فقہ سکھاتا تھا یا آخرت کے عذاب سے ڈراتا تھا اور جنت کا لالچ دلاتا تھا، اور شیخ خانقاہ تسبیح و مناجات اور وظائف و ملفوظات کھولے بیٹھا تھا۔''

لاحول ولاقوۃ۔ یہ جب نہ تب، میں مقبوضاتِ الفانسو کی طرف کیوں دوڑ پڑتا ہوں؟

میں نے سر جھٹکا اور ٹھیک اُسی وقت ایک زوردار قہقہے نے مجھے چونکا دیا، سامنے سے ایک مجذوب قہقہہ لگاتا گزر رہا تھا... قہقہے کے عقب میں اُس کی زوردار آواز سنائی دی...سب سنسار دیوانہ بھیا...سب پر ہے آسیب...پھر وہ فلمی دُھن کے ٹرانس میں آ گیا...ہو جی ہو...''

میں نے اُوب کر سامنے فٹ پاتھ پر پھیلی اخباروں کی ایک دوکان پر سے ایک اخبار اُٹھالیا، مگر سرخیوں سے بوکھلا کر باہر نکل آیا... جائے پناہ کہاں ہے؟ چاروں طرف...''

میں گھبرا کر کتابوں کی دوکان میں داخل ہو گیا...تبلیغی نصاب ...فضائلِ اعمال...الماریاں خوب صورتی سے سجی ہوئی تھیں اور کتابوں سے بھری ہوئی تھیں۔

میں نے چاروں طرف تلاش کیا، پھر دوکاندار سے پوچھا...''تاریخ کی کوئی کتاب؟''

''جی۔ ہم تاریخ کی کتابیں نہیں بیچتے۔''

''بھائی... مسلم...نہیں نہیں، اسلامی تاریخ؟''

''کہانا۔ ہم تاریخ نہیں بیچتے۔''

''قیدار صاحب۔ بڑے بقراط بنتے ہیں آپ، مگر سامنے کی بات آپ کو نہیں معلوم؟''

عبدالجبار ہنسا۔

''کیا...سامنے کی بات کیا؟''

''یہی کہ اِس وقت مذہب بیچنے میں جتنا فائدہ ہے، تاریخ فلسفہ بیچنے میں اُس کا عشرِ عشیر بھی نہیں۔''

''کیا ملحدوں جیسی باتیں کرتے ہو؟''

''تاریخ فلسفہ تو چھوڑیے، اب تو فلم سے بڑا مارکیٹ مذہب کا ہے۔''

''استغفراللہ!''

میں نے بوکھلا کر، گڑبڑا کر اور گھبرا کر اپنے پیروں کی طرف نگاہ کی۔

پھر ذہن میں ایک سوال کا انکھوا پھوٹا... تاریخ فلسفہ کے بغیر کوئی قوم؟

پھر یاد آیا کہ فرڈی ننڈ سے الفانسو تک تسبیح و مناجات جاری رہی اور تعویذوں کا سلسلہ چلتا رہا۔

عبدالجبار کے بھائی کا خیال ہے کہ اُس کی بھتیجی پر آسیب سوار ہے، خود وہ بچی سوال انتظار اور اُداسی کی کھولتی ہوئی مہر بند کڑاہ پر بیٹھی ہوئی ہے...گدّی نشین حاضرات لگوا رہا ہے...سوئی والان میں دھڑ دھڑا کالم پر کالم چھپ رہا ہے... بنگلے والی مسجد، مسجد عبدالنبی اور اُردو گھر میں عمل اور ردِّ عمل کا سلسلہ جاری ہے اور حضرت اشرف جہاں گیر سمنانی کے علاقے سے سمستی پور پہنچ کر گم ہو جانے والا آسیب اب دہلی پہنچ چکا ہے...مودی کی جناب میں حاضری کا سلسلہ بھی جاری ہے اور ''حاضرات'' کا بھی۔ قصائی کہتا ہے کہ مردہ جانور کے گوشت کا جو لوتھڑا دھڑک رہا ہے، اس میں ابھی جان باقی ہے، اور میں سوچتا ہوں کہ دلّی ہندوستان کا دل ہے، اس کی دھڑکن تو پورا ہندوستان محسوس کرتا ہے۔

جھٹپٹے اور دُھند میں صورتِ حال کا صحیح اندازہ تو بہت مشکل ہوتا ہے مگر اتنا واضح ہے کہ مُوروں کے ہاتھوں شکست کھانے کے احساس نے عیسائیوں کو زخمی سُور کی طرح خطرناک بنا دیا تھا... دادری میں اخلاق کا قتل۔ اُسی زمانے میں اُندلس اور اُس کے گرد و نواح میں ولی یعقوب کی زیارت گاہ کا بڑا چرچا ہوا اور اِس یادگار کو نمایاں اور مشہور کرنے میں برگنڈی کے فرانسیسی راہبوں نے بہت اہم کردار ادا کیا۔ کچھ لوگ ہر دن تیوہار منا رہے ہیں، جگہ جگہ پرانے مندر کھوج رہے ہیں اور ساری نت نئی یادگاروں کو نمایاں اور مشہور کرنے میں ہمارا قومی ذریعہ ابلاغ خوب نمایاں کردار ادا کر رہا ہے۔

اورٹھیک اُسی وقت نہ جانے کن دھندلکوں سے نکل کر مجذوب میرے سامنے آن کھڑا ہوا، کچھ دیر مجھے غضب ناک نگاہوں سے دیکھتا رہا، پھر میری شرٹ کا کالر پکڑ کر کتابوں کی دُکان سے باہرلایا، سڑک پر تقریباً پٹخ دیا اور چیخنے لگا''...کھلے میں آ...کھلے میں آ...''

میں کھلے آسمان کے نیچے آچکا ہوں، سوال انتظار اور اُداسی کے بوائلنگ فرنیس پر بیٹھے وجود کا درد محسوس کر رہا ہوں اور چاہتا ہوں کہ دوکانوں میں کتابوں کاسِٹ بدل جائے۔

مگر میرے چاہنے سے کیا ہوتا ہے؟

سچے صاحب! یہ قصائی اور گدی نشین!

سچے سائیں! یہ دوکان اور سوئی والان!!

سچے پاشا! الفانسو ہم سے محراب ومنبر تو لے چکا...اب؟

آگے کاپی کے صفحات سادہ تھے!!

• • •

18

بھائی کے ساتھ باپ کی بھی یاد آئی، پھر باپ کا جملہ گونجا،''تومن شدی من تو شدم'' بے ساختہ اُس کی نگاہ بغل میں سوئے رمیش پر پڑی اور خود بخود ایک جھینپی جھینپی مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔

نشہ تو ٹوٹ چکا تھا، خمار باقی تھا۔

سانس لیتے جاندار میں مہک، مزہ اور لذت کا عنصر بھی عجیب عنصر ہے، عمریں گزر جاتی ہیں انسان بچے سے بوڑھا ہو جاتا ہے مگر بیتا ہوا کل جو جب نہ تب پورے کا پورا سامنے آن کھڑا ہوتا ہے وہ اگر صرف یاد ہوتا تو احساس کے سارے انکھوے اس کے اِرد گرد پھوٹتے نہ رہتے۔

کیا یہ صرف یاد ہے؟ ابو، امی، بھیا سب، بس یاد کا حصہ ہیں؟ یاد جو موجود نہیں ہوتی، محسوس ہوتی ہے اور کیا صرف یہ موجود ہے؟ نائلہ نے کنکھیوں سے پھر رمیش کی طرف دیکھا۔

موجود کیا ہے اور محسوس کیا؟

نائلہ ایک عجیب سی حیرت کے گھیرے میں آئی: یہ جو میں ہوں، میں کیا ہوں؟ میں وجود ہوں یا احساس ہوں؟ اگر میرے سوچنے سے میرا وجود ہے تو یہ جو محسوس کرنے والا کاسہ سر ہے، اور اس ہڈی کے پیالے میں کن من کن من کرتا مغز ہے، اس کے ہونے میں میرا کتنا حصہ ہے، میری جو سوچیں ہیں، عادتیں ہیں، میرے اندر جو ڈھیر ساری نالائیں جب نہ تب اِدھر اُدھر سر مارتی رہتی ہیں، اِن میں کتنی میں ہوں؟ امی کتنی ہیں، ابو کتنے ہیں، وہ نطفہ جو میرا سبب ہے، وہ کوکھ میں جس کا نتیجہ ہوں، میں اور بھیا، ایک وجود کے دو ٹکڑے، یہ سب اب موجود نہیں ہیں؟ صرف ایک احساس کوئی وجود نہیں، کوئی چیز نہیں؟

اور یہ برس چھ مہینے کا ساتھی؟ جو میرے پہلو میں لیٹا ہے، اس کے میرے بیچ کا ہے کا ساجھا ہے؟

میری ماں جب میرے باپ کے پاس پہلی مرتبہ گئی ہوگی؟

اچانک اُسے پڑوس کے ایک بچے کے ختنے کا منظر یاد آیا، وہ اتنی بڑی ہوگئی تھی کہ اُسے وہ سب کچھ یاد تھا۔ یاد تھا کہ لوگوں نے لڑکیوں کو اندر کمرے میں جانے کا حکم دیا،لڑکیاں کمرے میں چلی گئیں، آٹھ دس لڑکیاں رہی ہوں گی، کچھ چھوٹی کچھ بڑی۔

کچھ دیر تو خموشی رہی، پھرلڑکیاں گپ کرنے لگیں۔

''بہت تکلیف ہوتی ہے۔'' کسی نے کہا۔

''ہاں،خون بھی بہت بہتا ہے۔'' دوسری نے بات آگے بڑھائی۔

''ارے،تو خون بہے گانہیں، آگے کا پورا چمڑا کاٹ دیا جاتا ہے۔''

''اِس سے اُس میں زیادہ طاقت آجاتی ہے۔''

اُسے اچانک گزری رات یاد آگئی اور ساتھ ہی ایک شدید قسم کی گھن کا احساس اُس پر حملہ آور ہوگیا۔

اُسے لگا پورے بدن پر، چھچھوندر چل رہی ہے،اچانک اُسے چھچھوندر کا منھ یاد آگیا،چھچھوندر اور سُور کا منھ۔

بڑی مشکل سے اُس نے اندر سے آنے والی اُبکائی پر قابو پایا۔

یہ کیا ہوا؟ کیوں ہوا؟ میں تو سہارے کی تلاش میں تھی۔ کیا یہ سہارا ہے؟ یا سہارے کا فریب ہے؟ مگر میں بھی تو اس عمل میں شامل تھی؟ مگراس میں کیا میری مرضی شامل تھی؟

اُس نے خود کو عجب دوبدھے میں گھرا پایا۔ میں یہ کہہ نہیں سکتی کہ میں نے انکار کیا مگر میں یہ مان نہیں سکتی، کہ اس میں میری خواہش شامل تھی۔ جو ہوا وہ کیا تھا؟ کیا وہ خواہش نہیں تھی؟ نہیں ہیجان کو خواہش کو نام نہیں دیا جاسکتا۔

سیلاب میں بہنے والے کا ارادہ شامل نہیں ہوتا۔

نائلہ حیران تھی کہ یہ کیسی بات اُس کے جی میں آئی۔

❖

بڑے شہروں کی اپنی رحمتیں ہیں اور اپنی زحمتیں۔ یہاں کوئی ایک دوسرے کو پوچھتا نہیں ہے،

مگر یہاں مواقع زیادہ ہیں،نوکریاں مل جاتی ہیں، البتہ یہ ضروری نہیں کہ آپ کی پسند کی نوکری آپ کو مل جائے۔ آپ اگر عقل منداور محنتی ہیں تو آپ بھوکے نہیں مریئے گا،اس کے باوجود آپ کی گھر کی زندگی کیسی گزرے گی،اس کی کوئی ضمانت نہیں۔

رمیش کے ساتھ بھی یہی ہوا، وہ گریجویٹ تھا اور خواہش مند تھا کہ کہیں ٹیچر یا سپروائزر کی نوکری مل جائے،مگر یہ ہونہ سکا، وہ سارا سارا دن چکراتا پھرا، باندرہ سے وی.ٹی.لوکل پکڑکر پنویل، کبھی بھنڈی بازار، دادر، اندھیری۔

ادھر نائلہ گھر میں تنہا سارا سارا دن ایک چھوٹی سی کھولی میں قید... بھائی کے بارے میں خبر نہیں تھی کہ وہ دہلی جاچکا، وہ جب یادوں کے جوار بھاٹا کا شکار ہوتی تو اپنے باپ کے کھلے کھلے گھر میں چکراتی پھرتی، پتہ نہیں چلتا تھا کہ یادیں اُسے پریشان کرتی تھیں یا اُس کا دل بہلاتی تھیں مگر دن سے زیادہ رات اُس کے لیے مصیبت ہوتی، وہ رمیش سے انکار بھی نہیں کرتی اور اپنے آپ سے اقرار بھی نہیں کرتی۔ پھر صبح ہوتی اور وہ اپنے کام میں جٹ جاتی۔ جو چوکی پہلے سے موجود تھی، وہ بس اتنی چوڑی تھی کہ دو آدمی سو رہتے،مگر کروٹ لینے میں دونوں کا ایک دوسرے سے ٹکرانا ضروری تھا، نائلہ تو شروع سے ایک کروٹ سونے کی عادی تھی، کھاٹ کے ایک کنارے کروٹ لے کر سوتی تو رات گزار دیتی، اس کے برعکس رمیش رات بھر گویا چھٹپٹا تا رہتا تھا، کبھی اُس کا ہاتھ نائلہ کے سینے پر چلا آتا کبھی وہ اپنا پیر نائلہ کے پیر پر چڑھا دیتا، کروٹ پر کروٹ بدلتا اور ہر بار نائلہ سے سٹ جاتا۔ نائلہ شروع سے تنہا بستر پر سونے کی عادی، بار باراُس کی نیند ٹوٹ جاتی، اسی آدھی سوئی آدھی جاگی کیفیت میں رات گزر جاتی، کبھی مؤذن کی اذاں سے نیند ٹوٹتی، کبھی مندروں کے شنکھ سے مگر اس کے بعد وہ بستر چھوڑ دیتی، اُسے اُٹھ جانا ہی بہتر لگتا۔

ٹوائلٹ مشترک تھا، اس لیے اس کی کوشش رہتی تھی کہ منھ اندھیرے فارغ ہولے، سورج نکلتے نکلتے عام طور پر مردوں کی لائن لگنے لگتی تھی۔

کھولی میں داخل ہوتے ہی وہ جھاڑو سنبھالتی، اُسے روز یاد آتا، ماں کہتی تھی، اِس لڑکی کو صفائی کا مالیخولیا ہے، وہ کھونٹ کھونٹ صفائی کرتی پھر رات کا برتن مانجھتی۔

دن پر دن گزرتے گئے اور ایک ہی احساس پورے وجود پر چھاتا چلا گیا کہ وہ ایک ایسی کشتی ہے جو بھنور میں گھر گئی ہے، یا ایسی بلّی جس نے دودھ کی آس میں ہانڈی میں گردن تو گھسا دی مگر

اس کشمکش میں دودھ بھی بہہ گیا اور گردن بھی پھنس گئی، یا صحرا کا کوئی مسافر جو پیاس سے بے قرار ہوکر آگے اور آگے بڑھتا چلا جارہا ہے مگر نہ پانی میسر نہ صحرا سے نجات!

اُس نے بے چین ہوکر اپنے اِردگرد نگاہ کی، وہ کہاں پھنس گئی؟ کیا یہی تھا اُس کا خواب؟ کہاں ماں باپ کا کھلا کھلا گھر، تین کمرے، دالان، آنگن، ڈرائنگ روم الگ، باورچی خانہ، غسل خانہ، باتھ روم سب الگ الگ، اور یہ؟ ایک کمرے میں ساری کائنات؟ کتنے لوگ اُس کے گھر آتے تھے، کیسی چہل پہل رہتی تھی، کالج بھی اُسے اپنے گھر جیسا لگتا، وہ چوکڑیاں بھرتی اور کوئی روکنے والا نہ تھا اور یہ؟ جہاں ٹھیک سے کروٹ نہیں بدلی جاسکتی۔

سب سے بڑی مصیبت تو لیٹرین ہے... لاحول ولاقوۃ!

اُسے لگا، قے ہوجائے گی۔

ہر رات اُسے لگتا، قے ہوجائے گی، ہر رات بدن پر چھچھوندر اور کنکھجورے رینگتے...

حل کیا ہے؟

بدن بھی عجب چیز ہے، کسی کے سامنے ایک مرتبہ کھل گیا تو پھر نجات کہاں ہے؟

وہ پہلی رات کی لذت یاد کرنا چاہتی تو باقی ڈھیر ساری راتوں کا گھناؤنا پن اُس پر حاوی ہوجاتا۔

مہینے سے اوپر گزر چکا تھا، مگر صورتِ حال میں بہتری کیا، بدلاؤ کی بھی کوئی سن گن نہیں محسوس ہورہی تھی۔ رمیش ہر روز صبح میں نکلتا اور رات گئے گھر میں داخل ہوتا، اور چہرے سے اتنا پریشان نظر آتا کہ نائلہ کچھ پوچھ بھی نہیں پاتی۔ دونوں کے درمیان صرف جسم باقی بچ گیا تھا۔

اتفاق سے ایک اتوار کو ناشتے کے بعد رمیش باہر نکلنے کے بجائے، آرام کرنے کے موڈ میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ نائلہ نے اُسے حیرت سے دیکھا۔

''آج جانا نہیں ہے کیا؟'' نائلہ زبردستی مسکراتی ہوئی اُسے کے پاس آئی۔

''کہاں جاؤں؟''

''روز کہاں جاتے ہو؟''

''یہی تو مجھے بھی پتہ نہیں چلتا کہ میں کہاں جاتا ہوں۔'' رمیش نے بہت تھکے لہجے میں کہا۔

''میں سمجھی نہیں، ٹھیک سے بتاؤ۔''

''اخبار سے نوکری کا وِگیاپن دیکھ کر آفس آفس چکراتا پھر رہا ہوں، کہیں نوکری کا ٹھور ٹھکانہ

نہیں، باندرہ، دادر، مدن پورہ، پنویل تک چلا گیا، مہینہ بیت رہا ہے پرنتو کوئی اُپائے نہیں سوجھ رہا ہے۔''

''کیوں؟ پڑھے لکھے ہو، گریجویٹ ہو، تمہی بتارہے تھے، اخبار میں اسامیاں نکلتی ہیں، اتنا بڑا شہر ہے، پھر سمسّیا کیا آرہی ہے؟''

''سب سے بڑی سمسّیا یہ ہے کہ ہڑبڑاہٹ میں اپنے ڈکومنٹس (تعلیمی اسناد) لے کر آیا نہیں، اب ہر جگہ پہلے تو ڈگری سرٹیفکیٹ مانگی جاتی ہے۔''

''ارے! ارے! یہ تو بڑی بھول ہوئی، میں بھی تو اپنا کوئی کاغذ لے کر نہیں آئی۔''

''اتنا ہی نہیں، اب تو ہر جگہ پہچان پتر مانگتے ہیں، چھوٹے شہروں میں آدمی اس کے سمبندھ میں اتنا چوکنّا نہیں رہتا، وہ بھی نہیں بنا۔''

''خدا کی پناہ! تب کیا ہوگا؟''

''بھگوان ہی کرپا کرے تو کوئی راستہ نکلے۔''

نائلہ نے چونک کر رمیش کو دیکھا...''خدا اور بھگوان؟''

''تو گویا یہ مسئلہ بھی ہے؟'' نائلہ نے ٹھنڈی سانس لے کر سوچا۔

وہ آہستہ سے اُٹھ کر کچن والے حصے کی طرف چلی گئی۔ چائے کی خواہش ہورہی تھی، اس نے گیس چولہا جلایا اور کیتلی چڑھادی۔ وہ وہیں پر کھڑی تھی اور اُس کی نگاہ شعلوں پر جمی ہوئی تھی۔ شعلوں میں اُسے کچھ جلتا نظر آیا۔

''کیا جل رہا ہے؟'' اس نے غور سے دیکھتے ہوئے سوچا۔

''کچھ نظر تو نہیں آرہا ہے، مگر کچھ جل رہا ہے ضرور!''

''نہیں... کچھ نہیں ہے؟''

''پھر یہ سڑانڈ کیسی ہے؟''

نائلہ نے اپنے چاروں طرف نگاہ کی... سب ٹھیک ہے... مگر کچھ جل رہا ہے۔''

اُسے رُفیدہ یاد آئی... کئی دن پہلے آئی تھی... پڑوس میں رہتی ہے، پہلے ہفتہ دو ہفتہ تو نائلہ گھر میں ہی قید رہی مگر لیٹرین اور پانی کے چکر میں تو باہر نکلنا ہی تھا، اُسی دوران کئی عورتوں سے ملاقات ہوئی، اُسے اندازہ ہوا کہ اُس کی جھونپڑپٹّی کے چاروں طرف صرف مسلمان ہی آباد ہیں، وہ یوں

بھی جلدی گھل مل جانے کی عادی نہیں تھی، سو اُس نے اپنے کام سے کام رکھا، فارغ ہوتی اور کمرے میں لوٹ آتی..مگر اسی بیچ ایک دن!

وہ پیٹ میں کچھ گڑبڑ محسوس کر رہی تھی، سویرے سویرے وہ لائن میں لگ گئی، مگر لائن لمبی تھی، وہ کیا کرتی، حالاں کہ پیٹ میں کچھ درد جیسی کیفیت بھی تھی اور وہ چاہ رہی تھی کہ وہ جلدی فارغ ہو لیتی..مگر کیسے؟ کون اپنی جگہ اُس کو راستہ دیتا، اِدھر معدے کا فساد اپنی جگہ...درد کا اثر چہرے پر بھی بار بار نمایاں ہو رہا تھا، پھر بھی لائن میں لگی عورتیں آپس کی گپ شپ میں مصروف رہیں۔

اُس پر کسی کی نگاہ ہی نہیں جا رہی تھی۔

اچانک ایک عورت اس کے پاس آئی اور آہستہ سے پوچھا: ''تم پہلے جانا چاہتی ہو؟''

''جی۔'' نائلہ آہستہ سے بولی۔

''آؤ۔'' یہ کہتی ہوئی وہ اُسے لے کر آگے بڑھی اور ایک عورت سے پہلے لائن میں لگی ایک لڑکی کی جگہ اُسے کھڑا کر دیا۔

بعد میں رفیدہ نے بتایا کہ وہ اُس کی بیٹی ہے۔

یہ اُن دونوں کی پہلی ملاقات تھی... پھر گھر کے باہر ہی دو تین مرتبہ اُس سے ملاقات ہوئی، دونوں نے ایک دوسرے کا پتہ پوچھا، مگر پہل رفیدہ نے کی۔ وہ کھانے کے بعد چوکی پر پیٹھ سیدھی کرنے کے لیے لیٹ گئی تھی، لگتا ہے ذرا اونگھ بھی آ گئی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی، وہ چونک کر اُٹھ بیٹھی۔ ''کون ہو سکتا ہے؟''

''کون ہے؟'' اُس نے چوکی پر بیٹھے بیٹھے زور سے پوچھا۔

''دروازہ کھولو، میں ہوں رفیدہ!''

''رفیدہ؟'' اس نے ذہن پر زور دیا تو اُسے یاد آ گیا۔

نائلہ نے دروازہ کھول دیا، رفیدہ اندر آ گئی۔

رفیدہ میانے قد کی پھر ہرے بدن کی گیہواں رنگ والی متناسب قد کاٹھی کی عورت تھی، جلد ہی نائلہ کو اندازہ ہو گیا کہ ملنے جلنے والی عورت ہے۔ باتوں باتوں میں پتہ چلا کہ وہ بھی پچیس تیس برس پہلے بہار سے یہاں آئی، اُس نے بہار سے آنے والی کئی عورتوں کے بارے میں بتایا۔

اُس دن وہ زیادہ دیر تک نہیں ٹھہری، مگر رفتہ رفتہ ہر دو تین دن پر آنے لگی۔ نائلہ کو بھی اُس کا

آنا بُرا نہیں لگتا، پردیس میں تو اپنے علاقے کے لوگوں کی اہمیت بڑھ ہی جاتی ہے۔ اسی آنے جانے کے درمیان نائلہ کو اُس نے دھراوی کے بارے میں تفصیل سے بتایا کہ یہاں لاکھوں لوگ رہتے ہیں اور یہ بھی کہ وہ لوگ جدھر ہیں اُدھر صرف مسلمان رہتے ہیں اور ہزاروں ہزار ہیں، غریبوں کے لیے ممبئی میں اس سے سستی جگہ کوئی نہیں ہے اور پھر یہ بھی کہ دھراوی ریلوے اسٹیشن کے بہت قریب ہے۔ یہاں مسجد بھی ہے، مدرسہ بھی ہے، میلاد بھی ہوتا ہے، بارہ وفات کا جلوس بھی نکلتا ہے اور بڑے پیر صاحب کی جھانکی بھی۔

مگر جو رفیدہ نے نہیں بتایا، وہ نائلہ نے آتے جاتے دیکھا۔ اُسے اندازہ ہوا کہ اس علاقے میں صرف بہار، بنگال، یو. پی. اور مدھیہ پردیش سے آنے والے ہی نہیں جمع ہیں، مہاراشٹر، گجرات اور جنوب کے دوسرے علاقوں کے لوگ بھی موجود ہیں، یہ بھی محسوس ہوا کہ یہاں شاید صرف غریبوں اور محنت کشوں کا ہی مجمع ہے۔ یہ لوگ پیدا ہو گئے ہیں اس لیے جئے جا رہے ہیں، مگر ان میں بہتر زندگی کا کوئی تصور نہیں ہے، یا للک نہیں ہے۔ یا پھر ان کی مثال پنجرے میں بند پرندے کی ہے جو اُڑنا چاہتا ہے تب بھی اُڑ نہیں سکتا۔ اس علاقے میں روڈ اور سڑک نام کی کوئی چیز نہیں تھی، بس گلیاں تھیں، کچھ بہت پتلی کچھ ذرا چوڑی، اُس کو اندازہ ہوا کہ کچھ چوڑی گلیوں کو پکّا کرنے کا بھی کام ہوا مگر اُن پکّی گلیوں اور سڑکوں کو بھی ایک مرتبہ بنا کر پھر چھوڑ دیا گیا۔ اُن پر بھاری گاڑیوں کے گزرنے اور علاقے میں بھاری بھاری لوہا لکّڑ آنے جانے پھر سارے مال کے پہلے سڑکوں پر ٹرکوں سے گرانے اور پھر بعد میں گودام میں لے جانے، پھر دوسری گلیوں سے پانی کا بہاؤ سہنے، اور پانی کے جماؤ کو برداشت کرنے کے سبب جو سڑکیں ایک مرتبہ پکّی بھی کی گئیں، وہ بھی ٹوٹ پھوٹ کر اپنی جگہ پر آ گئیں۔ البتہ اُن کے پکّی ہونے کا تھوڑا بہت نشان باقی رہ گیا۔ ایسے راستے جن کو ''پختہ راستہ'' کہا جا سکے اُن کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی تھی۔ پھر ہر گلی سڑک پر کھلی نالیاں، اُن نالیوں کے کنارے بچوں کی غلاظت سے فارغ ہونے کی نشانیاں صاف نظر آتی تھیں، شاید ہی کوئی راستہ ہوگا جو غلاظت سے مہکتا نہ ہو۔

چاروں طرف چھوٹے چھوٹے گھر اور اُن میں رہنے والوں کی بھیڑ، اندازہ ہوا کہ ایک گھر میں سات آٹھ آدمیوں سے کم نہیں رہتے، ایک مرتبہ رفیدہ نے باتوں باتوں میں بتایا تھا کہ رات میں جب سوتے ہیں تو ایک دوسرے کی پیٹھ ایک دوسرے سے اس طرح سٹی رہتی ہے کہ کروٹ لینا

مشکل ہو جاتا ہے۔

سڑکوں کی طرح گھروں کے اندر بھی گندگی رہتی، ٹوٹے پائپوں سے پانی رِستا رہتا اور باورچی خانہ ہر وقت بھیگا محسوس ہوتا، ساتھ ہی ایک مخصوص قسم کی بُو پورے گھر میں پھیلی رہتی۔ مرد تو باہر نہاتے ہی تھے، عورتیں اگر کسی طرح گھر میں نہانے کا انتظام کر بھی لیتی تھیں تو بھی کپڑے دھونے کے لیے اُن کو سڑک کے کنارے لگے ٹیپ پر آنا ہی پڑتا ہے۔

نائلہ نے محسوس کیا تھا، اُس کے گھر میں بھی ایک مخصوص قسم کی بساند پھیل رہی تھی۔

''تم نے رہنے کے لیے اتنا گندہ علاقہ کیوں چنا؟'' ایک رات نائلہ نے رمیش سے پوچھا۔

''بمبئی میں اتنی سستی جگہ اور کوئی نہیں ہے۔''

''بغل میں جو ہندو علاقہ ہے اس میں کیوں نہیں گئے؟''

''میں اپنا ہندو ہونا چھپا لوں گا، مگر مجھے لگا کہ تم اپنا مسلمان ہونا نہ چھپا سکو گی۔''

اُس رات پھر وہ بے چین ہو گئی، اورنگ آباد سے جب وہ چلی تھی تو اُس نے اپنا مذہب وہیں چھوڑ دیا تھا، مگر اُسے پتہ نہیں تھا کہ مذہب سانس کی طرح آدمی کے ساتھ ساتھ چلتا رہتا ہے، انسانی لاشعور میں یہ اتنا اندر اندر تک بیٹھ گیا ہے کہ آدمی شعوری طور پر اگر اس سے دامن جھٹک بھی لیتا ہے تو بھی مذہب کے ذرّات کنّیاں اُس کی اُٹھ بیٹھ، بول چال، لین دین، پسند ناپسند جب نہ تب سامنے والے کو چھو لیتی ہے۔

کئی مہینوں بعد نائلہ کو مذہب نے چھو لیا تھا۔

اِس چھونے کی بھی الگ الگ کیفیت ہوتی ہے، کبھی یہ خوشبو کی طرح چھوتا ہے، کبھی کرنٹ کی طرح جھٹکا دیتا ہے، کبھی یاد کی طرح آتا ہے، کبھی سانس کی طرح مسلسل جان کا حصہ بنا رہتا ہے اور آدمی کو خبر بھی نہیں ہوتی کہ وہ مذہب کی بوچھار میں پور پور بھیگا ہوا ہے، کبھی عقیدہ بن کے آتا ہے، کبھی تہذیب کے روپ میں ڈھلتا ہے، کبھی عشق کے اضطراب کی شکل اختیار کرتا ہے اور کبھی کسی ڈراؤنی چیز یا ڈراؤنے خواب کی طرح ہونکاریں بھرتا ہے۔

اس لمحے میں وہ بس ایک یاد تھا جس میں ہلکے ہلکے کرنٹ کی، جھٹکے والی کیفیت بھی تھی۔

''اچھا؟ میں مسلمان ہوں؟'' نائلہ کو یاد آیا۔

''تو یہ ہندو ہے؟'' اس کی ایک نگاہ رمیش کی طرف اُٹھی۔

مگر ہندو مسلمان کی تو شادی نہیں ہوتی؟

تو میری شادی کہاں ہوئی؟

تو پھر شادی کے بغیر ایک بستر پر سونا اور...؟

یاد آیا کہ ایسے رشتے کو زِنا کہتے ہیں پھر کسی کا کہا ہوا یاد آیا... زنا گناہ ہے، بڑا گناہ... اس نے یاد کرنا چاہا، اصل لفظ اُس نے کیا سنا تھا... بہت دنوں پہلے کا سنا ہوا جملہ... گناہ کبڑا... گناہِ کبرا... گناہِ کبارہ... ہاں ہاں، گناہِ کبیرہ...

لفظ جو بھی ہو مگر یہ گناہ ہے۔

اُسے پھر یاد آیا... ایک مرتبہ اُس نے باپ سے پوچھا تھا... گناہ کیا ہے؟ تو باپ نے بتایا تھا: ایسا کام جو چھپ کر کیا جائے، یا جس کام کے کرنے کا اعلان یا اقرار نہ کیا جا سکے، جس کام پر تم کو بعد میں کسی بھی وجہ سے پچھتاوے کا احساس ہو اور جس کا نتیجہ غلط نکلے، یا اُس نتیجے کو، تمہارا جی چاہے کہ چھپا لیا جائے، کسی کو دکھایا نہ جائے، کسی کو بتایا نہ جائے۔

میرے اور رمیش کے بیچ جو تعلق ہے، کیا میں یہ تعلق صحیح صحیح انداز میں سب کو بتا سکتی ہوں؟ کل کو اگر میں ماں بن گئی تو کیا بھیّا کو یا اورنگ آباد کے کسی آدمی کو یہ بتا سکتی ہوں کہ یہ رمیش کا بیٹا ہے۔

کیا رمیش اپنے گھر والوں کو یہ بتا سکے گا کہ یہ میرا اور نائلہ کا بیٹا ہے؟

اُس کو لگا، اس کے دماغ کی رگیں پھٹ جائیں گی۔

• • •

19

قیدار محمد انڈیا گیٹ سے چل تو پڑا تھا، مگر ابھی لال قلعہ نہیں پہنچ پایا تھا، بیچ بیچ میں اتنی کھنڈت پڑ جا رہی تھی مانو کسی دیو کو مانس گندھ مل گئی ہو اور وہ دیو سے بچنے کیلئے بھاگتا پھر رہا ہو، عبدالجبار سے کنارے ہو کر وہ جب بستی نظام الدین سے نکل رہا تھا تو محسوس ہوا کہ سارے میں گھمسان کا رَن پڑا ہوا ہے۔

اب یہاں سے اگر قیدار محمد کو کچھ دیر کے لیے کنارے بھی کر دیا جائے تب بھی کہانی تو بڑھتی ہی رہے گی، حالاں کہ قیدار محمد واقعی آگے کی ساری کتھا یاترا سے الگ ہو جائے گا یا لُپت ہو جائے گا یہ فیصلہ بھی شاید ابھی صحیح نہیں ہو سکتا مگر اتنا تو محسوس ہو رہا ہے کہ قیدار محمد اور اُس کے ساتھی، خواہ وہ کہیں بھی ہوں، اب پہل کرنے کی پوزیشن میں نہیں رہے۔

صورتِ حال بدل چکی ہے، یہ بدلاؤ تو اُسی وقت آیا جب ٹوبا ٹیک سنگھ مرا تھا مگر اِس کو نہ ٹوبا ٹیک سنگھ میں سمجھا سکا نہ شملہ میں نہ تاشقند میں، دماغوں، علاقوں، اور صورتِ حال کے بھیانک پن میں دن بہ دن اضافہ ہوتا گیا، یہاں تک کہ تاج کا حسن بھی اِس بھیانک پن اور ڈراؤنے پن کو کم نہ کر سکا۔

دیکھتے دیکھتے دیکھنے والوں کی آنکھیں پتھرا گئیں۔

دیکھنے والا کیسے بتائے اور کس کس کو بتائے کہ یہاں صبحیں اور شامیں کبھی حسین بھی ہوا کرتی تھیں۔

یہ زمانہ کب کا تھا اور کیسا تھا، یاد کرو تو آنسو نکل آتے ہیں، تب مسلمانوں میں صرف سنّی اور شیعہ ہوا کرتے تھے، نہ وہابی نہ سلفی، نہ اہل حدیث، ساری دنیا کے مسلمانوں پر ترکوں کی علامتی حکومت تھی۔ جمعہ کے خطبوں میں ترکوں کی تعریف ہوتی تھی اور مغلوں کو اپنی لولی لنگڑی حکومت کی آزادی تھی۔ پھر ۱۸۵۷ء ہوا، انگریزوں کی حکومت قائم ہوئی۔ سر سیّد نے لوگوں کو انگریز حکومت،

تہذیب اور زبان سے سمجھوتہ کرنے کا مشورہ دیا تو جواب میں مدرسہ دیو بند قائم ہوا۔

مگر اُس زمانے کے منظر میں آپس کے خون خرابے کے نشانات نہیں ملتے۔ سو برس پہلے تک سنّیوں اور شیعوں کے درمیان شادیاں ہوتی رہیں اور ایک صاحب مسمّی ابن تیمیہ کے بارے میں تحریری اتفاق یا تحریری اختلاف نظر آتا رہا، تب بھی عام آدمی سکون سے جیتا تھا، مذہب سب کا انفرادی معاملہ تھا، دین میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے، تمہارے لیے تمہارا دین ہمارے لیے ہمارا دین، اکبر اور اورنگ زیب سے دینارہ کے قاضی صاحب تک راجپوت بیٹیاں گھروں میں بہوئیں بن کر آتی رہیں اور حضرت نظام الدین اولیاء سے مولانا فخر الدین تک صوفیاء کی محفلوں میں ہندو شریک ہوتے رہے، کہیں کوئی خلفشار نہیں مچا۔

ہولی، دیوالی سے مسلمان اور محرم شب برأت سے ہندو الگ کیسے ہو گئے؟ دیو بند بریلی الگ کیسے ہو گئے؟

رام پور کے ایک عالم نے اپنی کتاب میں لکھا کہ اس کی ابتدا دیو بند نے کی۔

عرب میں ایک شخص ابن عبدالوہاب کیا پیدا ہوا کہ دنیا میں خلفشار مچ گیا۔

ہندوستان میں ابن عبدالوہاب کا بویا بیج بالآخر ۲۰۱۴ء سے ۲۰۱۷ء کے بیچ رنگ لایا۔

پھر دوسرا شخص اُسامہ بن لادن۔

پھر تیسرا شخص ابوبکر بغدادی۔

میرے طوفاں یم بہ یم!

خواجہ اہلِ فراق مسکراتا ہے، بھگاؤ ہم کو اپنے پاس سے، دیکھو ہم کیسے لنگھی مارتے ہیں؟ پانچ سو سالوں سے ان خانقاہ والوں نے جینا حرام کر دیا تھا، سالے سب کو ایک ساتھ لے کر بیٹھ جاتے تھے اور غٹرغوں... غٹرغوں... غٹرغوں...''

لمبا چوڑا شہر... کوئی جلسہ نہیں جلوس نہیں... شور ہنگامہ نہیں... مسجد میں بھی چپکے سے نماز پڑھتے اور گھر چلے آتے... کمبخت میلاد بھی کرتے تو ایسے کہ گھر سے باہر آواز نہیں جاتی... بس لے دے کے مجلس سماع کی آواز ذرا بلند ہوتی تو اس پر کسی کو کوئی اعتراض ہی نہیں ہوتا... اور کا ہے کو ہوتا۔

سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں۔

آج رنگ ہے ری ماں، رنگ ہے ری (ہے ری قوال ایسے پڑھتا کہ ہری سنائی دیتا)

کافرِ عشقم مسلمانی مرا در کار نیست

سارا ہندوستان مست ہو رہا تھا کہ بدمست ہو رہا تھا، پتہ نہیں مگر اختلاف کہیں نہیں تھا۔

''اختلاف کے لیے تصوف کی نہیں مذہب کی ضرورت پڑتی ہے۔'' خواجہ اہلِ فراق نے سوچا۔

سلطان صلاح الدین ایوبی کی صلیبی جنگ، اورنگ زیب کا معرکہ قتلِ برادران، ۱۸۵۷ء میں لگائے جانے والے نعرے (اللہ اکبر، ہر ہر مہادیو)، آنند مٹھ، فرائضی تحریک، کتاب التوحید، تقویۃ الایمان... بڑی مشکل ہے، خواجہ اہلِ فراق پھر سوچتا ہے، مذہب کے شیرے کے بغیر مکھی آتی ہی نہیں!

خواجہ اہلِ فراق کیا کرتا... مجبوراً شیرہ لگانا پڑا۔

شیرہ لگا تو مکھیاں بھی آ ہی گئیں۔

اب چاروں طرف مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔

اور قیدار محمد انڈیا گیٹ سے لال قلعہ کے لیے چلا تھا کہ عبدالجبار اُسے اچک کر بستی نظام الدین لیے چلا گیا، وہاں سے نکلا تو بنگلے والی مسجد کے چکرویو میں گھر گیا، اُس کی جان پہچان والوں میں سے کچھ وہاں سے دیو بند چلے گئے اور پھر یہاں وہاں... جانے کہاں کہاں...''

قیدار محمد دہلی میں تھا، انڈیا گیٹ اور بستی نظام الدین سے آگے بڑھ کر لال قلعہ جانا چاہتا تھا، مگر اُسے احساس ہوا کہ راہ میں اڑچن بہت ہے...

وہ اندر اندر ہنسا... ایک مصرعہ یاد آ گیا تھا ع

تمناؤں میں اُلجھایا گیا ہوں

قیدار محمد کی تمنائیں جوان تھیں، مگر اُسے اپنی اوقات یاد آ گئی۔ ابھی تو رہنے کا ایک مستقل ٹھکانہ بھی نہیں بن سکا ہے، داخلے کا مسئلہ حل نہیں ہوا تھا، یہاں آ کر معلوم ہوا کہ کالجوں میں داخلے مکمل ہو چکے، اب جو کچھ بھی ہو گا، اگلے سال ہی ہو گا۔

اورنگ آباد جا کر بھی کیا کرتا؟ وہاں کون انتظار کر رہا ہو گا۔

پتہ نہیں نائلہ کہاں ہے؟ کمینی... پہلی مرتبہ اُس سے الجھن بلکہ نفرت کا احساس ہوا۔

مکھیوں کی بھنبھناہٹ بہت بڑھ گئی تھی۔

حکومت کیا بدلی، پنڈورا بکس کا ڈھکن ہٹ گیا، طرح طرح کی بلائیں حملہ آور ہو گئی تھیں،

دوستوں کی محفل میں سبھی کی یہ متفقہ رائے تھی۔

قیدار محمد کے پاس دوستوں کے علاوہ اور تھا ہی کیا؟

یہ سب پرانے دوست تھے، ڈیڑھ دو سال پہلے جب وہ دہلی میں رہا کرتا تھا اور انجینئرنگ میں داخلے کے لیے کوچنگ کر رہا تھا... تب کی یاری۔

اس بیچ کچھ انجینئر بنے، کچھ گھر لوٹ گئے ...دوستوں کی منڈلی میں چار پانچ ہی بچ گئے تھے۔

ٹوپو مجمدار، دلبیر سنگھ، روشنی سہائے، مزمل حسین خاں اور روشن بہاری۔

روشن بہاری تو پورا بہاری تھا، ہوم سِک نِس (گھر کی بیماری) کا مریض، زیادہ گھر رہتا، اپنے گاؤں میں، کبھی کبھی دہلی چلا آتا، باقی بچے چار، اِن چاروں کا بھی کوئی ایک ٹھکانہ نہیں تھا، چاروں دہلی میں تو رہتے تھے مگر چار چھور پر، گاہے گاہے دن میں پہلے سے طے کئے کسی ٹھکانے پر اکٹھا ہوتے پھر شام ہوتے ہوتے سب پرند اُڑ جاتے۔

قیدار محمد دہلی آ گیا تھا، مگر سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ کیا کرے، اس سال تو داخلہ نہیں ہو سکا، اب اگلے سال کا انتظار کرنا تھا اور اگلے سال بھی کیا ہوگا، یہ کہنا مشکل تھا، جے. این. یو. میں تو داخلے کا سوال ہی نہیں تھا، اُسے تو انڈر گریجویٹ میں داخلہ لینا تھا۔ بنسی دھر انکل سے بھی اب رابطہ نہیں ہو پا رہا تھا کہ دہلی یونیورسٹی میں داخلے کی کوئی صورت نکلتی، اب لے دے کے بچ رہا تھا... جامعہ ملیہ اسلامیہ!

قیدار نے ارادہ کیا کہ جامعہ کے آس پاس ہی رہا جائے تا کہ جامعہ کا چکر لگانے میں آسانی ہو۔

چکر لگاتے لگاتے بالآخر اُسے جامعہ اور جوہری فارم کے بیچ ایک لاج میں جگہ مل گئی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ملک پر بھارتیہ جنتا پارٹی والوں کی حکومت ہو چکی تھی۔

اُس لاج میں کئی لڑکے رہتے تھے، ان میں دو جامعہ ملیہ کے طالب علم تھے، ایک اخبار کے دفتر میں ملازم تھا اور ایک کسی سیاسی پارٹی کے آفس میں آفس اسسٹنٹ تھا۔

قیدار کو یہ بات اچھی لگی کہ دو لڑکے جامعہ کا بھی حصہ ہیں۔ آہستہ آہستہ اُن سے ربط وضبط بڑھتا گیا اور اُن سبھوں کے ساتھ وہ جامعہ کے ایک پروفیسر صاحب کے یہاں بھی آنے جانے لگا، زندگی اب کچھ ڈھرے پر آتی محسوس ہو رہی تھی۔

جب نہ تب پچھلے دوستوں سے بھی ملاقات ہوتی رہتی۔ سب دوست کبھی کسی پارک میں، کبھی جمنا کے کنارے، کبھی انڈیا گیٹ پر تو کبھی ہمایوں کا مقبرہ یا جے. این. یو.۔

❖

جے. این. یو. میں روشنی سہائے رہتی تھی اور بہار کا ایک لڑکا عرفان بھی۔

قیدار کے اورنگ آباد لوٹنے اور پھر دہلی واپس آنے کے دوران کچھ دوستوں نے انجینئرنگ کا مقابلہ جاتی امتحان پاس کر کے انجینئرنگ میں داخلہ لے لیا تھا اور کچھ دوست ابھی اُس تگ و دو میں لگے ہوئے تھے۔ روشنی سہائے انجینئر تو نہ بن سکی، بی.اے. کر کے اِسی سال جے. این. یو. میں داخلہ لیا تھا۔ ایم.اے. کر رہی تھی۔ اچھی اُردو بولتی تھی اور آسانی سے سمجھتی تھی۔ شاید قیدار کا اُس میں دلچسپی کا پہلا سبب یہی تھا، کائستھوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ عقیدے کے لحاظ سے ہندو ہوتے ہیں اور تہذیب کے لحاظ سے مسلمان۔ باقی دوست تو کچھ زیادہ فاصلے پر رہتے تھے، مگر روشنی تک پہنچنا نسبتاً آسان تھا اور جے. این. یو. میں لڑکے لڑکیوں کے ملنے جلنے پر کوئی پابندی بھی نہیں تھی، وہ اطمینان سے روشنی کے کسی دوست کمرے میں گھنٹوں گھنٹوں بیٹھا رہتا اور گپیں کیا کرتا۔

اُس دن قیدار جے. این. یو. پہنچا تو ٹوپو مجمدار اور دلبیر سنگھ پہلے سے عرفان کے کمرے میں براجمان تھے۔

''آؤ بھائی، آؤ، تم بھی آ جاؤ۔'' ٹوپو مجمدار نے ہنستے ہوئے اُس کا استقبال کیا۔

''روشنی نہیں آئی ہے؟'' قیدار نے کمرے میں بیٹھتے ہوئے چاروں طرف دیکھا۔

''ارے ہماری طرح وہ بیکار کمپنی ہے؟ کلاس کرنے گئی ہے۔'' دلبیر نے خبر دی۔

قیدار بستر پر ڈہہ سا گیا، پتہ نہیں موسم کا اثر تھا یا کیا؟ اُس نے کمرے کی کھڑکی سے باہر دیکھا۔

''پت جھڑ کی رُت ہے۔'' وہ بدبدایا۔

''اس موسم میں درخت کے پرانے پتّے جھڑ جاتے ہیں۔'' دلبیر نے بات آگے بڑھائی۔

''اور پھر نئے پتّے نکل بھی تو آتے ہیں۔'' ٹوپو نے لقمہ دیا۔

''پتوں کے ساتھ پھل بھی تو گرتے ہیں۔'' پتہ نہیں کس نے کہا۔

''یعنی حاصل اور لاحاصل دونوں ساتھ ساتھ۔'' قیدار پھر بدبدایا۔

''حاصل تو سمجھا، لاحاصل کیا؟'' ٹوپو نے سوال کیا۔

"جو ملا اور جو نہ ملے اور اگر ملے بھی تو بے فائدہ۔"

"کیا ملا بھیّا اور کیا نہیں ملا؟" دلبیر نے بڑی اُکتاہٹ سے پوچھا۔

"یہی تو سمجھ میں نہیں آتا۔" ٹوپو زہرخند ہنسی ہنسا۔ "سالا ہم لوگ پچھلے پانچ سالوں سے کیا کر رہے ہیں اور اِس جان جوکھم نے کیا دیا ہم کو؟"

"نہیں ملا تو شاید ہمارا تمہارا دوش ہو۔" قیدار آہستہ سے بولا۔

"ہاں بھیا! ہمارا ہی دوش ہے۔" ٹوپو جھلّا کر بولا۔ "دوش ہی تو ہے، ہم نے سپنا دیکھا کہ اچھے دن آنے والے ہیں، بازار میں سپنا بک رہا تھا...اچھے دن آنے والے ہیں...سب کا ساتھ سب کی ترقی... ہر غریب کا بینک کھاتا...کھاتے میں پیسہ... ہزاروں لاکھوں...سوچو تو کِتّا اچھا لگتا ہے...ٹوپو مسکرایا، پھر ہنسا، پھر قہقہہ لگایا، پھر ہذیانی انداز میں چیخا..."چوتیا بنا دیا سالوں نے...کیسی ہاہاکار مچا کے رکھ دی ہے، سام دام ڈنڈ بھید، کچھ چھوڑا ہے سالوں نے؟"

"چانکیہ کی اصل اولاد یہی سب ہیں۔" قیدار ہنسا۔

"عام آدمی کی جان کے ساتھ ایسا کھلواڑ اس سے پہلے نہیں ہوا۔" دلبیر سنگھ کہنے لگا۔ پہلے والے ایک سمئے میں ایک چال چلتے تھے، اُس میں کبھی کورو جیتتے تھے کبھی پانڈو مگر اَب تو شکنی ماما چوطرفہ مار کر رہا ہے... گھر واپسی، لو جہاد، انڈین مجاہدین، گئو رکچھا... دیش بھگتی...فرضی دشمن... سنسکرتی، بھاشا، گیان وِگیان...ریپ اور گینگ ریپ کا گھناؤنا اور لگاتار چلتے رہنے والا ایسا بھیانک پن، جس پر ہائے ہائے کرو تو بھی اُن کا ووٹ بڑھے واہ واہ تب تو بلّے بلّے ہے ہی۔"

"پت جھڑ ہے بھیا، پت جھڑ میں پتّے تو گرتے ہی ہیں۔" قیدار بولا۔

"مگر پتّے گرتے ہیں تو پھل بھی تو ملتا ہے، پھل کہاں ہے؟" ٹوپو نے سوال کیا۔

"پھل جن کی گودی میں گرنا ہے، ان کی گودی میں گر رہا ہے۔" دلبیر بولا۔

"جو ہمارے ساتھ نہیں وہ ہمارے خلاف ہے، جو ہمارے خلاف ہے وہ دیش وِرودھی ہے، دیش وِرودھی کی گودی میں پھل کیوں گرے؟"

ٹوپو کی بات کا کسی نے جواب نہیں دیا، حالاں کہ جواب سب کے پاس تھا۔

قیدار کو حبس کا احساس ہوا، بات کرنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا، باہر سے نعروں کی آواز آ رہی تھی۔

اکھل بھارتیہ وِدیارتھی پریشد والے اور اسٹوڈنٹ فیڈریشن والے اپنی اپنی نعرہ بازیوں میں مصروف تھے۔ پریشانی یہ تھی کہ جے.این.یو. کی اسٹوڈنٹ یونین پر پت جھڑ نہیں آپا رہی تھی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی گنگا جمنی شناخت کا نشان تھی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ مشترکہ ہندوستانی قومیت کے احساس کو زندہ رکھنے اور باقی رکھنے کا اشارہ تھا اور جے.این.یو. روشن خیال بلکہ بائیں بازو کے خیالات رکھنے والوں کا مرکز تھا، اور یہ بات لوگوں کے حلق سے اُتر نہیں رہی تھی۔ بیسویں صدی کے اواخر کے آس پاس تک تو جماعتِ اسلامی اور تبلیغی جماعت والے بھی کچھ "محنت" کرتے دکھائی دیے، مگر شاید اُن لوگوں کو جلد ہی احساس ہو گیا کہ ہتھیلی پر سرسوں نہیں جم سکتی لیکن یہ جو بلّی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹ گیا تھا، اس سہانی گھڑی کا بلّی فائدہ اُٹھانا چاہ رہی تھی۔ میڈیا کیا بکا کہ سب کا پو بارہ ہو گیا۔ ٹوپی تلک والے جتنے لفوے تھے، سوشل میڈیا پر ہفوات بکنے لگے۔ ٹی.وی. بریلی کا بازار ہو گیا تھا جہاں کس کا جھمکا گر جائے، نہیں کہا جا سکتا۔

قیدار نے گھڑی دیکھی، شام کی آمد آمد تھی۔

اُس کے من میں عجیب سی اُداسی نے سر اُٹھایا، وہ کہاں جائے، پناہ کہاں ہے؟ اُسے اُس کا باپ اسمٰعیل یاد آیا، اُس نے قیدار کو مالیگاؤں، بھیونڈی اور ممبئی کے فسادات کے بارے میں بتایا تھا۔ ماں نے اسمٰعیل کی پہلی بیوی اور اُس سے ہونے والے بچوں کی شہادت کی خبر بھی دی تھی۔ پھر اُس کا باپ بہار چلا آیا مگر اچانک موت باپ کے حصے میں بھی تھی۔ پھر حکومت کا بدلاؤ، مگر حکومتیں تو اِس سے پہلے بھی بدلتی رہتی تھیں، ریاستوں میں بھی اور مرکز میں بھی لیکن اس مرتبہ صرف حکومت کا بدلاؤ نہیں محسوس ہو رہا تھا، کچھ اور تھا جس کی آہٹ بھی سنائی دے رہی تھی، اور یہ بھی محسوس ہو رہا تھا کہ کچھ اَن دیکھا سا ہے جو آہستہ آہستہ کہیں پر ہونے جیسا روپ بھر رہا ہے...کیا ہے؟ کیا ہے جس کی پہچان مشکل لگ رہی ہے۔

اُسے لگا کھڑکی پہ کچھ چھٹپٹاہٹ ہے۔

وہ ہڑبڑا کر کھڑکی کی طرف دوڑا۔

باہر ایک بے چین مجمع نعرے بلند کر رہا تھا۔

اُسی وقت روشنی داخل ہوئی۔

’’تم لوگ چلے جاؤ۔‘‘ اِن تینوں کو دیکھ کر اُس کا پہلا تاثر یہی تھا۔

’’کیوں؟ کیا بات ہے؟‘‘ ٹوپو نے حیرت سے پوچھا۔

’’ٹکراؤ کی صورت بنتی جا رہی ہے۔ تم لوگ یہاں کا حصہ نہیں ہو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم لوگ نشانے پر آ جاؤ۔‘‘

• • •

20

گلی میں پٹاخہ چھوٹنے کی آواز آئی، تو نائلہ چونکی۔

’’لگتا ہے، کہیں شادی ہے۔‘‘ اُس کے جی میں خیال آیا۔

مگر کچھ دیر بعد محسوس ہوا کہ پٹاخہ کسی ایک طرف نہیں چھوٹ رہا ہے، چاروں طرف سے پٹاخہ چھوٹنے کی آواز آ رہی تھی۔

پھر یہ خیال بھی آیا کہ شادی کے جس گھر میں پٹاخے چھوٹتے ہیں، وہاں تو باجا بھی بجتا ہے۔

نائلہ کچھ دیر تو بیٹھی رہی، پھر دروازہ کھول کر دیکھا، گھروں میں چراغ جل رہے تھے۔

’’لگتا ہے، شب برأت ہے۔‘‘ اچانک اُس کے ذہن میں بات آئی۔

اُس نے پھر دروازہ کھول کے دیکھا۔ کچھ لوگ ٹوپی پہنے اِدھر اُدھر آ جا رہے تھے۔

وہ عجب قسم کی کیفیت کا شکار ہوئی، پتہ نہیں خوشی کہ غم، مگر اس کے دل کی کیفیت روز کی کیفیت سے کچھ الگ ضرور تھی، اُسے یاد آیا: آج تو اماں ناشتے کے بعد سے مشغول ہو جاتی تھیں، چنے، سوجی، میدے اور گڑ کا حلوہ بناتیں، شام میں مٹّی کے دیے میں تیل ڈالتیں، پھر اس میں روئی کی بتّی رکھ کر دِیا روشن کرتیں، دونوں بھائی بہن ہر کمرے دالان اور دروازے پر چراغ رکھتے۔ ابا فاتحہ کرتے، مغرب بعد ابا فاتحہ پڑھنے شہر کے قبرستانوں میں جاتے، رات میں گھر یا مسجد میں عبادت کرتے، اماں بھی نماز پڑھتیں، ہم بھائی بہن پھلجھڑی، انار، چٹپٹیا چھوڑتے، اماں کئی گھروں میں حصہ بھجواتیں، دوسرے گھروں سے بھی حلوہ حصے میں آتا، فقیر آواز لگاتے، اماں اُن مانگنے والوں کو حلوہ روٹی دیتیں، دوپہر سے رات تک خوب چہل پہل رہتی۔ ابا فاتحہ پڑھ کے آتے تو ساتھ میں اُن کے کچھ دوست بھی رہتے، اماں ہم لوگوں سے باہر بیٹھک میں حلوہ، پھر بعد میں چائے بھجواتیں، پھر ابا اُن لوگوں کے ساتھ مسجد چلے جاتے اور دیر رات گئے واپس آتے۔ اماں دوسرے دن روزہ رکھتیں، ابا کبھی روزہ رکھتے، کبھی نہیں رکھتے۔ اُن لوگوں کے روزہ رکھنے سے دوسرے

دن ہم لوگوں کی چاندی ہوجاتی، ہم لوگ جی بھر کے حلوہ کھاتے، شام میں افطار کے وقت گھنگھنی پھلکی الگ سے۔ سب یاد کرتے، اب اگلا مہینہ رمضان کا ہے۔

دروازے پر دستک ہوئی تو وہ ہڑ بڑا کر اُٹھی، جلدی سے آنکھیں پونچھیں جو آنسوؤں سے تر تھیں، دروازہ کھولا، دروازے پر رمیش تھا۔

''کیا کر رہی تھیں؟ اتنی دیر کیوں لگی؟'' رمیش کا لہجہ اکھڑا اکھڑا تھا۔

''آں... ہاں... نہیں، کچھ نہیں... ذرا آنکھ لگ گئی تھی۔''

نائلہ کو عجب سا لگا۔ ''وہ رمیش سے جھوٹ کیوں بولی؟''

رمیش آج پھر پی کر آیا تھا، اس نے شروع میں ایک دوبار اعتراض بھی کیا، مگر رمیش جھلاّ گیا۔

''پی لیا تو کیا ہوا؟ سب تو پیتے ہیں۔''

نائلہ کیا جواب دیتی، چپ رہی۔ رمیش کے یہاں غلطی کا کوئی احساس تھا ہی نہیں۔

رمیش کھانا کھا کر سو گیا مگر نائلہ جاگتی رہی۔

من میں عجیب سی بے چینی انگر گئی تھی، کچھ عجب سا احساس، کیا ہو رہا ہے؟ جو ہوا وہ صحیح تھا؟ کیا اِس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوسکتا تھا، پھر اُس کی نگاہ رمیش کی طرف گئی۔ یہ میرے پاس کیوں ہے؟ میں اس کے پاس کیوں ہوں؟ کیا ایک لڑکی کی تقدیر یہی ہے، دو وقت کا کھانا اور رات میں مرد کی تسکین کا ذریعہ، جانور بھی تو یہی کرتے ہیں، کیا میں آدمی نہیں ہوں۔

وہ بستر پر پڑی رہی، اُس کی آنکھیں کھلی رہیں، وہ ایک ٹک چھت کی طرف دیکھتی رہی، پھر نہ جانے کیا ہوا، وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اُس کا جی چاہا کہ نماز پڑھے، مگر کہاں پڑھے؟ کون جگہ پاک ہے؟ کسی کونے میں جانماز بچھالے، مگر جانماز تو وہ لائی ہی نہیں، بڑی بے بسی کا احساس ہوا، کچھ دیر اُسی حال میں چپ بیٹھی رہی، پھر دوپٹہ سر پر رکھا، اُسے یاد آیا اُسے چاروں قل اور الحمد یاد ہے، وہ پڑھنے لگی، بار بار پڑھتی رہی، اچھا لگ رہا تھا، پھر آواز سنائی دی۔

''کیا کر رہی ہے؟'' رمیش کی آواز نشے سے بوجھل تھی۔

اُسے جواب دینے میں ذرا دیر لگی تو رمیش کی جھلائی آواز سنائی دی۔ ''...اے؟'' اور اتنا کہتے کہتے اُس نے نائلہ کو کھینچ کر لٹالیا اور اُس پر چڑھ بیٹھا۔

''آج شب برأت کی رات ہے۔ آج رہنے دو۔'' وہ روہانسی آواز میں بولی۔

رمیش زور سے ہنسا۔ ''سالی! مسلمانی چڑھ گئی ہے۔'' تب تک وہ اُس کا ازار بند کھول چکا تھا۔

دوسرے دن رمیش نے عجب حرکت کی، شام میں لوٹا تو کسی دیوتا کی ایک مورتی ساتھ لایا اور کمرے میں ایسی جگہ رکھ دی جہاں سے وہ سب کو نظر آتی رہے۔ نائلہ نے خالی خالی نگاہوں سے اُسے دیکھا، وہ اور کیا کر سکتی تھی؟ پچھلے پانچ چھ ماہ میں رمیش آہستہ آہستہ ساتھی اور دوست سے زیادہ غالب مرد کا روپ دھارن کر چکا تھا، غالباً اُسے اندازہ ہو گیا تھا کہ نائلہ پنجرے میں بند چڑیا ہے، لاکھ پھڑ پھڑائے، جائے گی کہاں؟

نائلہ اپنی اوقات سمجھ رہی تھی، اُس نے تو اپنی لنکا میں خود آگ لگائی تھی، اب وہ کس سے اپنے اِردگرد سلگ رہی جہنم کا تذکرہ کرے، اُس نے اچانک ہی تپش سی محسوس کی، حالاں کہ یہ پندرہ اکتوبر کے بعد کا مہینہ تھا مگر اُس کو لگا کہ وہ کسی بھری دوپہر کے مقابل ہے۔ اُس نے پنکھا چالو کیا اور ریگولیٹر کو ۵ کے نقطے (پوائنٹ) پر لے آئی، پھر کچھ ہی دیر بعد چونکی، اُس کے مساموں نے ٹھنڈک کا احساس کیا اور اُس نے جانا کہ یہ آگ باہر نہیں لگی ہے۔

''اگر میں اِس سے الگ ہو جاؤں؟'' اتنا سوچتے سوچتے اس پر لرزہ سا طاری ہو گیا، اُسے ماں یاد آئی جس نے ایک مرتبہ باتوں باتوں میں کہا تھا، ''شریف لڑکیوں کی ڈولی میکے سے اُٹھتی ہے اور سسرال سے ڈولا اُٹھتا ہے۔''

اُس کا جی چاہا وہ قہقہہ مار کر ہنسے، ہذیانی قہقہہ... ''اماں! تمہاری بیٹی کی جب میکے سے ڈولی ہی نہیں اُٹھی تو سسرال سے ڈولا کیوں اُٹھے؟ اماں! تم نے مجھے اُبٹن نہیں لگایا، کسی سکھی سہیلی بھابھی نے مہندی نہیں لگائی... اماں! میرے باوا نے تو میرا دو بول بھی نہیں پڑھوایا، اب وہ جو میرا بیرن بھیا ہوا کرتا ہے اُس کا انتظار کس برتے پر کروں۔''

وہ دونوں گھٹنوں کے بیچ سر دیئے بیٹھی تھی، رو رہی تھی اور اُس کا پورا جسم ہچکولے کھا رہا تھا...

میں پاپن ایسی جلی نہ کوئلہ بھیو نہ راکھ۔

جانے کب کا سنا، کسی دوہے کا ایک ٹکڑا یاد آ گیا تھا۔

''مجھے اس سے الگ ہو جانا چاہیے۔'' اس احساس نے پھر کچوکے لگائے۔

''مگر میں جاؤں گی کہاں؟''

یہ سوال نہیں، ایک تپتا جلتا صحرا تھا جس پہ وہ چل پڑی تھی، سر پہ لال بھبھوکا سورج آگ برسا

رہا تھا اور پیروں کے نیچے جلتی تپتی ریت تھی اور چلتے رہنا اُس کا مقدر تھا، وہ اس صحرا کی مسافر آپ ہی آپ تو بنی تھی۔

''کیا اَب میں اورنگ آباد لوٹ سکتی ہوں؟'' نائلہ نے سوچا، ''کیا بھیا مجھے اپنائے گا؟''

اور بھیا کہاں ہے، اس کی کیا خبر؟ میرے محلے والوں کو میرے بھاگنے کی خبر نہ ملی ہوگی؟ ایک ہندو کے ساتھ بھاگی لڑکی کے ساتھ وہ کیا سلوک کریں گے؟ بھیا اگر مجھے اپنا بھی لے تو کیا میں اُس کے لیے ایک نئی مصیبت کا سبب نہ بنوں گی؟ اگر نہ لوٹوں تو کیا کروں؟ یہاں سے چلی جاؤں؟ کہاں؟ میں تو رمیش پر اتنا منحصر ہوگئی کہ کبھی دروازے اور محلے کے باہر بھی تنہا پاؤں نہیں نکالا، یہ شہر، آدمیوں کا جنگل جہاں سنتے ہیں کہ کسی علاقے میں رنڈیاں بھی پچاسوں ہزار سے زیادہ رہتی ہیں؟ اور وہ سمندر کنارے بدمستی کرتی عورتیں اور وہ فلم والیاں، یا پھر اِردگرد کی جاہل عورتیں۔

میں اِن میں سے کس کا حصہ بن کر تنہا جینے کی آرزو کرسکتی ہوں؟

میں اس کے بغیر ممبئی میں تنہا کیسے جئوں گی؟

اس سوال کا اُس کے پاس کوئی جواب نہ تھا، مگر آگ تو لگ چکی تھی اور وہ اُس کی تپش محسوس کر رہی تھی، ہر صبح جب اُس کی نیند ٹوٹتی اور سامنے نگاہ مورتی پر پڑتی تو لگتا کہ وہ اپنے کمرے میں نہیں ہے، پھر ایک دن تو غضب ہی ہوگیا، رفیدہ آ گئی، وہ اِدھر کچھ ایسی بولائی بولائی رہنے لگی تھی کہ اُسے خیال ہی نہیں آیا کہ اور کوئی بھی نہیں تو کم از کم رفیدہ تو آ ہی سکتی ہے، چوں کہ اُس نے رمیش سے رفیدہ کا ذکر نہیں کیا تھا اس لیے رمیش سے یہ بھی نہ کہہ سکی کہ اس کو ہٹا دو۔

بلکہ سچ یہ ہے کہ وہ رمیش سے یہ کہنے کی اپنے اندر ہمت ہی نہیں پا رہی تھی۔

تو رُفیدہ آ گئی اور آتے ہی اُس کی نظر مورتی پر پڑی۔

''ارے یہ کیا ہے؟'' رفیدہ ذرا زور سے اور ایسے لہجے میں بولی جیسے وہ اچنبھے میں پڑ گئی ہو۔

''یہ... یہ.... ایسے ہی... یونہی، بس یونہی۔'' نائلہ ہکلانے لگی۔

''ارے یونہی مورتی رکھ لوگی... کل کو یونہی پوجا کرنے لگنا۔'' رفیدہ ذرا غصہ میں بولی۔

''میں نہیں لائی، رمیش لایا ہے۔'' بوکھلاہٹ میں نائلہ کے منھ سے نکل گیا۔

''رمیش؟ کون رمیش؟''

''میرا...'' جملہ پورا کرنے سے پہلے وہ پھر ہکلا گئی... ''نہیں نہیں... میرا نہیں ان کا دوست۔''

''ایسی دوستی تو کبھی نہیں دیکھی کہ کوئی دوست کے لیے مورتی گھر میں لگا لے۔''

نائلہ چپ چاپ سنتی رہی، جواب کیا تھا اس کے پاس؟

''تمہارے شوہر کا نام کیا ہے؟''

نائلہ پھر چپ رہی، مگر ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اندر اندر کسی کشمکش سے گزر رہی ہے۔

رفیدہ اُس کو ایک ٹک دیکھتی رہی، اور نائلہ چپ بیٹھی رہی، پھر جیسے اندر اندر کسی نتیجے پر پہنچ گئی، وہ آہستہ سے اُٹھی، جدھر ٹیپ لگا ہوا تھا، اُدھر گئی، منھ پر چھپاکے مارے، گُمچھے سے منہ پونچھا، پھر دو گلاس میں پانی لے کر آئی، ایک رفیدہ کی طرف بڑھایا، ''لو پی لو۔''

رفیدہ پانی پی چکی تو اُس سے گلاس لیتے ہوئے پوچھا: ''تم کو تھوڑی فرصت ہے، چائے پیو گی؟''

''چائے کو کنارے کرو، ہم کو صحیح بات بتاؤ۔''

''ذرا دم لینے دو، چلو پہلے چائے پی لی جائے۔''

''یہی سہی، جیسا تم چاہو۔''

نائلہ اُٹھ کر کچن والے حصے کی طرف چلی گئی۔

اُس نے فرائی پین میں پانی ڈال کر گیس کے چولہے پر کھولنے کے لیے چڑھا دیا، چند ثانیہ بعد پانی میں سنسناہٹ شروع ہوئی، اُس کا اپنا جی بھی سنسنا رہا تھا، آج وہ رنگے ہاتھوں پکڑی گئی تھی، اُس کا مسلمان ہونا یہاں کوئی مسئلہ نہیں تھا، مسئلہ رمیش کا تھا اور اُسی نے اِس راز کو کھول دیا، کیا ضرورت تھی کمبخت کو مورتی ٹانگنے کی؟

''یہ زندگی بھی عجیب کُتّی چیز ہے۔'' اس نے وہیں سے رفیدہ کی طرف منھ اُٹھا کر کہا۔

''جانتی ہیں رفیدہ جی۔ جب میں پڑھتی تھی تو بہت چھوٹے چھوٹے سپنے دیکھتی تھی، اچھا اچھا کھانا، اچھا اچھا کپڑا، اچھا سا بستر، اچھا سا موسم، جاڑے میں آلو کی روٹی اور کباب، گرمی میں خوب ٹھنڈا ٹھنڈا شربت، یہ اسکول کے زمانے کی بات ہے، ہم کوئز میں حصہ لیتے تھے جیتنے کی تمنا رہتی تھی، ہار جاتے تھے تو بہت دُکھ ہوتا تھا، اماں کے پاس آ کے روتے تھے، اماں سمجھاتی تھیں بیٹی کو خواب نہیں دیکھنا چاہیے۔

''اماں کیوں؟'' میں اماں سے لڑ پڑتی تو اماں کہتیں: ''بیٹی تو نیو کی اینٹ ہوتی ہے، موجود

رہتی ہے نظر نہیں آتی۔تمہارے باپ کا نام اسمٰعیل جو ہے یہ ایک پیغمبر کے نام پر پڑا ہے، اُنہی کی اولاد میں ایک قیدار تھے جن کا نام تمہارے ابا نے تمہارے بھیّا کو دیا، تو وہ جو پیغمبر تھے اُن کی اماں کا نام ہاجرہ تھا، اُن کا نام تو آج تک سب جانتے ہیں مگر اُن کا کام کسی کو یاد نہیں اور اسمٰعیل پیغمبر کی بیوی کا تو نام بھی کسی کو یاد نہیں، تو یہ جو بیٹی ہوتی ہے نا، یہ بس ایسے ہی ہوتی ہے، جیسے سب بیٹیاں ہوتی ہیں۔ پھر جب کالج میں آئی، تو اماں سے لڑنے لگی: ''آپ ہم کو بتاتی نہیں ہیں، جھانسی کی رانی بھی تو تھی، اور پھر سیتا، لکشمی، سرسوتی، دُرگا، چنڈی، ابّا ایک دن بتا رہے تھے، کوئی ملکہ سبا تھی، خدیجہ تھیں، فاطمہ تھیں، زینب تھیں اِن لوگوں کا تو کام ہے۔''

اماں گڑبڑا جاتیں۔ ''لڑکی چپ رہ، اِن میں سے کوئی بھی ہمارے طبقے کی نہیں تھیں، ہمارے طبقے میں ایسی نہیں ہوتیں۔''

مجھے ہنسی آجاتی...لات ماروں ایسے طبقے پر۔

''تو اپنے آس پاس سے الگ ہونے کے چکر میں، مَیں یہاں آگئی ہوں۔'' نائلہ نے رفیدہ کی طرف چائے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''پہیلیاں نہ بجھواؤ، صاف صاف بتاؤ۔'' رفیدہ بھی جیسے اصل بات جاننے پر اڑسی گئی تھی۔

''رفیدہ جی! ایسا ہے کہ...'' نائلہ چائے کی پیالی پکڑے ہوئے رفیدہ کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

اس کی آواز مدھم ہوگئی تھی، مگر وہ بول رہی تھی، مسلسل بول رہی تھی...

نائلہ بولتی رہی، رفیدہ سنتی رہی۔

یہ خوابوں کے چٹخنے کا زمانہ تھا، موسموں میں دراڑیں پڑ رہی تھیں، ہر نئی زندگی جو شروع ہوتی ہے، وہ یقین واعتماد کے سہارے ہی آگے بڑھتی ہے، شاید قوموں کا بھی یہی حال ہے۔نائلہ بڑی بڑی باتیں نہیں جانتی تھی مگر اُس کا باپ اسمٰعیل اور اُس کا چچا بنسی دھر اور ڈھیر سارے چچا ماموں جو رشتے داروں سے زیادہ اپنے تھے، نائلہ کے لیے یقین کا سبب وہی تھے، رمیش بھی اُنہی میں شامل تھا، مگر رمیش نئی سیاسی صورتِ حال کی طرح ٹوٹتے خوابوں کا استعارہ بن گیا، اچھے دنوں کی اُمید پنڈولم کی طرح ہوا میں ڈولتی رہ گئی۔

فی الحال نائلہ کے پاس رفیدہ کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں تھا۔

نائلہ بولتی رہی، رفیدہ سنتی رہی اور اُس کے زخم کے ٹانکے بھی ادھڑتے رہے، وہ کون سی اپنی

مرضی سے یہاں آئی، جس کے ماں باپ نہ ہوں اُس کی اپنی مرضی کا کیا مطلب؟ بھائی بھوجائی کو جو مل گیا اُس کے حوالے کیا، اور اُس کا حوالہ اور سہارا بھی کیا، دھراوی کی جھونپڑپٹّی اور جھگّی میں کون ہے جو بے سہارا نہیں...اب یہ لڑکی...اس کا ایک نیا دُکھ!

''جو ہوا صحیح نہیں ہوا..تمہاری تو پوری زندگی پڑی ہے...آگے کے لیے سوچو۔'' نائلہ کی پتا سُن کر رفیدہ کا پہلا تاثر یہی تھا...اُس کے بعد دونوں کے درمیان چُپ کی بیلا اُتر آئی۔

''رفیدہ جی! میں کیا کروں؟ بھائی کا پتہ نہیں، گھر میں کوئی تیسرا نہیں، شہر میں بات پھیل ہی گئی ہوگی۔ بھیا اُسی وقت دہلی جانے کی بات کر رہا تھا، اگر وہ چلا گیا تو گھر میں تالا بند ہوگا، شہر میں کوئی رشتہ دار نہیں، رمیش کو چھوڑ کر اگر بنسی دھر انکل کے پاس جاؤں تب بھی بات گھوم پھر کر وہیں آجائے گی؟ اورنگ آباد کے علاوہ کہاں جاؤں؟ اور اورنگ آباد جاؤں تو کیسے جاؤں؟''

''مگر تمہیں یہاں سے تو نکلنا ہی ہوگا... جو کچھ تم جھیل رہی ہو، اُس سے بچنے کا ایک ہی راستہ ہے۔''

''رفیدہ جی! میرا باپ یہاں سے بہار گیا تو مارا گیا، آپ مجھے پھر بہار جانے کے لیے کہہ رہی ہیں۔''

''تو بتاؤ اور کیا کہوں؟ اپنے گھر لے جاتی مگر اُس ایک کمرے کے مکان میں ساس، دیور، نند سب ہیں اور میرا شوہر بھی فرشتہ نہیں ہے، کہا جاتا ہے کہ ممبئی میں تو فرشتے بھی بہک جاتے ہیں، وہ تو آدمی ہی ہے۔بس اتنا ہے کہ میرا شوہر ہے اور منھ جہاں مارے آکے کھونٹے پر بندھتا ہے۔''

''آپ نے پوچھا تو میں نے سچ سچ بتا دیا۔ میرا تو یہاں آپ کے علاوہ کسی سے کوئی سمبندھ بھی نہیں۔''

''ہاں یہ تو ہے۔'' اتنا کہہ کر رفیدہ چپ ہوگئی... پھر کچھ دیر بعد بولی: ''میں چلتی ہوں، سوچوں گی۔''

رفیدہ اُٹھی، دروازے سے باہر نکل گئی، نائلہ اُسے جاتی دیکھتی رہی، اس کے بس میں کیا تھا؟

• • •

21

روشنی نے جب دوستوں سے یونیورسٹی کیمپس کو چھوڑ دینے کے لیے کہا تو قیدار نے سیدھے سیدھے اس خیال کی مخالفت کی۔ ''اگر ماحول میں کشیدگی ہے تب تو اور نہیں جاؤں گا۔''

''اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ یہاں تو الیکشن سے پہلے اور بعد ماحول ہمیشہ گرم ٹھنڈا ہوتا رہا ہے۔'' ٹوپو نے قیدار کی حمایت کی۔ ''کچھ مخالف گروپ کو ہنگامہ کرنا ہے، کچھ جیتنے والے کو اپنے ہونے کا ثبوت دینا ہے۔'' ٹوپو نے گویا معاملے کو ہلکا کر کے دکھانے کی کوشش کی۔

''خیر اَب اتنا بھی ہلکا معاملہ نہیں ہے۔ بات افضل گرو کی حمایت کی ہے۔'' دلبیر سنگھ بولا۔

''دلبیر! تم بھی سنگھ والوں کی پروپیگنڈہ رینج میں آ گئے۔'' روشنی نے تیز لہجے میں دلبیر کی بات کاٹی۔ ''افضل گرو کوئی معاملہ نہیں ہے۔ بات کیپیٹل پنشمنٹ (Capital Punishment) کی تھی۔ یہ ایک اُصولی معاملہ ہے۔ پڑھے لکھوں کا بڑا جتھا کیپیٹل پنشمنٹ کا مخالف ہے۔ اگر ہم نے مخالفت کی تو کون سا گناہ کیا؟ انسانی ادھیکار کو بچانے کی کوشش بھی پاپ ہے؟'' روشنی کا چہرہ تمتما گیا تھا۔

''مگر سارا میڈیا تو یہی چیخ رہا ہے کہ جے. این. یو. میں افضل گرو کی حمایت کی گئی ہے۔'' دلبیر کا انداز دفاعی ہو گیا تھا۔

''میڈیا چور ہے، بِکا ہوا ہے، اس کی برین واشنگ ہوئی ہے، تم لوگ اندھے نہ بنو، یاد کرو یہی میڈیا تھا، ہماری آپس کی قومی زندگی کی یہی دھوپ چھاؤں تھی، موافق اور مخالف دونوں طرح کے لوگ ٹی.وی. پر اُتر آتے تھے، بحثیں ہوتی تھیں مگر اینکر جج نہیں بن جاتا تھا، ٹی.وی. پر اب نیوز چینل سے زیادہ ویوز چینل دکھائی دیتے ہیں اور زیادہ تر اینکرس مدعوئین کو اپنے نقطہ نظر کی حمایت پر مجبور کرتے ہیں، یہ صحافت نہیں زور آوری ہے، اس کا کسی صحافی کو حق نہیں ہے۔'' قیدار بولا۔

''بات افضل گرو کی ہو رہی تھی۔'' دلبیر سنگھ زور سے بولا۔

"نہیں کیپیٹل پنشمنٹ کی ہورہی تھی۔" روشنی سہائے چلائی۔

"بات کسی کی ہورہی ہو۔" ٹوپو نے بات کاٹی۔ "میڈیا عدالت کیسے بن جائے گا اور فیصلہ کیسے سنا دے گا؟"

"اور یہ جو ہم لوگ ہلکے بھاری کی بحث میں پڑے ہیں۔" ٹوپو نے بات آگے بڑھائی۔ "یہ ہماری مورکھتا ہے۔"

افضل گرو تو اِک بہانہ ہے، جے. این. یو. اصل نشانہ ہے۔"

"اِس میں جے. این. یو. کہاں سے آ گیا، کسی بھی یونیورسٹی میں ہوتا تو پولیس اپنا کام کرتی ہی۔" دلبیر پھر بولا۔

"اب اتنے معصوم بھی مت بنو۔ کیا تم جے. این. یو. کو نہیں جانتے؟ یا حکومت میں بیٹھے موجودہ لوگوں کی نیتی اور نیت سے تمہاری جان پہچان نہیں ہے؟" قیدار ہنسا۔ پھر سنجیدہ ہو گیا۔ "جے. این. یو. کوئی یونیورسٹی نہیں ہے، یہ جو اینٹ پتھر کی عمارتیں دیکھتے ہو، یہ صرف آرکی ٹیکٹ، انجینئر، مستری اور مزدور کی محنت کا نمونہ ہے؟ نہیں دلبیر! اتنے ظالم نہ بنو، اس پورے علاقے میں خواب سانسیں لیتے ہیں، جواہر لعل نہرو تو اُس کی صرف ایک علامت ہیں نہ جانے کتنے عاشقوں نے اس میں اپنا خون پسینہ ہی نہیں اپنا عشق بھی اینٹ پتھر میں سانا ہے! سب نیو کی اینٹ بن گئے۔ نیو کی اِن اینٹوں میں کوئی اینٹ روشن خیالی کی، کوئی سماجی برابری کی، کوئی سائنٹفک ٹمپرامنٹ کی، کوئی توہمات پسندی کے بجائے عقل پسندی کی اور کوئی طلبا، اور اساتذہ کے درمیان گہرے تعلقات کی، کوئی جنسی تفریق کے بجائے جنسی برابری کی اینٹ ہے۔ یہاں جو کچھ ہو رہا ہے اُس کو تم سمجھ نہیں پا رہے ہو، اور یہاں کے خلاف جو کچھ ہو رہا ہے، وہ بھی تم سمجھ نہیں پا رہے ہو، یا تم سمجھنا نہیں چاہتے ہو، پتہ نہیں کیا۔

پھر قیدار چپ ہو گیا، اچانک اُس کے چہرے سے اُکتاہٹ ٹپکنے لگی تھی۔

ٹوپو مجمدار کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا اور کچھ بدبدا رہا تھا... پھر آہستہ آہستہ اُس کی بدبداہٹ تیز ہو گئی... یہ دیوار سے لگ کر لڑنے والی بات ہے، جب دنیا میں جنگ ہاری جا چکی تو جے. این. یو. میں جنگ چھیڑ کر ہم کون سا تیر مار لیں گے... مگر دلبیر اس کے بعد بھی یہ لڑ رہے ہیں، یہ کم بڑی بات نہیں ہے... نعرے سنو دلبیر... غور سے سنو...

آزادی... سنگھ پریوار سے آزادی

آزادی... سنگھ سرکار سے آزادی

آزادی... سنگھ سروکار سے آزادی

آزادی... سنگھ ویوہار سے آزادی

آزادی... سنگھ وچار سے آزادی

آزادی... سنگھ سنسکار سے آزادی

یہ نعرے نہیں ہیں، یہ آدمی کے اندر دور دور تک اُتر جانے والی چیخیں ہیں، مگر آج ان نعرہ لگانے والوں کی وِڈمبنا ہے یا مجبوری ہے کہ یہ اُن محاوروں اور اِڈیمس (Idioms) کا پریوگ کر رہے ہیں جن کا زمانہ لد چکا، روس کے ڈہ جانے کے بعد کمیونزم، مارکسزم، بورژوا اور پرولتاریہ جیسے شبدوں کو سمجھنے والا کون بچا، دھارمک وِچار دھارا والوں نے اتنی تیزی کے ساتھ اپنی شبداولی سماج میں پرچلت کی کہ اَب یہ سب کچھ عام آدمی کی بات چیت میں اور سبھاؤ میں گھل مل گیا... بہت گمبھیر سمسّیا ہے، سماج کا پورا چہرہ بدل گیا... اور

ٹوپو بولتا رہا، کمرے میں سب موجود تھے، قیدار بھی موجود تھا مگر وہ وہاں پر نہیں تھا۔

قیدار کہیں اور تھا۔

اُسے اپنے باپ اسمٰعیل کی ڈائری کا ایک صفحہ یاد آ گیا۔

"چالیس برس تک ہم لوگ سی پی آئی اور سی پی ایم کے سہارے جیے، اس آس پر جیے کہ وہ صبح کبھی تو آئے گی، مگر وہ صبح کبھی نہیں آئی، ہم قتل ہوتے رہے، ذلیل ہوتے رہے، ہماری ماؤں بہنوں کی عزت لوٹی جاتی رہی، ہم بندھوا مزدور بنتے رہے اور مالک نے جس طرح چاہا ہمیں استعمال کیا، ہم دانے دانے کو ترستے رہے اور مالک کی کوٹھیاں بھرتی رہیں، پٹنہ میں ڈمراؤں راج اور ہتھوا راج کی محل نما عمارتیں اس کی گواہ ہیں، اور آپ سب کامریڈ لوگ شہر میں بیٹھ کر صرف پرستاؤ پر پرستاؤ پاس کرتے رہے۔ آپ نے کیا کیا ہے اَب تک؟ دلی، پٹنہ، کلکتہ ہر جگہ آپ لوگ ہمیں چارے کی طرح استعمال کرتے رہے، اگر کانگریس اور بی جے پی ووٹ بینک کے لیے سوانگ بھرتی ہے تو آپ نے بھی ووٹ بینک کے لیے کیا کم سوانگ بھرے ہیں؟ آپ کے

گیا ہی کے اسمبلی حلقے سے مسلمان نام کا آدمی کیوں کھڑا کیا جاتا ہے؟ ووٹ بینک کی اہمیت کو تسلیم کرنا، یا ذات اور مذہب کی بنیاد پر ووٹ بانٹنے کا چلن عام آدمی کو جذباتی اور فرقہ وارانہ رشوت دینا نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ سی پی آئی کبھی کانگریس کا دُم چھلّا بن جاتی ہے، کبھی جنتا دل کا۔ سی پی ایم بنگال میں آئیڈیالوجی کی وجہ سے زندہ نہیں تھی بلکہ اِس لیے بچی ہوئی تھی کہ وہ بنگالیوں کی پارٹی بن گئی۔ آئیڈیالوجی کہاں گئی کامریڈ؟ آپ کو پریشانی ہے کہ اس علاقے سے سی پی آئی کا اثر ختم ہو رہا ہے، کیوں نہیں ختم ہوگا؟ چالیس برس میں آپ اس علاقے کے لیے کیا کر سکے؟ زمینوں کے مالکانہ کے جو پرچے بٹے، اُن کے مطابق زمینوں پر قبضے کا کام بھی نہ ہو سکا۔ زمین دار کا ظلم اپنی جگہ برقرار ہے۔ آپ لوگ جمہوریت کی دُہائی دے دے کر ہمیں اور بزدل نہ بنائیے۔ رام بچن جب آپ کے ساتھ تھا تو انقلابی تھا، الگ ہو گیا تو اپرادھی ہے، یہ کیسا ماپ دنڈ ہے؟ اور اگر ہے تو ہو۔ وہ ہمارے دُکھ سکھ کا ساتھی بھی تو ہے۔ ہم اُس کا ساتھ کیوں نہ دیں؟ اور آپ گاؤں دیہات پر سی پی آئی کے سماپت ہوتے پربھاؤ کو بچانا چاہتے ہیں تو آپ کو قربانی دینی ہوگی۔ سنگھرش شروع ہو چکا ہے، خون دیجیے ہمارا ساتھ لیجیے، اب ہم لوگوں سے یہ سارا انّیائے اور نہیں سہا جائے گا۔''

پھر ایک منظر جھلملایا:

مجمع کالونی کے گرد جمع ہے، کالونی چاروں طرف سے گھیری جا چکی ہے، ہزاروں کا مجمع ہے، کسی کے ہاتھ میں نیزہ، کوئی بھالا اور تلوار لیے ہوئے، تلواریں اور بندوقیں لہرا رہی ہیں، پٹرول کے کنستر دکھائی دے رہے ہیں، کسی سمئے بھی حملہ ہو سکتا ہے، ہمیں بچائیے۔'' وزیرِ اعلیٰ کی طرف سے خاموشی ہے، وہ آدمی بے چینی میں عمارت کے اندر اندر چکراتا پھر رہا ہے، حویلی کی مختلف عمارتوں میں بسے لوگ عجیب بے بسی کی صورتِ حال کا سامنا کر رہے ہیں، اگر اندر چھپے رہتے ہیں تو حویلی کے جلد ہی جلا دیے جانے کا پورا یقین ہے، اگر باہر نکلیں تو کیسے نکلیں، وہ نہتّے ہیں، اُنہوں نے پہلے سے کوئی ہتھیار جمع نہیں کر رکھا ہے، وہ آدمی ایک کھڑکی سے دیکھتا ہے، عمارت کے ایک حصے پر پٹرول چھڑکا جا رہا ہے، وہ پھر وزیرِ اعلیٰ کو فون لگاتا ہے: سر! عمارت پر پٹرول چھڑک دیا گیا

ہے، صرف ماچس لگانے کی دیر ہے، وزیرِ اعلیٰ کی طرف سے خاموشی ہے، یہ آدمی کوئی معمولی آدمی نہیں ہے، علاقے کی جانی پہچانی شخصیت ہے، ایک سیاسی پارٹی سے جڑا ہوا ہے، پارلیمنٹ کا ممبر ہے، شہر اور صوبے کے لوگ اُسے پہچانتے ہیں، وہ لوگوں کو سمجھانا چاہتا ہے، اُس نے تمام لوگوں کے درمیان کام کیا ہے، وہ لوگوں کو سمجھانا چاہتا ہے، وہ باہر نکل کر اُن لوگوں سے بات کرنا چاہ رہا تھا، اندر والے منع کر رہے ہیں، اچانک ہاہا کار مچتی ہے، عمارت میں آگ لگا دی گئی، خدا کے لیے جلدی بچائیے، وزیرِ اعلیٰ کی طرف سے کوئی جواب نہیں، اُس کے اندر کی بے چینی اُس کے اندر کی آگ تھی اور یہ آگ اُسے اندر اندر جلا رہی تھی، وہ تڑپ کر دروازہ کھول کر باہر آیا۔ بے قابو مجمع میں سے کسی نے دیکھ لیا اور زور سے آواز لگائی:

''وہ رہا جا پھری!''

اور دوسرے ہی لمحے وہ آدمی گولیوں سے چھلنی کیا جا چکا تھا۔

اُس کی بیوی آج تک عدالتوں میں فریاد کر رہی ہے، مگر کسی جج کو اِس کا کوئی ثبوت ہی نہیں مل رہا ہے کہ احسان جعفری نام کے کسی آدمی پر کسی بلوائی نے گولی چلائی ہو۔

ایک اور دن یاد آیا!

نادرہ اچھی لگ رہی تھی، حالاں کہ وہ کوئی بہت مسلمان ٹائپ لڑکی نہیں تھی اور اُس کے باپ اخلاق نے بھی یہی تربیت دی تھی کہ اصل چیز شرم و حیا اور نظر کا حجاب ہے، اس کا ضرور خیال رکھو مگر جہاں رہ رہی ہو، پڑھ رہی ہو، جن سے صبح و شام کا ملنا جلنا ہے، اُن کے درمیان اجنبی بن کے نہ رہو، پہناوا ستر چھپانے والا ہو مگر ضروری نہیں کہ تم ویسا ہی لباس پہنو جیسا تمہاری اماں پہنتی ہیں یا نانی دادی پہنتی تھیں۔ بغل میں رام دیالو چاچا کا گھر تھا، اُن کے بغل میں مولوی رحیم الدین چچا رہتے تھے، دوسرے پڑوس میں شیلیش انکل تھے، سڑک کے اُس طرف ماما نہال سنگھ تھے جن سے اماں کا منھ بولا بھائی بہن کا رشتہ تھا اور وہ ہر راکھی کے دن اماں سے راکھی ضرور بندھواتے تھے۔ پرب تیوہار میں کبھی ایسا نہ ہوا کہ کالونی کے سب لوگ ایک دوسرے کی خوشی میں شریک نہ ہوں، بقرعید کے دن پنڈت رامیشور دیال، کاکا رامانند یادو اور مرزا مظفر بیگ گوشت سے پرہیز کرتے تھے تو اِن لوگوں کے لیے سوئیاں بنتی تھیں اور باقی چاچا ماموں اور بھیا لوگوں کے لیے خصّی کا گریل تلا

جاتا تھا، سب کو اماں کے ہاتھ کا گریل بہت پسند تھا۔

اب کے بھی بقرعید کا دن ویسی ہی مصروفیت میں گزرا، ابا تو اور تھک گئے تھے، اس مرتبہ کچھ دوسرے کاموں میں ایسا پھنسے کہ میلے میں جانے کا موقع ہی نہیں ملا، ہر مرتبہ دو تین دن پہلے میلہ چلے جاتے تھے، خصّی سستا بھی مل جاتا تھا اور گھر باہر ذرا رونق بھی آ جاتی تھی، لڑکوں کو مٹر گشتی کا ایک اور بہانہ مل جاتا، خصّی آنے کے بعد اُسی شام چھوٹا بھائی راشد خصّی کو لے کر باہر نکل جاتا اور اپنی عمر کے دوستوں رمیش، منگلو، جاوید اور شیام کے ساتھ کالونی سے باہر نکل جاتا، لڑکوں کی مٹر گشتی بھی ہو جاتی اور خصّی کو پیپل، امرود وغیرہ کا پتّہ بھی کھانے کو مل جاتا۔ مگر اس مرتبہ یہ سب کچھ نہ ہو سکا، اخلاق بقرعید کے صرف ایک دن پہلے وہ بھی شام میں نکلا اور رات ہوتے ہوتے ایک خصّی لے کر گھر آ گیا۔

دوسرا دن نماز پڑھ کر آنے، قربانی کے لیے چق (خصی ذبح کرنے والا) ڈھونڈھ کر لانے، پھر قربانی کرنے اور اُس کے بعد دوستوں کی دعوت کی تیاری اور دعوت میں گزر گیا۔

”جانور اتنا بڑا تھا کہ سب کی دعوت کے بعد بھی گوشت بچ گیا۔“ رات میں بیوی نے خبر دی۔

”ختم کر دیا ہوتا، گرمی کا دن ہے۔“ اخلاق نے سوتے سوتے کہا۔

”تو کیا ہوا؟ فریزر میں رکھ دیا ہے۔“ بیوی نے جواب دیا، پھر دونوں کو نیند آ گئی۔

دن بھر کا تھکا ہوا اخلاق کچھ دیر تک سوتا رہا، اچانک بیوی نے جھنجھوڑا: ”اُٹھئے دیکھئے مندر سے کیا اعلان ہو رہا ہے؟“

”کیا بات ہے؟ کسی پروچن وغیرہ کا اعلان ہو رہا ہوگا۔“ اخلاق نے آدھی جاگی آدھی سوئی کیفیت میں کہا۔

”نہیں نہیں...غور سے سنئے۔“ بیوی کی آواز میں کچھ گھبراہٹ جیسا تھا... ”وہ لوگ آپ کا نام بھی لے رہے ہیں۔“

وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا اور بغیر چپل پہنے باہر نکلا۔

باہر نکلا تو صاف آواز سنائی دی:

”پکّی سوچنا ملی ہے کہ اکھلاک (اخلاق) میاں نے گھر میں کل بکرید (بقرعید) کے دن گئو ماتا

کی بلی چڑھائی ہے۔“

”پاگل ہو گئے ہیں سب۔“ میں سمجھاتا ہوں۔

وہ کہتا ہوا باہر نکلنا ہی چاہ رہا تھا کہ بچوں نے اُسے روک لیا۔

”ابا! گلی میں لوگ جمع ہیں، ماحول تناؤ سے بھرا ہوا ہے، مت جائیے۔“

”یہ کیا بات ہوئی؟ جھوٹی خبر کیوں پھیلائی جا رہی ہے؟ میں راما نند اور رامیشور دیال کو پکڑ کر لے جاتا ہوں، کل اُن لوگوں نے دعوت کھائی ہے۔“

”ابا! مندر اور گاؤں کے بیچ ڈیڑھ دو سو لوگ جمع ہیں اور طرح طرح کی بات کر رہے ہیں۔“

اور پھر اس سے پہلے کہ اخلاق اور اُس کے بچے کچھ فیصلہ کر پاتے، دروازہ پیٹا جانے لگا۔

اخلاق پھر بڑھا: ”دروازہ کھولو، میں بات کروں گا۔“

”ابا! آپ اِن لوگوں کا موڈ نہیں دیکھ رہے ہیں؟“

”میاں! نہ کھولو گے تو وہ لوگ توڑ دیں گے، اِس سے بہتر ہے کہ بات کی جائے۔“

گھر کے اندر عجیب افراتفری کی کیفیت تھی، کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے، کیا نہ کرے۔ اخلاق نے رامیشور اور راما نند کو فون لگایا مگر ایک کا فون آف ملا، دوسرے کا کبھی انگیج ملا، کبھی گھنٹی بجتی رہی، مگر دوسری طرف سے نہیں اُٹھایا گیا، باہر دروازہ پیٹا جا رہا تھا اور اخلاق کا آخری سہارا راما نند اور رامیشور تھے۔

پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔

دروازے پر اتنا دباؤ پڑا کہ دروازہ ٹوٹ گیا۔

پچاسوں آدمیوں کا مجمع گھر میں گھس آیا، چاروں طرف چیخ و پکار مچ گئی، عورتوں کو پہلے ہی ایک کمرے میں بند کر دیا گیا تھا، گھس آنے والوں کی زبان پر گالیاں اور الزامات تھے:

”سالا میاں... گئو ماتا کا شترو... دیش دروہی... ماس کہاں ہے نکال سالا!“

”بھائی ہم لوگوں نے خصّی قربانی کی ہے۔“ اخلاق نے سمجھانے کی کوشش کی۔

کسی نے بھرپور طمانچہ رسید کیا، وہ لڑکھڑا گیا: ”بہت چتر بنتا ہے، ہم کو سمجھا رہا ہے۔“

باپ پر ہاتھ اُٹھا تو بچے بے قابو ہو گئے، طمانچہ مارنے والے کا ہاتھ مروڑا، دوسرا ساتھی جھپٹ

کراخلاق کے بیٹے پر چڑھ بیٹھا، اسی بیچ کسی نے ریفریجریٹر کھولا:

’’مال یہاں ہے...مال یہاں ہے۔‘‘ کوئی چلایا۔

ایک نے جلدی سے جھولا نکال کر گوشت اس میں ڈال لیا۔

’’ارے بھائی! دیکھ لیجئے خصی کا ہے۔‘‘ اخلاق نے پھر سمجھایا۔

’’سالا میاں، ہم کو سمجھا رہا ہے۔‘‘ ایک ہاتھ میں چاقو لیے اُس کی طرف جھپٹا اور اس سے پہلے کہ اخلاق کچھ سمجھ پاتا، چاقو اُس کے پیٹ میں گھونپا جا چکا تھا۔

اُسی وقت بھیڑ میں سے کسی نے گولی چلائی اور گولی سیدھے اخلاق کے سینے میں لگی۔

اس چیخ و پکار اور گولی چلنے کی آواز سے آس پاس کے مسلمان اخلاق کے گھر کی طرف دوڑے، مگر اخلاق کے گرتے ہی سارا مجمع، ایسا لگا کہ پہلے سے بنائے منصوبے کے مطابق دروازے سے دوڑتا ہوا باہر نکلنے لگا، اب یہ جو پچاسوں آدمیوں کا مجمع ہاتھ میں چاقو اور بندوق لیے ہوئے باہر کی طرف دوڑا تو اخلاق کے گھر کی طرف رُخ کرنے والے مسلمان بھی بے ساختہ ایک کنارے ہو گئے، اور یہ سارے لوگ دوڑتے ہوئے مندر کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔

گھر میں مردہ اخلاق اور اُس کا زخمی بیٹا پڑا ہوا تھا۔

قیدار کمرے میں واپس آیا تو روشنی کمرے سے باہر جا چکی تھی اور ٹوپو دلبیر اس بحث میں اُلجھے ہوئے تھے کہ ایمرجنسی کا زمانہ زیادہ خراب تھا یا...؟

• • •

22

رُفیدہ کئی دن بعد آئی اور نائلہ کو اُس نے بتایا کہ اس معاملے میں مجبوراً اُس نے اپنے شوہر کو بھی شریک کر لیا ہے۔ رُفیدہ بولی کہ اُنھوں نے ایک بات کہی جو مجھے بھی غلط نہیں لگی، وہ کہنے لگے، وہ ہندو ہے یا مسلمان، یہ بعد کی بات ہے، دونوں نے شادی کی یا بغیر شادی کیئے ساتھ رہ رہے ہیں، ممبئی میں یہ بھی اَب بہت بڑا معاملہ نہیں رہا، یہاں سیکڑوں سے زیادہ ایسے لوگ ملیں گے، آدمیوں کے اس جنگل میں لوگوں کو تو جینے کے لالے پڑے ہوئے ہیں، اس ہاہاکار میں کس کو اِس کی پروا ہے کہ فلاں جوڑا شادی شدہ ہے یا غیر شادی شدہ، مگر سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ آدمی کیسا ہے؟ اُس نے وعدہ کیا ہے کہ اس کے بارے میں پتہ کرے گا۔

نائلہ کے بس میں انتظار کے سوا کیا تھا؟

مگر انتظار کے یہ دن ایسے گزر رہے تھے جیسے جسم پر سے تلوار کی نوک ہر ہر مسام میں چبھتی ہوئی گزر رہی ہو، ایک عجب سی ہول ناکی جس میں ہر سانس میں خوف گندھا ہو، اُس نے کہنے کو تو رُفیدہ سے کہہ دیا تھا کہ اس کے پاس کہنے اور سنانے کے لیے رُفیدہ کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ مگر بات رفیدہ سے بڑھ کر اُس کے شوہر تک پہنچ جائے گی، اس کا اُسے اندازہ نہیں تھا اور رُفیدہ کا بھی اِس میں کیا قصور؟ اس نے رُفیدہ کو منع تو نہیں کیا تھا، بس شروع کا زیادہ سے زیادہ ایک مہینہ، بقیہ پانچ مہینے سے تو وہ غلط کاری، بے یقینی اور پچھتاوے کی صلیب پر چڑھی ہوئی جھولتی رہی۔

رمیش صبح کو نکلتا تو رات ہی کو واپس آتا، اب تو اِتوار کو بھی وہ گھر پر نہیں ٹکتا، اس نے کئی بار پوچھا کہ ’’یہ کیسی نوکری ہے جس میں اتوار کی بھی چھٹی نہیں ہے؟ تم کہاں کام کرتے ہو؟ کیا کام کرتے ہو؟ تمہارا دفتر کدھر ہے؟ موبائل پر کس سے رات گئے بات کرتے رہتے ہو؟‘‘

ہر سوال کا بس ایک روکھا سوکھا جواب۔

’’اپنے کام سے کام رکھو، میرا بھیجا مت کھاؤ۔‘‘

اس نے ایک مرتبہ جھلا کر کہا: ''آخر میں تمہاری بی...''

اتنا کہتے کہتے وہ رُک گئی، جملہ پورا نہ کر سکی اور رمیش بہت ظالمانہ انداز میں ہنسا...

''ہاں ہاں کہو، تم میری کون ہو؟''

نائلہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے...''میں کم از کم تمہاری گھر والی تو ہوں نا؟''

اِس پر رمیش نے قہقہہ لگایا اور اُس کی ناک کے آگے انگلیاں نچاتے ہوئے بولا:

''ہاں ہاں گھر والی ہو...مگر کرائے کی گھر والی...کرائے کی گھر والی...کرائے کی گھر والی...''

اِسی کی گردان کرتے ہوئے وہ گھر سے نکل گیا۔

کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ اُس نے رات کو نجات چاہی مگر رمیش کے لیے دن میں کھانا پکانے والی اور رات میں بستر پر اپنا آپا سراپا اُس کے حوالے کر دینے والی کے علاوہ اَب اُس کی کوئی حیثیت نہیں تھی...اُسے اورنگ آباد میں گزرے دن یاد آئے، ماں کے مرنے کے بعد جب بھائی باہر دنیا میں مشغول رہتا تھا اور وہ گھر میں تنہا رہتی تھی تو یہی رمیش کتنی کتنی دیر تک کیسی کیسی من موہ لینے والی باتیں کرتا تھا، مگر اَب؟

مگر اب کیا صرف وہ؟ کیا میں نہیں؟ میں نے اُس سے خود کو دور محسوس کرنا کب سے شروع کیا؟ مگر میں نے تو اپنا سلوک ہمیشہ سنبھالے رکھنے کی کوشش کی؟

وہ موڑ جہاں سے مرد عورت کے درمیان کی دوئی ختم ہوتی ہے، وہاں ''حسنِ سلوک'' بے معنی ہے۔

شاید بد سلوکی کا بھی کوئی معنی نہیں بنتا۔

شاید انسانی وجود میں کچھ ایسی لہریں ہیں جو آمنے سامنے والوں کو متاثر کرتی ہیں مگر دونوں کو پتہ نہیں چلتا اور اثر اپنا کام کر جاتا ہے، محبت میں وصل ایک ایسا لمحہ ہے جب دونوں کا اندرون چھٹپٹا کر اور جھپٹ کر ایک دوسرے میں ضم ہوتا ہے، اور ضم ہونے کے مرحلے میں بظاہر تو دونوں ایک دوسرے پر چھانا چاہتے ہیں، مگر کوئی ایک ہی ہوتا ہے جو چھا پاتا ہے...اور پھر دوسرا آہستہ آہستہ اُس کی چھایا بن جاتا ہے۔

میں تو چھاؤں بن پائی نہ چھایا۔

میں تو چند دنوں بعد ہی رمیش سے اوب گئی۔

کیا رمیش ایسا گاہک ہے جو دی ہوئی اُجرت سے زیادہ وصول کرنا چاہتا ہے۔

اس لمحے میں نائلہ پر یہ خوف ناک انکشاف ہوا کہ دونوں میں سے کوئی بھی اپنے دوسرے کو اپنا نہیں سمجھ رہا ہے..یہ معاملہ صرف شکار کا ہے اور لمحہ صرف حملے کا...

مگر میں حملے کی پوزیشن میں کہاں ہوں؟

جو حملہ نہیں کر پاتا وہ بچاؤ کے علاوہ اور کیا کر سکتا ہے؟

کیا میں اپنا بچاؤ کر پا رہی ہوں؟

کیا میں اپنا بچاؤ کر سکتی ہوں؟

میں اپنا بچاؤ کس طرح کر سکتی ہوں؟

اسی ادھیڑ بن میں دن پر دن گزرتے چلے جا رہے تھے، رفیدہ کا پتہ نہیں تھا۔ رمیش کا انداز دن بہ دن خوف ناک ہوتا جا رہا تھا، پہلے وہ باہر سے شراب پی کر گھر آتا تھا، اب گھر ہی میں شراب پینے لگا، ہر رات اُس پر ایک عذاب بن کر نازل ہوتی، اُس کا انداز چغلی کھا رہا تھا کہ اب اس کے پاس زیادہ پیسے آنے لگے ہیں، رنگین ٹی.وی. لے آیا تھا اور رات گئے تک بلو فلمیں دیکھتا اور اُس پر جنسی اذیت کے نت نئے طریقے آزماتا، نائلہ چھٹپٹاتی رہتی مگر ماں بھی تو نہیں تھی کہ اُس سے اپنا دُکھ کہتی...

راتوں کی نیند غائب ہو گئی تھی، دن دن بھر عجیب بے خیالی اور بدحواسی کے عالم میں گزرتا رہا ...ایک دن کنارے پڑے پرانے اخبارات میں سے ایک اخبار اُس نے اُٹھا لیا اور پڑھنے لگی...

ایک خبر پر اُس کی نگاہ پڑ گئی...شینا نام کی کسی لڑکی کی خبر تھی، جس کی ماں کئی لڑکوں کے ساتھ ایک ہی ساتھ عیاشی کرتی تھی، بیٹی کو اُس کا اندازہ ہوا تو اُس نے مخالفت کی، اس مخالفت پر پہلے تو ماں نے بیٹی کو مارا پیٹا، پھر ان لڑکوں کو تیار کیا اور اُن لڑکوں نے اُس کا گینگ ریپ کیا، اور اُس اجتماعی زنا بالجبر کے وقت ماں اُسی کمرے میں بیٹھی شراب پیتی رہی اور اپنے دوستوں کو ہدایت دیتی رہی...

سب مل کے آہستہ آہستہ اس کے کپڑے پھاڑو...اور تم، ہاں تم اِس پر چڑھو...اور تم اِس کی ایک چھاتی چوسو...اور تم اِس کی دوسری چھاتی چوسو...اور تم اِس کے جسم کے مختلف حصوں پر دانت کاٹو... اور تم پیچھے سے اِس کے ساتھ سیکس کرو۔''

بیٹی چھٹپٹاتی رہی، ماں قہقہے لگاتی رہی، شراب پیتی رہی، دوستوں کو اپنے ہاتھوں سے شراب

پلاتی رہی اور بیٹی کے منہ میں زبردستی شراب اُنڈیلتی رہی...

جب سب لڑکے پورا مزہ لے چکے تو ماں نے حکم دیا: ''اب اِس کو قتل کردو۔''

قتل کرنے کے بعد انہی لڑکوں کی مدد سے اُس کے جسم کے مختلف ٹکڑے کیے اور بوریوں میں بھر کر ندی میں بہا دیا—

نائلہ کو جھرجھری سی آئی، پھر اُبکائی کا احساس ہوا، وہ دوڑ کر نالی کے پاس گئی، ایک بھرپور قئے، طبیعت میں سات آٹھ ہیکٹیر زلزلے کی کیفیت... پورے وجود میں انہدام اور تباہی کا احساس اور آوازیں، پھر اس نے دیکھا پوری ممبئی بھیانک زلزلے کی زد میں، بلند آواز سے زمین دوز ہوتی زمینیں...بحرِ ہند میں سونامی...دہلانے والی خوف ناک آوازوں کے ساتھ چور چور ہو کر گرتے پہاڑ...

وہ زمین پر پڑی تھی اور چھٹپٹا رہی تھی۔

''کیا مجھے مرگی کا دورہ پڑ گیا ہے؟'' اس نے ڈوبتے ذہن کے ساتھ سوچا، پھر بے ہوش ہوگئی۔

وہ کتنی دیر بے ہوش رہی، اس کا اُسے پتہ نہیں، مگر جب وہ ہوش میں آئی تو دیکھا کہ وہ زمین پر پڑی ہے، کسی طرح گھسٹ گھسٹ کر چوکی تک آئی اور چوکی پر بے سدھ پڑ گئی۔ اُسے احساس ہوا کہ وہ بخار میں تپ رہی ہے۔

گھنٹوں بعد اُسے لگا کہ شام ہو رہی ہے، وہ آئے گا اور کھانا تیار نہیں رہا تو؟

کئی ماہ پہلے کی ایک شام ذہن میں دَر آئی، کھانا بنانے میں ذرا دیر ہوگئی تھی تو اُس نے کیسے ظالم لہجے میں کہا تھا: ''میں دن بھر جانور کی طرح کھٹتا رہتا ہوں اور تم مال زادی کی طرح اینڈتی رہتی ہو، پھر تم ہو کیوں؟''

وہ ہمت کر کے آہستہ آہستہ سلنڈر کی طرف گئی اور کھانا بنانے لگی۔

سچ مچ رمیش سے اَب اُسے ڈر لگنے لگا تھا۔

وہ آیا، کھانا کھایا، دیر تک بلو فلم دیکھی، گندے گانے سنے اور اُس کو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا، اس نے سکینہ کی طرح اپنا ازار بلند کھول دیا۔

یہ آزادیٔ وطن کے بعد کی سترویں رات تھی۔

نائلہ کی وہ رات جاگتے کراہتے گزری۔

اسی حال میں جیتے مرتے ایک دن رفیدہ آگئی۔

رفیدہ آج نئی ساری پہنے ہوئی تھی، کچھ سجی سنوری لگ رہی تھی، بال ڈھنگ سے کنگھی کیے ہوئے تھے، ہونٹوں پر لپ اسٹک بھی تھی۔

''کہیں جا رہی ہیں کیا؟''

''ذرا تھمو، دم لینے دو۔'' وہ بیٹھتے ہوئے بولی ''چائے نہیں پلاؤ گی؟''

''ہاں کیوں نہیں؟'' نائلہ اُٹھی اور چائے بنا کر لائی۔

رفیدہ نے چائے پیتے ہوئے بات شروع کی۔ ''تم تو انتظار کر رہی ہوں گی؟''

''ہاں جی، میرے لیے تو ایک ایک منٹ گھنٹے کے برابر رہتا ہے۔''

''دیکھو ایسا ہے کہ'' رفیدہ اُس کے ذرا اور نزدیک کھسک آئی۔ ''میں نے عزیز صاحب کو سب بتایا تھا، یہ تو تم کو بتا ہی چکی ہوں۔''

''عزیز صاحب کون؟''

''میرے شوہر اور کون!''

''اچھا، اچھا۔''

'ان کو پتہ چلانے میں کئی دن گزر گیا، دو دن تو اُنہوں نے اپنا سب کام کاج چھوڑ کے سب بات کا پتہ چلایا۔ پہلے تو رمیش کا پیچھا کیا اور اُس علاقے کا پتہ چلایا جہاں رمیش ہر روز جاتا ہے، پھر اُس اڈّے کا پتہ کیا جہاں وہ اور اُس کے دوست جمع ہوتے ہیں، پھر اُن لوگوں کے بارے میں پتہ چلایا...جانتی ہو وہ کون لوگ ہیں؟''

''کون لوگ ہیں؟''

''یہاں کئی گروہ کے لوگ ہیں، جس سے جڑے لوگ انڈر ورلڈ کے لوگ کہے جاتے ہیں، رمیش انڈر ورلڈ والوں سے جڑ گیا ہے۔''

''انڈر ورلڈ؟ کیا مطلب؟

''وہ دنیا جو سامنے سے نظر نہیں آتی۔''

''کیا پہیلیاں بجھوا رہی ہیں؟''

''ہاں جی، یہ پہیلی سب کی سمجھ میں نہیں آتی مگر ممبئی کا ایک سچ یہ بھی ہے۔ یہاں کئی گروہ ایسے ہیں جن کا باس کسی کو نظر نہیں آتا، یہاں تک کہ اُس کے لیے کام کرنے والوں میں سے نوّے پچانوے پرسنٹ لوگ اصل باس کو نہیں دیکھ پاتے، اصل باس کے کئی خاص گرگے ہوتے ہیں، اُن سب کا الگ الگ علاقہ ہوتا ہے، ہر گرگا علاقے کے حساب سے کچھ خاص لوگوں کی بحالی کرتا ہے، پھر وہ خاص لوگ ممبئی آنے والے نئے نئے بے روزگار چھوکروں کو اپنے جال میں پھنساتے ہیں، اُنہیں بھیک مانگنا، جیب کاٹنا، آس پاس کی گوداموں یا کارخانوں سے مال چرانا، مال گاڑی سے مال چرانا، بجلی کے تار چرانا، اسمگلنگ کرنا، لڑکیاں سپلائی کرنا، چاقو مارنا، بندوق چلانا، بم بنانا اور بم مارنے کا طریقہ بتانا، طرح طرح کا وہ سارا کام لوگوں کی صلاحیت کے مطابق سکھاتے ہیں جو قانونی طور پر جرم ہے، مگر جس سے اُن لوگوں کی پیسے کی اُگاہی ہوتی رہتی ہے۔''

نائلہ اندر سے کپکپا سی گئی... ''رمیش بھی یہ سب کرتا ہوگا؟''

''ہاں، کیوں نہیں؟ جب انڈر ورلڈ کے ساتھ ہے تو یہ سب تو کرنا ہی ہوگا... اور اتنا ہی نہیں... اُس کی آواز بہت خوف ناک ہوگئی۔ ''باس کا حکم ہو جائے تو اُن لوگوں کو اپنی بیوی، بہن بھی اُس کے حوالے کرنی ہوتی ہے۔''

نائلہ کو لگا وہ گر جائے گی۔ اس نے سہارے کے لیے چوکی کے پاس والی دیوار پکڑ لی۔

''میں کیا کروں رفیدہ جی؟'' اُس کی آواز روئی روئی ہو رہی تھی۔

''یہ لوگ کوئی دین دھرم ماننے والے تھوڑے ہیں۔'' رفیدہ نے نائلہ کی گھبراہٹ کی پرواہ کئے بغیر اپنی بات جاری رکھی۔ ''یہ سب تو اِسی طرح کی باتوں اور کاموں کے ساتھی ہیں، ان میں آپس میں بے تکلّفی زیادہ بڑھ جاتی ہے تو اپنی بیویاں بھی اپنے دوستوں کے حوالے کر سکتے ہیں، ان کو تو بس پیسہ چاہیے اور مزہ چاہیے۔''

''میں اب یہاں نہیں رہوں گی... ایک پل یہاں نہیں رہ سکتی۔ مجھے یہاں سے نکالئے۔''

''آپ کم از کم اپنے یہاں لے چلئے۔ رمیش نے آپ کا گھر نہیں دیکھا ہے۔ میں آپ کے یہاں نوکرانی کی طرح رہوں گی، ایک کونے میں پڑی رہوں گی، مگر ہم کو بچائیے۔'' نائلہ نے روتے ہوئے رفیدہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''دیکھو، بات کو سمجھو۔'' رفیدہ نے بہت ٹھہرے ہوئے مگر مضبوط لہجے میں اُسے سمجھایا: ''میں

اپنے گھر کے بارے میں تم کو بتا چکی ہوں، میرا گھر تو ایسے ہی بھرا ہوا ہے، اور پھر میری ساس نندا گر پوچھیں گی تو میں کیا جواب دوں گی... نہیں نائلہ! یہ نہیں ہوسکتا۔''

''پھر آپ ہی بتائیے، میں کیا کروں؟''

''گھبراؤ مت۔'' رفیدہ نے نائلہ کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''ہم نے اُن سے بات کی اور تمہاری پریشانی بتائی تو اُنھوں نے ایک سنستھا کے بارے میں بتایا کہ وہاں ایسی ہی لڑکیوں کو سہارا دیا جاتا ہے، اور اُس کو چلانے والی بھی ایک عورت ہی ہے۔''

''تو بس چلئے، میں تیار ہوں۔''

''ہاں ٹھیک ہے چلو، چلوں گی، میں بھی چلوں گی۔'' رفیدہ ذرا مسکرائی۔ ''مگر تم ذرا تیار تو ہولو، جاؤ منھ ہاتھ دھوؤ، سر جھاڑو، کپڑا بدلو، جو اچھا کپڑا تمہارے پاس ہے وہی پہننا۔''

نائلہ آدھے گھنٹے میں تیار ہوگئی۔ ''چلئے۔''

''ایک منٹ... اِسے لگالو۔'' رفیدہ نے پرس سے پاؤڈر، کریم اور لپ اِسٹک نکال کر دی۔

''اس کی کیا ضرورت؟''

''ہم لوگ جہاں جا رہے ہیں، وہاں کے لوگ ذرا ڈھنگ سلیقے سے رہتے ہیں۔''

نائلہ کے پاس بات ماننے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔

رفیدہ اُسے لے کر باہر نکلی تو نائلہ نے باہر نکل کر دروازے کے دونوں پٹ بند کر دیئے، وہ بے ساختہ زنجیر لگانا چاہتی تھی مگر رفیدہ نے روک دیا: ''زنجیر مت لگاؤ، سب کو اندازہ ہو جائے گا کہ اندر کوئی نہیں ہے۔''

''جی اچھا۔'' اس کا ریموٹ رفیدہ کے ہاتھ میں تھا، رفیدہ اُسے کسی خودکار کھلونے کی طرح اُسے استعمال کر رہی تھی۔

وہ آگے بڑھی اور دو قدم چل کر بے ساختہ اُس نے مڑ کر اپنے دروازے کی طرف دیکھا۔

''Point of no return۔'' پتہ نہیں کب کا سنا جملہ یاد آ گیا۔

''لمحوں نے خطا کی تھی، صدیوں نے سزا پائی۔'' باپ کی کسی محفل میں کبھی کسی کا پڑھا مصرعہ یاد آ گیا۔

''کیا میں اس ڈیوڑھی کو چھوڑنے کے لیے آئی تھی؟''

"میکے سے ڈولی اُٹھتی ہے سسرال سے ڈولا اُٹھتا ہے۔" ماں کی بات پھر یاد آئی۔

رمیش ایسا کیوں ہوگیا؟

میں نے ایسا کیوں کیا؟

بھیا نے مجھے کیوں نہیں سمجھایا؟

ابا اماں کیوں مرگئے؟

خدا ایسا کیوں کر رہا ہے؟

شیطان کو ایسا کرنے کا موقع خدا نے کیوں دیا؟

خدا واقعی ہے یا...؟ لاحول ولا قوۃ!

"چلو بیٹھو" رفیدہ کی آواز سنائی دی، تو اُس نے دیکھا۔ وہ گلی سے نکل کر دھراوی سے باہر نکلنے والی چوڑی سڑک پر آ گئی تھی، اور رفیدہ سامنے کھڑے آٹو میں بیٹھنے کے لیے کہہ رہی تھی۔

تب اُسے اچانک یاد آیا۔ ڈیرے سے نکل کر رفیدہ گلی میں آئی تو کچھ دور ایک شخص کھڑا ہوا تھا، جو یقیناً اُس کا شوہر ہوگا، رفیدہ نائلہ کو اپنے پیچھے پیچھے آنے کا اشارہ کرکے ذرا تیز قدموں سے چلتی ہوئی اُس شخص، عبدالعزیز کے پاس پہنچ گئی، وہ دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ رفیدہ اُس کے ساتھ ساتھ چلتی جاتی تھی، اس سے کچھ باتیں کرتی جاتی تھی اور بیچ بیچ میں پلٹ کے نائلہ کو دیکھتی بھی جاتی تھی۔ نائلہ کو لگا، شاید وہ نائلہ کو عبدالعزیز سے متعارف کرانا نہیں چاہتی، اِس احساس نے اُس کے قدم آہستہ کر دیے مگر وہ رفیدہ اور عبدالعزیز کے ذرا ہی پیچھے تھی... پھر بھی وہ اپنی سوچوں میں گم تھی اور اپنے اندر سے اُٹھنے والے سوالات اُسے پریشان کر رہے تھے۔ اس کے باوجود جب وہ تینوں گلی سے نکل کر دھراوی سے باہر نکلنے والی چوڑی سڑک پر آئے اور عبدالعزیز نے آتی ہوئی ایک ٹیکسی کو روکا، اور رفیدہ کی آواز سنائی دی..." آؤ نائلہ... بیٹھو"

تو اچانک نائلہ کو گلی اور سڑک کے بیچ کا لمحہ بھی یاد آیا۔

رفیدہ اور عبدالعزیز باتیں کر رہے تھے۔

گلی میں بھیڑ اور شور دونوں زیادہ تھے۔

مگر نائلہ کو اچانک کچھ یاد آیا۔

رفیدہ اور عبدالعزیز کے کچھ جملے۔

اُن دونوں کے نائلہ تک پہنچتے ہوئے کچھ جملے... آدھے ادھورے... یا اُس تک پہنچنے والے کٹے پھٹے جملے... نائلہ کو ایسا لگا تھا کہ عبدالعزیز نے پوچھا تھا:

"کے... یا کیسے... یا کب..."

نائلہ کے لاشعور نے اُس وقت اِس جملے کو مکمل کیا تھا..." کیسے؟"

شور کے سروں سے گزرتی رفیدہ کا ایک جملہ اُس تک پہنچا..."لوہا..."

اُس کے آگے گلی کے شور نے پھر سننے نہ دیا۔

نائلہ کے لاشعور نے اُس جملے کو مکمل کیا تھا... لوہا... گرم... لوہا گرم... لوہا گرم ہوتا ہے... لوہا گرم تھا... لوہا گرم ہے... پتہ نہیں کیا... لاشعور گڑبڑا گیا تھا۔

پھر کچھ دیر بعد ایک جملہ اُس تک پہنچا۔

رفیدہ بولی تھی..."کہا۔"

نائلہ کا لاشعور پھر گڑبڑا گیا... کیا ہے؟ کیا تھا؟ کہا تو... کہاں؟... کہاں جانا ہے؟

وہ پھر کچھ طے نہیں کر پا رہی تھی کہ عبدالعزیز کا ایک اور جملہ سنائی دیا... سلیمہ بَ۔"

نائلہ پھر شک میں گھری... اس کا لاشعور پھر اُسے چک پھیریاں دے رہا تھا۔

کیا سنا؟ سلیمہ بَ؟ یا سلیمہ بِ؟ سلیمہ بَ کا مطلب سلیمہ بائی؟ سلیمہ بِ مطلب سلیمہ بیگم... لیکن ب سے تو بانو بھی... بِ سے بیکری بھی۔

نائلہ نے سر جھٹکا اور ٹیکسی میں بیٹھ گئی۔ رفیدہ کا شوہر ٹیکسی والے سے بات کر رہا تھا۔

ایک مرتبہ پھر نائلہ کی نگاہ اُس گلی کی طرف گئی جس سے نکل کر وہ دھراوی سے باہر آئی تھی۔

ایک مرتبہ پھر اُس کا جی بھر آیا، سوچا، اُس نے خود کو کیسے جنجال میں پھنسا لیا ہے، اگر ان لوگوں کی باتوں کے بارے میں میرا وہم صحیح ہے تو میں کدھر جا رہی ہوں؟ میں کیا کرنے جا رہی ہوں؟ اُس کو اپنے آپ سے نفرت ہونے لگی، کیسی جھوٹی اُمیدوں کے سہارے جی رہی ہوں میں؟ مگر میری کوئی خبر لینے والا بھی تو نہیں۔ کون خبر لے۔ میں نے کسی کو اپنی خبر کب دی؟ بھیا کہاں ہوگا؟ جہاں رہے سلامت رہے — میں اس گلی میں کیسے کیسے خواب لے کر داخل ہوئی تھی، شاید رمیش کا رمیش ہونا اور میرا نائلہ ہونا بھی آہستہ آہستہ کسی طرح دونوں کے ذہن سے نکل جاتا شاید مالی پریشانی بھی مل جل کر جھیل لی جاتی... مگر... مگر... مگر تب کیا؟

رمیش کم ازکم شریف آدمی ہوتا!

نائلہ نے گاڑی کی سیٹ پر تھک کر سر ٹیک دیا تھا اور گاڑی ممبئی کی سڑکوں پر دوڑی چلی جارہی تھی۔

یہ ممبئی تھی۔

اس ممبئی کو نائلہ نے نہیں دیکھا تھا۔

نائلہ کو کسی بہت پرانی فلم کے کسی گانے کا ایک ٹکڑا یاد آ گیا... یہ ہے بمبے میری جان!

مچھواروں اور بدیسی تاجروں اور اُن کے ساتھ کام کرنے والوں کی بستی، جسے پہلے پرتگال نے اپنی کالونی بنایا، سات جزیروں پر بسا شہر، یہ جزیرے پرتگالی خاتون کیتھرین کی شادی میں بطور جہیز کنگ چارلس دوئم کے ہاتھ آئے۔ اٹھارہویں صدی میں ویلارڈ نے بمبئی کو ترقی دینے کا آغاز کیا۔ سڑکیں بنائی گئیں، ریل کی پٹریاں بچھائی گئیں، پھر اُنیسویں صدی آتے آتے بمبئی تجارت اور تعلیم کے مرکز میں ڈھلا، بعد میں آزادی کے لیے جدوجہد کرنے والوں کی تحریکوں کا مرکز بھی بنا۔ ۱۹۴۷ سے ۱۹۶۰ تک اسے ''صوبہ بمبئی'' ہی کہا گیا، پھر مہاراشٹر راج کی تحریک نے سر اُٹھایا اور ۱۹۶۰ء سے یہ صوبہ مہاراشٹر کے نام سے جانا جاتا ہے۔ آج کی تاریخ میں ممبئی ہندوستان کا مالی تجارتی اور تفریحی مرکز ہے۔ یہاں کیا نہیں ہے؟ ریزروبینک کا صدر دفتر، ممبئی اسٹاک ایکسچینج، نیشنل اسٹاک ایکسچینج، کارپوریٹ انڈیا کے زیادہ دفاتر تو یہیں ہیں، اس لیے سب سے زیادہ دلال بھی یہیں پائے جاتے ہیں، ہر طرح کے دلال، روپوں پیسوں کے دلالوں سے آدمیوں کے دلال تک، سیاست دانوں اور رنڈیوں کے دلالوں کی بھی یہاں کمی نہیں!

ممبئی کے مغرب میں بحرِ ہند، اُلہاس ندی اور سشٹی جزیرہ ہے، تو جنوبی حصے میں پہاڑیاں ہیں، تین چھوٹی ندیوں داہی سار، پوئسار، اوہی وارا کے علاوہ تلسی جھیل سے نکلنے والی میتھی ندی بھی ہے، پورٹ ٹرسٹ بھی ہے، سنجے گاندھی نیشنل پارک اور بوراویلی نیشنل پارک تو ہے ہی، آٹومک انرجی کمیشن بھی یہیں ہے۔ سمندر کے درجنوں کنارے تفریح کا ذریعہ ہیں، جوہو بیچ، ماروے بیچ، ورسووا بیچ، پھر گرگام چوپاٹی، دادر چوپاٹی، پھر ڈھیر سارے سنیما ہال، موسیقی تھیٹر اور سنیما تو یہاں کی خاص پہچان، ہالی ووڈ، بالی ووڈ، اور وہ یہاں سے وہاں تک پھیلی ہوئی فلمی دنیا، اُن کے مراکز، ان کی شوٹنگ، اِنڈور شوٹنگ کی الگ سجاوٹیں، کھلی آنکھوں سے نظر آنے والی فلمی ہیروئنیں اور ہیرو۔

خالص آرٹ فلمیں بھی خوب بنیں، سرکاری اور غیر سرکاری سطح پر اُن کی پذیرائی بھی ہوئی، نیشنل آرٹ گیلری اور جہاں گیر آرٹ گیلری نے آرٹ کے حوالے سے خوب خوب خدمتیں انجام دیں۔

تہذیبی سطح پر بھی یہ شہر ناقابلِ فراموش ہے، دیوالی، ہولی، عید، دسہرہ، کرسمس، نوراتری، گنیش پوجا، گڈ فرائی ڈے، محرم، دُرگا پوجا، مہا شیوراتری، ہر تیوہار کی خوب دھوم رہتی ہے اور سب مل جل کر تیوہار مناتے ہیں۔ یہاں بھانت بھانت کے لوگ بھی آن بسے ہیں، ہندو، مسلمان، عیسائی، یہودی، سکھ، پارسی، جین، بودھ، ہر مذہب والا یہاں نظر آ جائے گا۔ اسی لئے مل جل کر یہاں کی ''بمبیّا زبان'' ایک الگ بولی بن گئی ہے۔ ڈھیر سارے ٹی وی چینلس بھی ہیں، زی ٹی وی، ای ٹی وی، اسپورٹس چینلس، سونی، اسٹار پلس اور پھر سارے مراٹھی چینلس، فلم ٹی وی اور ریڈیو براڈ کاسٹنگ کے پس منظر میں غور کیا جائے تو احساس ہوتا ہے کہ ذرائع ابلاغ کی فراہمی کا کام بھی بمبئی نے خوب خوب انجام دیا ہے۔

اردو کے حوالے سے بھی یاد کیا جائے تو کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، سردار جعفری، اختر الایمان، ساحر لدھیانوی، باقر مہدی، ندا فاضلی اور ظ. انصاری، سلام بن رزاق، انور خاں، انور قمر، ساجد رشید سے آج کے نئے لکھنے والوں تک سیکڑوں ناموں کا ذکر ہوسکتا ہے جن کی پہچان ممبئی ہے اور جو ممبئی کی پہچان ہیں، پھر شاعر، گفتگو، نیا ورق، اظہار، قلم، تحریر نو درجنوں اُردو رسالے یہاں سے نکلے، حج ہاؤس ہے، ایک زمانے میں ہندوستان بھر کے لوگ حج کرنے کے لیے اکبر جہاز پکڑنے کے لیے ممبئی آتے تھے اور حج ہاؤس میں ٹھہرتے تھے۔ ڈھیر سارے مسلم ہندو این. جی. اوز ہیں، ویسے ہی ڈھیر ساری مسجدیں، مدرسے اور ہندو مسلم فلاحی تنظیمیں۔

دنیا میں ممبئی سے چھوٹے تو درجنوں خود مختار ممالک اقوامِ متحدہ کا حصہ ہیں۔

یہ ممبئی ہے۔

مگر اس ممبئی کو نائلہ نے نہیں دیکھا تھا۔

نائلہ نے ممبئی کو دیکھا اور پڑھا تو نہیں تھا مگر اُس کے بارے میں کچھ کچھ سنا ضرور تھا۔ جب وہ اورنگ آباد میں تھی تو گاہے بگاہے کوئی ممبئی سے آ ہی جاتا تھا، کبھی گھر میں کبھی اسکول اور کالج میں ممبئی کا ذکر ہوتا رہتا تھا کہ ممبئی ہندوستان کا سب سے بڑا شہر ہے، وہاں جو بھی جاتا ہے اس کو کام

مل جاتا ہے، ممبئی کا دل بہت بڑا ہے، وہاں سب لوگ اپنے کام کی دُھن میں رہتے ہیں، اس لیے ہندو مسلمان کا کوئی مسئلہ وہاں نہیں اُٹھتا۔ ممبئی کا موسم کولکتہ کے موسم سے ملتا جلتا ہے، چوں کہ یہ شہر بھی سمندر کے کنارے ہے اس لیے اُمس زیادہ رہتی ہے، پانی زیادہ برستا ہے، سالوں بھر لوگ پنکھا چلاتے رہتے ہیں۔ یہ شہر دہلی کی طرح نہیں ہے جو پنڈے پہ ہاتھ نہیں دھرنے دیتی، اس میں ممتا ہے، یہاں چیزیں بنتی زیادہ ہیں بگڑتی کم ہیں، یہاں مذہب والوں کی پکڑ بھی اتنی سخت نہیں ہے، یہاں کی فلمی دنیا نے لوگوں کے سوچنے کا الگ انداز بنا دیا ہے۔ ہر فیشن کی ابتدا یہاں سے ہوتی ہے، جو جی چاہے کرو، جیسے جی چاہے جیو کوئی روک ٹوک نہیں۔

اسی لیے جب رمیش کے ساتھ شہر چھوڑنے کا منصوبہ بنا تو دونوں کو ممبئی ہی یاد آیا۔

جب وہ دھراوی کی اُس گلی میں داخل ہوئی تھی تو اُس کی آنکھوں میں اَن گنت خوابوں کی جوت جل رہی تھی، ہم ساتھ جئیں گے، ساتھ مریں گے، دونوں مل جل کر ایک نیا باغ لگائیں گے، اس باغ کے پھول اتنی خوشبو دیں گے کہ یہ خوشبو اور رنگ آباد تک جائے گی۔

مگر بیچ ہی سڑ گیا۔ نائلہ کے من میں ایک ہوک سی اُٹھی۔

''کالج سے ذرا رائٹ مڑنا۔'' عبدالعزیز کی آواز سنائی دی جو ڈرائیور کو راستہ بتا رہا تھا۔

''آپ نے کہا کالج کے پاس جانا ہے، اب آپ باجو میں چلنے کو کہہ رہے ہیں۔ آپ کو جانا کہاں ہے؟ اُدھر تو کماٹھی پورہ ہے... رنڈی پاڑہ۔'' ڈرائیور پتہ نہیں کیوں جھلّا گیا۔

نائلہ اچانک چونک پڑی، وہ اپنے خیالوں میں ایسا گم رہی کہ راستہ کیسے گزرا اُس کا تو اُسے ہوش ہی نہیں تھا، وہ ڈرائیور کو بھی ٹھیک سے نہیں دیکھ سکی تھی، اس کی آواز پر نائلہ کی نگاہ اُس پر پڑی۔ ڈرائیور داڑھی رکھے ہوئے تھا اور ماتھے پر سجدے کا نشان نظر آ رہا تھا۔

''رنڈی پاڑہ؟'' نائلہ نے چونک کر ڈرائیور کی طرف دیکھا، اُس نے بالکل بجلی کے جھٹکے والی کیفیت محسوس کی، مگر بہت کوشش کر کے ایسا پوز دیا جیسے اُس نے کچھ سنا ہی نہیں۔

''میٹر جتنا اُٹھے گا، ملے گا، چلے چلو۔'' رفیدہ کے شوہر کی آواز سنائی دی۔

نائلہ آنکھ بند کئے ہوئے تھی مگر اُس کے اندر بھیانک زلزلہ سا محسوس ہو رہا تھا۔

کچھ منہدم ہوتا ہوا سا... اور اُس کے بیچ شور... آوازوں کا شور...''

کیسے تیار ہوئی؟

لوہا گرم تھا۔

کہاں جا رہے ہو... یا کہاں چلنا ہے؟

سلیمہ بائی کے یہاں۔

آگے رنڈی پاڑہ ہے!

رنڈی پاڑہ ہے... رنڈی پاڑہ... رنڈی پاڑہ!

اب کیا کرے؟ زندگی نے کہاں لا کے کھڑا کر دیا؟ دوستوں سے سنی اور اخبار میں پڑھی کہانیاں اور خبریں یاد آ گئیں، اُسے ایک فلم امراؤ جان ادا یاد آ گئی جس میں ایک لڑکی کو حالات نے طوائف کے کوٹھے پر پہنچا دیا تھا۔

کیا میں اُس فلم کا کردار بننے والی ہوں؟

اُس کا دماغ دھواں دھواں ہو رہا تھا اور گاڑی بھاگی چلی جا رہی تھی۔

اچانک کھٹاک کی آواز ہوئی، نائلہ نے ہلکے سے مگر تیزی سے اپنی طرف کا دروازہ کھولا اور باہر کی طرف لڑھک گئی۔

گاڑی بیچ سڑک پر تیز رفتار سے بھاگ رہی تھی، سب نے دیکھا کہ دروازہ کھلا اور اِس سے پہلے کہ کوئی کچھ سوچ پاتا یا کر پاتا، نائلہ سڑک پر پیچھے آتی کئی گاڑیوں سے ٹکراتی، پلٹنیاں کھاتی کچھ دور گھسٹ کر ساکت ہو گئی... سر سے پیر تک خون میں تر بتر!

رفیدہ اور عبدالعزیز کی گاڑی بھاگتی چلی جا رہی تھی۔

اُن کے پاس بھاگتے رہنا ہی آخری چارہ کار تھا—!!

• • •

23

قیدار کھلے میدان میں آ چکا تھا مگر روشنی سے کچھ فاصلے پر تھا۔

روشنی مجمع کا حصہ تھی مگر قیدار روشنی کو دیکھ نہیں پا رہا تھا، وہ اُسے صرف محسوس کر سکتا تھا۔ رات گہری ہوتی جا رہی تھی۔ ملگجی روشنی میں قدموں کی چاپ سنائی دے رہی تھی۔ ہیولوں یا سروں کی جنبش بھی دکھائی دے رہی تھی۔ سب سے زیادہ واضح آوازیں تھیں۔ یہ اُن نوجوانوں کی آوازیں تھیں جن کی مثال خودرو پودے کی تھی۔

آوازوں کا رُخ تو محسوس ہوتا تھا مگر اُس رخ کے پیچھے کسی چتر کار کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔

قیدار نے محسوس کیا، پتے گر رہے ہیں، نئی کونپلوں کے نکلنے کا وقت قریب ہے، پتّے پہلے پیلے ہوتے ہیں پھر گرتے ہیں، منظر پر پیلا رنگ حاوی ہوتا جا رہا ہے، خزاں کا رنگ ...خزاں بھی عجیب موسم ہے، اس موسم میں پتّے جھڑتے ہیں مگر نئے پتّے نکلتے بھی تو ہیں۔

پتّہ اور درخت جس زمین پر قائم ہے اور جو آسمان اُسے ہوا، پانی اور دھوپ بخشتا ہے... یہ سب عجیب علامتیں ہیں...درختوں سے گرتے پتّے نئی فصل کے لئے کھاد کا کام کرتے ہیں، زمین کا سینہ گرمی سے جتنا پھٹتا ہے اور اُس میں دراڑیں پڑتی ہیں پانی اتنا زیادہ اُس میں جذب ہوتا ہے اور پودوں کے انکرنے، اُن کے نمو کرنے اور تناور بننے میں مدد کرتا ہے، آسمان اگر ہوائیں اور بارش نہ بھیجے تو آدمی کی ساری محنت بیکار جائے۔

کبھی کبھی ہوا مخالف ہو جاتی ہے، نرم روی اور متناسب رفتار کے بجائے آندھی طوفان بن جاتی ہے، ننھے منّے نئے انکرے پودے آندھی طوفان کی مار نہیں سہہ پاتے، ڈھہ جاتے ہیں، زمیں بوس ہو جاتے ہیں یا اپنی زمینوں اور جڑوں سے کہیں دور پھنکا جاتے ہیں، کبھی پانی دشمن بن جاتا ہے، برستا ہے تو برستا ہی چلا جاتا ہے، کھیتوں کھلیانوں، کیاریوں اور منڈیروں سے ہوتا ہوا گھروں اور آبادیوں میں داخل ہو جاتا ہے، ہاہا کار مچا دیتا ہے۔

کبھی زمین بھی مخالف ہو جاتی ہے، کسی بیج کو قبول نہیں کرتی، کسی کو اندر ہی اندر سڑا گلا کر مُردہ کر دیتی ہے۔ قیدار نے روشنی تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہوئے سوچا۔ کیا میں بھی ایک بیج ہوں جو اپنی زمین تک نہیں پہنچ پا رہا ہے؟ یا میں خود سڑا گلا عنصر ہوں جس میں نمو کرنے کی طاقت نہیں ہے۔ جے. این. یو. سے اُٹھنے والی آوازیں اور روشنی اور میں— کیا یہ ایک تثلیث ہے،؟ یا میں صرف وہ صفر ہوں جو عدد کے بائیں طرف رہتا ہے۔

قیدار کشمکش کا شکار ہوا، قیدار مسلسل کشمکش کا شکار ہے۔ وہ جدو جہد کا حصہ بننا چاہتا تھا، مگر اس ہاہا کار میں وہ خود کو کہاں کھڑا کرے۔ ذاکر نگر میں بات نکلتی ہے تو شریعت زیرِ بحث آ جاتی ہے۔

اب تو بھائی شریعت کا تحفظ ہی سب سے بڑا مسئلہ ہے۔

جب ایمان ہی نہیں بچ پائے گا تو مسلمان ہونے کا مطلب کیا ہے؟

ہمارے بنیادی تصورات مثلاً جہاد اور طلاق پر حملہ کیا جا رہا ہے۔

یہی وہ حالات ہیں جن کی وجہ سے جہاد اور ہجرت فرض ہو جاتی ہے۔

اور اتنے سارے زنا بالجبر۔

اور اتنی لوٹ مار اور قتل و غارت گری۔

مسئلہ کیا ہے؟ انسانی جان کا زیاں کوئی مسئلہ ہے یا نہیں؟

اوّلیت کسے دی جانی چاہیے؟ نظریے کو یا جان کو؟

قیدار اب روشنی کے قریب پہنچ رہا تھا۔

اور اسی لمحہ اس کے ذہن میں ایک کوندا سا لپکا: ایجادات و انکشافات سے زندگی آگے بڑھتی ہے اور اخلاقیات سے زندگی میں حسن، تناسب کا حسن پیدا ہوتا ہے، مگر نظریے سے صرف اقتدار حاصل کیا جا سکتا ہے، کوئی حاکم بنتا ہے اور کوئی محکوم۔ زندگی کو نہ حاکم کی ضرورت ہے نہ محکوم کی، اُسے صرف ہم سفر چاہیے۔

قیدار نے سوچا، میرا باپ جو مالیگاؤں اور ممبئی سے بہار تک مارا مارا پھرا اور بالآخر مارا گیا، میری بہن جو ہم سفر کی تلاش میں نکلی مگر پتہ نہیں اُس کو ہم سفر ملا یا وہ بھی حاکم اور محکوم کی دو دھاری تلوار والی منطق پر ٹکی مخلوق بن گئی۔ یا خود میں جو نگری نگری پھرا مسافر کی ایک علامت بن چکا ہوں، ہم سب کیا چاہتے تھے اور کیا پایا ہے۔

قیدار نے بہت گھٹن سی محسوس کی۔

ایسا کیوں ہوا کہ جو ملا وہ چاہا ہوا نہیں تھا۔

اس چاہنے اور ملنے کے بیچ جو کھنڈت پڑتی ہے، اس میں کیا بھید ہے، قیدار کے باپ نے کئی لوگوں کے احوال سنائے تھے، خود اسمٰعیل، پھر اُس کا دوست... کیا نام تھا؟ کچھ میرانی کر کے نام تھا جو ابّا کے ساتھ مارے گئے، پھر ایک دوست انیل شرما، جن کو بہار چھوڑ دینا پڑا... ایسے سارے لوگ کس سپنے کی کھاد بنے، اور پھر وہ سارے لوگ جو ملک بھر میں بلکہ دنیا بھر میں دہشت پھیلاتے ہیں، اُن کے سپنے کیا ہیں؟ کیا یہ لوگ زندگی سے پیار نہیں کرتے؟

قیدار کو لگا اس کا دم نکل جائے گا، وہ مجمع کے بیچوں بیچ تھا اور مجمع اس طرح ٹھسّم ٹھس تھا کہ لگ رہا تھا کہ سب ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہیں، اس کو وہ جو لگا تھا کہ وہ روشنی کے قریب پہنچ رہا ہے اُس لمحے وہ بس ایک وہم محسوس ہوا، روشنی ایک مرتبہ پھر سروں کی بھیڑ میں چھپ سی گئی تھی۔

قیدار نے سوچا کہ روشنی بھی ایک عجیب استعارہ ہے، آخر وہ روشنی میں دل کشی کی کون سی بات محسوس کرتا ہے، وہ اُسے اپنے قریب کیوں محسوس ہوتی ہے، کیا اس لیے کہ وہ ایک لڑکی ہے، نہیں، لڑکیاں تو کئی ایک زندگی کے آسمان پر طلوع ہوئیں اور غروب ہو گئیں۔ کیا یہ کسی قسم کی رومانیت ہے، کچھ ایڈونچر، ایک ایسے زمانے میں جب لو جہاد کی گندہ اور بدبودار تلوار جس تس پر وار کرتی رہتی ہے، ایسے میں روشنی سہائے کے قریب آنا، یا پھر ذہنی قربت؟ وہ بھی باپ اور گھر کی تربیت کے نتیجے میں کبھی فرقہ وارانہ انداز میں نہ سوچ سکا، نہ جی سکا اور پھر یہ لڑکی بھی، یا پھر یہ کہ جن چیزوں، رویوں اور بولی ٹھولی کا وہ عادی رہا، بدلے ہوئے منظر نامے میں وہ سب کھوتا اور کہیں نہ کہیں تھوڑا بہت روشنی کے یہاں ہُمکتا، مسکراتا، سر اُٹھاتا اور کبھی کبھی بے ساختہ کھلکھلاتا محسوس ہوتا ہے۔

وہ زیادہ تر اُردو بولنے کی کوشش کرتی ہے۔

اس کے دادا شاعر تھے، اُن کے اشعار سناتی ہے۔

شلوار جمپر پہنتی ہے، سر پر دوپٹہ رکھنے کی بھی جب نہ تب کوشش کرتی ہے۔

ایک مرتبہ اُس نے اپنی نانی کی سرمہ دانی اور اپنے ابا کی رام پوری ٹوپی بھی دکھائی تھی۔

بتا رہی تھی کہ اس کے ماں باپ کے گھر میں پاندان موجود تھا۔

اُس نے محسوس کیا کہ وہ ناسٹلجیا کے گھیرے میں آ رہا ہے۔

اس نے خود کو لعنت ملامت کی، وہ خواہ مخواہ باپ دادا کے زمانوں میں لوٹنے کی بے وقوفی کر رہا تھا۔

زمانے کو برا مت کہو، زمانہ خود خدا ہے۔ پتہ نہیں کب کی سنی بات (حدیث) یاد آ گئی۔ اس نے اپنے اِرد گرد کی دنیا کو محسوس کرنے کی کوشش کی، بہار کے ایک چھوٹے سے شہر سے ہندوستان کے دل دلّی تک...

''یہ نیا منظر نامہ ہے۔

جب بچیاں سائیکلوں اور اسکوٹیوں پر پینٹ شرٹ پہنے گھنٹیاں اور ہارن بجاتی اسکول اور کالج جاتی ہیں، اور معزز خواتین اپنے پرس جھلاتی اور آنچل برابر کرتی یا بے پروا بازاروں میں محوِخرام نظر آتی ہیں اور سوشل گیدرنگس میں بیبیاں اپنے شوہروں کے ساتھ اور اگر شوہر میسّر نہیں تو رشتہ داروں کے ساتھ شرکت کرتی ہیں اور باعثِ رونقِ محفل بنتی ہیں۔

شہر کی ادبی اور علمی فضا میں بھی پہلی تبدیلی ۶۵-۱۹۶۰ء کے آس پاس شروع ہوئی جب مخصوص علمی ادبی اور شعری نشستوں کی جگہ شہر میں کل ہند مشاعرے کا اہتمام ہوا، اُن کل ہند مشاعروں میں جو ہر سال دو سال پر منعقد ہوتے رہے۔ ۸۱-۱۹۸۰ء تک مسلم خواتین کی شرکت نہیں ہوئی...۸۳-۱۹۸۲ء کے درمیان فضا میں بدلاؤ کے آثار پیدا ہوئے...پہلی مرتبہ باہر سے آئے ہوئے ایک مسلمان منصف مجسٹریٹ کی بیوی کے ساتھ شہر کے ایک وکیل صاحب کی بیوی بھی برقع پہن کر لیڈیز گیلری میں بیٹھ گئیں، مگر شہر کے لوگ اُنہیں پہچان نہیں سکے کیوں کہ وہ مجسٹریٹ صاحب کے گھر سے اُن کی بیوی کے ساتھ مشاعرہ گاہ میں پہنچی تھیں... پھر اگلے سال مجسٹریٹ صاحب کی بیوی، وکیل صاحب کی بیوی اور مزید چند خواتین...''

اس پر کنزروٹیوس کی طرف سے ہوٹنگ بھی کی گئی مگر لبرلس کا پرچم آہستہ آہستہ بلند ہو رہا تھا۔ پانی جب ڈھلان پر آ جاتا ہے تو کسی کے روکے رُکتا ہے؟

اور اب برقع شاید پرانے شہر کی کسی گلی میں مل جائے، ورنہ مین روڈ سے کچہری کے آگے، بہت آگے تک جو شہر بسا تھا، اُدھر برقع پہن کر جانا ہی شاید معیوب سمجھا جاتا

تھا...اب تو کل ہند مشاعروں میں اردو داں یا اردو دوست بیبیاں بھی صف در صف جمع ہوتیں اور شعرا، لیڈیز گیلری کی طرف منھ کر کے عاشقانہ اشعار پڑھتے اور خوش لباس عورتیں اور لڑکیاں اچھے اشعار پر جھوم جھوم کر داد دیتیں...کالجوں اور یونیورسٹیوں میں مسلم لڑکیاں بھی زرق برق لباس پہنے اسمارٹ اور خوب صورت تتلیوں کی طرح اُڑتی پھرتیں اور کالج سے گھر کے راستوں میں اپنی ساتھیوں، سہیلیوں کے ساتھ قہقہے لگاتیں اور اُول جلول سے کسی لڑکے کو ہوٹ کرتی بڑے بھروسے اور اعتماد کے ساتھ گزرتی نظر آتیں۔

یہ نیا شہر ہے۔

پرانے شہر کی لاش پر انگڑائی لے کر کھڑا ہوتا ہوا نیا شہر۔'' (فرات)

تو اَب اکیسویں صدی میں، دو ہزار فلاں ٹلاں میں گزرتے ہوئے کل کا رونا کیسا؟

قیدار نے دیکھا، شہلا راشد اب تقریر کر رہی تھی۔

اس نے روشنی کو یاد کیا، پھر اُسے وہ نظر بھی آ گئی...اُسی کی طرف آ رہی تھی۔

''تم گئے نہیں؟'' روشنی نے دھیرے سے پوچھا۔

''نہیں!''

''چلو چلتے ہیں۔''

وہ بھیڑ سے الگ ہوئے تو الگ ہوتے چلے گئے۔

دونوں نے صدیوں کی راہ طے کی اور اُنہیں بار بار یاد آتا رہا کہ وہ کبھی مل نہ سکے...وہ مل سکتے تھے مگر راہ میں کسی نہ کسی طرح ہر بار کھنڈت پڑی...ایسا کیوں ہوتا ہے؟ کیوں کوئی راہ کھوٹی کر جاتا ہے؟

جواب دونوں میں سے کسی کے پاس نہیں تھا۔

اور سامنے جمنا کی لہریں ترل ترل بہتی گزرتی چلی جا رہی تھیں۔

''قیدار تم کون ہو؟''

''میں ہاجرہ کا بیٹا ہوں جس نے جیون یاترا تنہا بسر کی۔''

اور اس کے بعد بھی ایک بڑی اور زندہ پیڑھی کا کارن بنی۔

روشنی! جیون میں ماڈلس اور سمبلس کی سب سے بڑی اہمیت کیا ہے۔
جیون کے اندھیروں میں یہ جگنوؤں کی طرح جگمگاتے ہیں۔
مگر یہاں تو اندھیرا ہی اندھیرا ہے، ہمارے چاروں طرف ککرمتّے کی طرح پھیلا ہوا جو ہمارا وَرتمان ہے۔ یہ کیسا سمجھ میں نہ آنے والا حال ہے، Unpredictable Present!، دھند، چاروں طرف دُھند، کچھ سجھائی نہیں دیتا روشنی، ایک اندھی سرنگ جس میں ہم دھکیل دیے گئے ہیں اور داخلے کا راستہ بند کر دیا گیا ہے، ہم آگے بڑھ رہے ہیں مگر راستہ سجھائی نہیں دیتا!
مگر وہ دیکھ رہا ہے۔
ہاں! وہ دیکھ رہا ہے اور اُس نے طے کر رکھا ہے کہ ہمیں کہاں لے جانا ہے۔
ہاں! وہ سب کچھ طے کرتا ہے، وہ طے کرتا ہے کہ ہمیں آج کتنی چھٹانک سانس لینی ہے، کتنے ماشہ خواب دیکھنے ہیں، کتنے گرام پیار کرنا ہے۔
مگر جنتا جناردھن نے یہ سب کچھ کرنے کے لیے اُس کو موقع دیا ہے۔
جنتا جناردھن؟ ہاہاہا

''پچھلی متعدد گہری اور اندھی راتوں سے یہی تماشا جاری ہے، آج جو کچھ ہوا جو کچھ ہو رہا ہے، اس میں کچھ بھی نیا نہیں ہے... تم! گدھوں کی اولاد... تم کو نہ کل کچھ معلوم تھا نہ آج... نعرہ لگا کر گھر میں گھس جانے والو بزدلو!... ایک مثال نہیں کہ اُن نے جو آج باہر نہیں ہیں، اور اُن نے جو آج باہر ہیں... کسی نے بھی سامنے آ کر مقابلہ کیا ہو... تم مقابلے پر آ بھی نہیں سکتے... وہ دور گزر گیا جب کلکتہ کے تالاب میں چاروں طرف محاصرہ رہتا تھا اور تالاب کے اندر لڑکے اور لڑکیاں، رات رات بھر، جاڑے کی ٹھٹھرتی راتوں میں اُس حصار میں... بزدلانہ مفاہمت کے بجائے ڈبکیاں لگایا کرتی تھیں...''

''تم...؟ اخ تھو... تھو...'' (سوئی کی نوک پر رُکا لمحہ)

سامنے جمنا کی لہریں ترل ترل بہتی چلی جا رہی تھیں۔
دونوں کو پھر یاد آیا کہ دونوں کبھی نہ مل سکے، جب چمپک اور ابوالمونشور تھے تب بھی اور جب چمپا احمد اور گوتم نیلمبر تھے تب بھی!

وقت ہمیشہ چک پھیریاں دیتا ہے اور ملنے والے بچھڑ جاتے ہیں۔
ہم وہاں سے کیوں اُٹھ آئے؟ وہ تو ہمارا خواب تھا۔
مگر اُس میں جذباتی اُبال زیادہ محسوس ہوا۔
ہاں! نظریات کے ساتھ یہ بڑا مسئلہ ہے کہ جب وہ اپنے اُبھار پر آتے ہیں تو جذباتی اُبال بن جاتے ہیں، اور جب ڈھلان کی طرف مڑتے ہیں تو پست ہمتی یا غداری کا مظاہرہ!
وہاں تو کھڑکی کھولنے کی بات کی گئی تھی۔
تو گرباچوف سامنے آیا۔
مگر چوپال، بھائی چارہ اور سب کا بھلا تو نظریہ نہیں عمل ہے۔
اس عمل نے جمہوریت، سیکولرزم اور سماج واد کا لبادہ پہنا تو نعرہ بن گیا۔
اور سیاست دانوں کے کام آنے لگا۔
اور اس کے ساتھ بھی جی کھول کے زنا بالجبر کیا گیا۔
گلاسناسٹ اور پرسترویکا کے بعد جنمے یہ لڑکی لڑکے جھٹپٹا رہے ہیں اور انہیں راستہ نہیں ملتا، یہ ایک ایسی مہابھارت جھیل رہے ہیں جس میں دھرت راشٹر اور شکنی دو الگ کردار نہیں ہیں، کبھی شکنی پانسہ پھینکتا ہے تو کبھی دھرت راشٹر سوال کرتا ہے یہ کیا ہو رہا ہے؟
مگر جو کچھ ہو رہا ہے اُس کے نہ ہونے یا اُس جیسا نہ ہونے کے لیے دھرت راشٹر کبھی کوئی قدم نہیں اُٹھاتا، اور کیوں اُٹھاوے؟ کرنے والے تو اُس کے اپنے ہیں، پھر دھرت راشٹر غائب ہو جاتا ہے، سامنے آ جاتا ہے شکنی... پانسہ پھینکتا ہوا شکنی!
گئی رات تک قیدار اور روشنی ندی کنارے بیٹھے رہے اور اپنے اپنے خیالوں میں اپنے اپنے خیالوں سے اُلجھتے رہے۔
روشنی نے سوچا، یہ قیدار کون ہے؟
قیدار نے سوچا، روشنی یہاں میرے پاس کیوں ہے؟
چاروں طرف رات براج رہی تھی اور چاندنی دونوں پر اُمڈ گھمڈ کر برس رہی تھی، ندی کنارے اُگے پودوں اور درختوں سے ہوا گزرتی تو کچھ عجیب سی اَن سنی موسیقی کا احساس ہوتا... کچھ اَن دیکھی، انجانی اور انہونی سی کنمناہٹ... پتہ نہیں... دونوں کے من کے کسی کونے کھدرے میں.. یا دونوں

کے آس پاس ہولے ہولے دونوں کو چھوتی ہوئی۔

دونوں چونکے نہیں، جھجکے نہیں، اپنی پوزیشن بھی نہیں بدلی مگر دونوں نے حیرت سے سوچا ضرور کہ میرا ہاتھ اُس کے ہاتھ پر کیوں ہے؟

''جلتا تپتا سورج آگ برسا رہا ہے۔'' کس نے کہا پتہ نہیں مگر دونوں میں سے کسی نے کہا، ضرور۔

جھوٹ اور مکاری اور زورزبردستی کا بازار گرم ہے۔

سپنے مٹی میں مل رہے ہیں۔

بڑی بھیانک شکل والا کوئی جانور اپنے جبڑے کھولے بڑھتا چلا آ رہا ہے۔

وہ دیکھ رہا ہے۔

ہاں! وہ دیکھتا ہے اور طے کرتا ہے کہ ہمیں آج کتنی چھٹانک سانس لینی ہے، کتنے ماشہ خواب دیکھنے ہیں اور کتنے گرام پیار کرنا ہے۔

دونوں نے محسوس کیا کہ دونوں ایک دوسرے کے اتنا قریب ہیں کہ اُن کے بیچ ہوا کا گزر بھی ممکن نہیں۔

دونوں کی آنکھیں نم تھیں اور دونوں سرگوشیوں میں مصروف تھے۔

''تم نے ایک مرتبہ بتایا تھا، تم لال قلعہ جانے والے تھے۔''

''ہاں!''

''گئے؟''

''وہاں عالی جاہ براجتے ہیں۔''

''تو نظام الدین چلے جاتے۔''

''وہاں حضرت جی تشریف رکھتے ہیں۔''

''سلطان جی بھی تو ہیں۔''

''اُن کا تو اَغوا کر لیا گیا۔''

''جے. این. یو. سے کیوں نکل گئے۔''

''آئیڈیل سے انکار نہیں مگر اِس وقت ریئل (Real) کی ضرورت ہے، زندگی کو ہم سفر

چاہیے۔''

''تو میرے پاس آ جاؤ!'' روشنی قیدار کی طرف جھک آئی تھی۔

قیدار نے سوئی کی نوک پر رُکے کے لمحے کے سویں حصہ میں روشنی کو دیکھا...روشنی کہیں نہیں تھی یا ہر جگہ تھی، قیدار کہیں نہیں تھا یا ہر جگہ تھا...انتر گھٹ تک انحد باج رہا تھا...مارے پچکاری...نندلال!

ایک چنبیلی کے منڈوے تلے

دو بدن

دو بدن جل بھی رہے تھے اور بھیگ بھی رہے تھے۔

کہیں سے کوئی فاختہ اپنے ہونٹوں میں زیتون کی ایک ننھی سی شاخ لے کر آئی اور اُن پر نچھاور کیا، کسی مور نے اپنے رنگ برنگے پر اُن پر وارے، کوئی ٹھنڈی ہوا اُنھیں چھو کر گزری، ترل ترل بہتی ندی نے آگے بڑھتے ہوئے اُن کی طرف ذرا سا پلٹ کر دیکھا اور خوشی میں مست ہو کر دو لہریں ایک دوسرے سے اٹکھیلیاں کرنے لگیں اور قیدار نے اپنے دونوں بازو روشنی کے گلے میں حمائل کرتے ہوئے بھاری آواز میں کہا:

''گھٹاٹوپ اندھیرا ہے!''

''جگنوؤں کو جگمگانے دو۔'' روشنی روتے ہوئے بولی۔

دونوں روتے جاتے تھے اور ایک دوسرے کو چومتے جاتے تھے، دونوں ہنستے جاتے تھے اور ایک دوسرے میں مدغم ہوتے جاتے تھے۔

البتہ قیدار کو اِس لمحے میں اپنے باپ اسمٰعیل کا دوست انیل شرما بہت یاد آیا جس کے بارے میں باپ ہی سے سنا تھا کہ اُس کو صوبہ بدر ہونا پڑا تھا۔

• • •